کشمیر

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک

ثناء اللہ بٹ

علی محمد اینڈ سنز، سری نگر کشمیر

کشمیر

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک

ثناء اللہ بٹ

پہلا ایڈیشن جولائی ۱۹۸۰ء

قیمت: تیس روپے

کتابت شبیر احمد، بشیر احمد، محمد صدیق

ٹائیٹل جی۔ احمد

پرنٹرز پبلشرز

میسرز جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز 315 جامع مسجد۔ دہلی

تقسیم کنندگان برائے کشمیر:

میسرز علی محمد اینڈ سنز بک سیلرز اینڈ پبلشرز، لال چوک، سرینگر۔ کشمیر

برائے دہلی:

ورلڈ اسلامک پبلیکیشنز، ۱۸، گلی کبابیاں، جامع مسجد دہلی ۶۔

کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک

فہرست



۲

پس منظر

انتساب

اس عظیم فلسفی شاعر کے نام، جسے اپنے اس آبائی وطن سے بے پناہ
لگاؤ تھا اور جس کی بے قرار روح عقاب بن کر اپنے فکر و خیال میں افلاک کی
بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے بھی کشمیر کے درد کی عکاسی کرتی رہی۔ جس نے اس
قوم کو غلام ہونے کا احساس دلایا۔ ہمیں اپنے درد کا مداوا تلاش کرنے کیلئے
جد و جہد کی جستجو و آرزو بخشی اور جس نے ہماری حالت زار پر روتے
ہوئے کہا ؂

توڑ اس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

١

پیش لفظ

”کشمیر — ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک“

آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اس میں کشمیر کی تیس سالہ سیاسی تاریخ کے واقعات قلمبند کرکے میں نے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، جو سالہاسال سے میرے ذہن پر ایک بوجھ بنی رہی اور اس ذمہ داری کو پورا کرکے میں نے خود اپنے ضمیر اور عوام سے انصاف کیا ہے۔ کشمیر کی تیس سالہ سیاسی تاریخ کے یہ واقعات اس سرزمین کی سیاست کے ظاہر و باطن کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت نہ تو کسی مکتب فکر کے سیاسی لیڈر کی مخالفت کرنا مقصود ہے اور نہ حمایت۔ میں نے واقعات اور حقائق کو بالکل اسی انداز سے، جس انداز سے یہ میرے مشاہدے میں آئے، قلمبند کیا ہے۔

مجھے کشمیر کی تحریک آزادی کے صف اول کے تمام رہنماؤں کا قرب حاصل رہا ہے۔ البتہ جناب شیخ محمد عبداللہ کا نام سرفہرست ہے جن کے میں ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۵ء تک جب کہ وہ دوبارہ برسر اقتدار آئے، بہت قریب رہا اور ۱۹۷۵ء تک مجھے ان کا قریب ترین اور معتمد صحافی قرار دیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء میں نئی دہلی سے ان کے مذاکرات کے دوران انہوں نے مجھے سیاسی میدان میں آکر ان کے ساتھ کام کرنے کے لئے کہا لیکن میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بطور صحافی ہی عوام کی بہتر خدمت کرسکوں گا۔ ۱۹۷۵ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد شیخ صاحب نے دو مرتبہ آفتاب کو اپنی پارٹی کا ترجمان بنانے کے لئے مجھ سے کہا۔ تاہم میں نے اسے بھی مناسب نہیں سمجھا۔ میر واعظ مولانا محمد یوسف، چوہدری غلام عباس، خواجہ غلام نبی گلکار، مولوی عبدالرحیم، محمد یوسف قریشی، میرواعظ شوپیانی مولانا محمد عبداللہ، آغا شوکت علی، مولانا محمد نورالدین، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، خواجہ غلام محی الدین قرہ، سید میر قاسم

بریگیڈیر حبیب الرحمٰن اور جنرل اکبر خان کے ساتھ بھی ایک طویل مدت تک میرے روابط و تعلقات
رہے ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب کشمیر — جنگ بندی سرحد کے دونوں طرف کے ان اہم واقعات
اور حقائق پر مبنی ہے جو خود میرے اپنے مشاہدے میں آئے یا جو کشمیر کی تحریک آزادی کے اہم ترین
کرداروں نے مجھے بتائے۔ واقعات اور حقائق کو میں نے نہایت دیانتداری اور غیر جانبداری کے ساتھ
قلمبند کیا ہے اور ان کی اشاعت کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ ریاست اور تاریخ سے دلچسپی
رکھنے والے بالخصوص اور عوام بالعموم یہ جان سکیں کہ کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک سرحد کے دونوں
جانب کیسے نشیب و فراز سے دوچار رہا ہے اور لوگوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ان حقائق
اور واقعات سے کس طرح بیگانہ رہی ہے، جو پردے کے پیچھے رونما ہوتے رہے اور جن کا خفیہ
ہاتھ اس سرزمین میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیوں میں کار فرما رہا
ہے۔ مجھے توقع ہے کہ جس طرح ہر قسم کے سیاسی، نظریاتی اور جماعتی تعصب سے بالاتر ہو کر میں نے
واقعات کو قلمبند کیا ہے، اسی طرح سیاسی، نظریاتی اور جماعتی تعصب سے بالاتر ہو کر انہیں پڑھا
جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو میں اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی دولت اور اپنے عوام کی سب سے بڑی
خدمت سمجھوں گا۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جن اصحاب نے میری مدد کی ہے، میں ان کا بے حد
ممنون ہوں۔ خاص طور پر اپنے عزیز یوسف جمیل کا جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں میرا ہاتھ بٹانے
میں انتھک محنت کی ہے۔ میسرز **علی محمد اینڈ سنز** کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی
اشاعت کا اہتمام اور اسے عوام تک پہنچانے میں میری مدد کی ہے۔

سرینگر　　　　　　　　　　مصنف

ہمالہ کے دامن میں لیٹے ہوئے چشموں، آبشاروں، لالہ زاروں، سرسبز و شاداب کھیتوں اور زعفرانی زاروں
کی یہ طلسم ہوشربا جیسی انتہائی پرکشش اور قدرتی مناظر سے بھرپور سرزمین جسے بقول فلسفی شاعر اقبال "اہل نظر نے ایران صغیر"
کا لقب دیا ہے اور جس کی سرحدیں ہندوستان، پاکستان، روس، افغانستان اور چین کے ساتھ ملتی ہیں، عہد قدیم سے پوری دنیا میں
مشہور ہے۔ اس کا محل وقوع اور جغرافیائی پوزیشن بھی اس سارے خطے میں زبردست سیاسی اور فوجی اہمیت کی حامل
ہے۔ کشمیر کی اپنی ایک تہذیب، ایک تمدن اور اپنا ایک جداگانہ طرز زندگی اس کی سب سے بڑی خوبی رہی ہے۔ اور عہد
قدیم سے یہاں کے باشندے اپنی انفرادیت اور آزادی کے تحفظ کے خواہشمند رہے ہیں اور جب بھی کسی بیرونی حملہ آور نے اس کے نہایت
دشوار گزار پہاڑی دروں سے گزر کر اس خطے کو محکوم بنانا چاہا تو اس سرزمین کے فلک بوس پہاڑوں نے اس کے حقیقی دفاع کا
کام کیا اور اس کے غیور باشندوں نے آسانی کے ساتھ کبھی کسی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ہندوستان میں خاندان مغلیہ کی حکومت
کے دوران بھی کشمیر ایک خود مختار مملکت کی حیثیت سے اپنا ایک علیحدہ وجود برقرار رکھے رہا، لیکن شہنشاہ اکبر کی حرص نگاہوں

نے کشمیر کو بھی مغلوں کی توسیع پسندی کا ہدف بنایا چنانچہ کشمیری حریت پسندوں اور مغلوں کے درمیان پے در پے خونریز جنگوں کے بعد ... جو حملہ آور مغل فوج کی قیادت کر رہا تھا نے اپنی عیاری اور چال بازی سے کشمیر کے حکمران یوسف شاہ چک کو گرفتار کر کے دلی دربار میں بھیج دیا اور کشمیر کو مغل سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا گیا۔ مغلوں کے زوال کے بعد کشمیر پر جو حکومت کابل کی قائم ہو گئی۔ پٹھانوں کا یہ دور حکومت واقعات کے لحاظ سے بالکل خیرہ کن رہا ہے جس کا خاتمہ شاہ اسمٰعیل شہید[1] اور اُن کے ساتھیوں اور سکھوں کے درمیان بالاکوٹ کے معرکے کے فوراً بعد ہو گیا۔ بالاکوٹ کے اس معرکے میں شاہ اسمٰعیل شہید ہو گئے اور اُن کی ناکامی کے بعد سکھوں نے اس سارے پہاڑی خطے کو اپنی سلطنت جس کا صدر مقام لاہور میں ہو کر تھا میں شامل کر لیا۔ ۱۸۴۶ء میں سکھ سلطنت کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے کشمیر کی تقدیر پچھتر لاکھ روپے (سکۂ رائج الوقت نانک شاہی) کے عوض جموں کے ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کو سونپ دی۔ کشمیر کی تقدیر کا یہ سودا بیعنامہ امرتسر کے نام سے مشہور ہے جو پنجاب کے شہر امرتسر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں اور راجہ گلاب سنگھ کے درمیان ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو طے ہوا تھا اور جسے علامہ اقبال نے ایک انتہائی ذلت آمیز سودا قرار دیتے ہوئے کہا تھا۔

دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

---

[1] شاہ اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی کے ہمراہ جہاد کی اس تحریک کے بانی تھے جس نے مغل سلطنت کے زوال کے بعد مجاہدین کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر لی تھی۔ مجاہدین کی ... [illegible] ... ہونے والے ... [illegible] ... شمالی سرحدی صوبے کے پہاڑی علاقوں میں منظم ہو کر بیٹھ گئے ... چنانچہ پشاور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج ... [illegible] ... سکھوں کو شکست ہو گئی اور مجاہدین نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بعد میں سکھ فوج نے دوبارہ حملہ کر کے مجاہدین کو پشاور سے باہر دھکیل دیا۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل نے ... [illegible] ... ہو کر کشمیر کو جہاد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ مجاہدین کی ایک مختصر فوج کشمیر ... [illegible] ... بالاکوٹ کی ایک تنگ گھاٹی میں ... [illegible] ... مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا۔ سکھ فوج کی تعداد مجاہدین کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی لیکن ... [illegible] ... ہتھیار نہیں ڈالے۔ اس طرح سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل اپنے جانثار ساتھیوں سمیت بالاکوٹ میں شہید ہو گئے اور اس کے نتیجے میں سارا شمالی سرحدی صوبہ ... [illegible] ... سکھوں کی عملداری میں چلا گیا۔ (مجاہد شاہ اسمٰعیل شہید)

بیعنامہ امرتسر

(معاہدۂ امرتسر)

اس معاہدہ کا ایک فریق حکومتِ برطانیہ اور دوسرا فریق مہاراجہ گلاب سنگھ آف جموں ہے اور یہ حکومتِ برطانیہ کی طرف سے جناب فریڈرک کری اسکوائر اور بریویٹ میجر ہنری مونٹگمری لارنس جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام معاملات کے کنٹرول اور ہدایت کیلئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مقرر کئے گئے گورنر جنرل ... [illegible] ... کے ایک نہایت آنریبل پریوی کونسل رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی کی ہدایت کے تحت کام کرتے ہیں اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے بذاتِ خود کے درمیان طے پایا۔

(دفعہ ۱) برطانوی حکومت دریائے سندھ کے مشرق کی طرف سے اور دریائے راوی کے مغرب میں بشمول چمبہ بشمول لاہول تمام پہاڑی ملک جو ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کے معاہدہ لاہور کے آرٹیکل ۴ کی دفعات کے تحت ریاستِ لاہور نے برطانوی حکومت کو سونپ دیا ہے۔ اس کی خود مختاری سمیت مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کی ذات کے مرد وارثوں کی آزادانہ ملکیت میں ہمیشہ کے لئے دے دی۔

(دفعہ ۲) دفعہ ۱ کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ کو منتقل کئے گئے علاقوں کی مشرقی سرحد کا تعین بالترتیب برطانوی حکومت اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے اس مقصد کے لئے مقرر کئے گئے کمشنروں کے ذریعے ہوگا اور اس کی وضاحت سروے کے بعد ایک علیحدہ معاہدے کی جائے گی۔

(دفعہ ۳) دفعہ ۱ اور ۲ کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے وارثوں کے حق میں انتقال کے عوض برطانوی حکومت کو مہاراجہ گلاب سنگھ پچھتر لاکھ روپے (نانک شاہی) ادا کریگا۔ اس میں سے پچاس لاکھ اس معاہدہ کی توثیق کے وقت اور پچیس لاکھ رواں سال یعنی ۱۸۴۶ء کے یکم اکتوبر سے قبل ادا کئے جائیں گے۔

(دفعہ ۴) برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقوں کی حدود کسی بھی وقت تبدیل نہیں کی جائیں گی۔

(دفعہ ۵) ریاستِ لاہور یا کسی اور ہمسایہ ریاست کے ساتھ کوئی تنازعہ ہو جانے کی صورت میں مہاراجہ گلاب سنگھ ثالثی کے لئے برطانوی حکومت سے رجوع کریگا اور اس کے فیصلوں کا پابند ہوگا۔

(دفعہ ۶) مہاراجہ گلاب سنگھ اپنی اور اپنے وارثوں کی طرف سے اقرار کرتے ہیں کہ وہ اپنی تمام فوج برطانوی افواج میں

شامل کریں گے جب وہ پہاڑوں میں یا مہاراجہ گلاب سنگھ کی حدود کے ساتھ ساتھ متعین ہوں۔

(دفعہ ۷) مہاراجہ گلاب سنگھ اقرار کرتے ہیں کہ وہ کبھی کسی برطانوی شہری یا کسی یورپی یا امریکی ریاست کے شہری کو برطانوی حکومت کی اجازت کے بغیر اپنی ملازمت میں نہیں لیں گے اور نہ رکھیں گے۔

(دفعہ ۸) مہاراجہ گلاب سنگھ ۱۱ مارچ ۱۸۴۶ء کو برطانوی حکومت اور لاہور دربار کے درمیان قرار پائے معاہدہ کے آرٹیکل ۵، ۶ اور ۷ کی دفعات کی اس کو منتقل کیے گئے علاقوں کے بارے میں پابندی کرنے کا اقرار کرتے ہیں۔

(دفعہ ۹) بیرونی خطرات سے اپنے علاقہ جات کو محفوظ رکھنے کے لئے برطانوی حکومت مہاراجہ گلاب سنگھ کو امداد فراہم کرے گی۔

(دفعہ ۱۰) مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی نشاندہی کے طور باج کی صورت میں ہر سال برطانوی حکومت کو ایک گھوڑا، بارہ بکریاں (۶ مادہ اور چھ نر) اور تین جوڑے کشمیری شال پیش کیا کریں گے۔

دفعات پر مشتمل یہ معاہدہ برطانوی حکومت کی طرف سے گورنر جنرل رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی کے زیر ہدایت فریڈرک کری اور بریوٹ میجر ہنری منٹگمری لارنس اور بذات خود مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان طے پایا ہے اور مذکورہ معاہدہ کی توثیق رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی گورنر جنرل کی مہر سے آج ہوئی ہے۔

امرتسر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ عیسوی بمطابق ۱۷ ربیع الاول ۱۲۶۲ھ طے پایا ہے

بیعنامہ امرتسر کے بعد راجہ گلاب سنگھ نے مہاراجہ کا لقب اختیار کر کے اپنی اس نئی مملکت کا نام ریاست جموں و کشمیر رکھا۔ یہی وہ دن تھا جب جموں کشمیر کی موجودہ ریاست وجود میں آئی۔ ڈوگروں نے کشمیر پر ایک سو ایک برس تک حکومت کی۔ اس خاندان کا آخری حکمران مہاراجہ ہری سنگھ تھا۔ اس کے تخت نشین ہونے کے دو ایک برس بعد ہی کشمیر میں اندر ہی اندر جو لاوا پک رہا تھا، اس نے سیاسی تحریک کا آغاز کر دیا۔ جب خانقاہ معلیٰ میں شاہ ہمدان کے صحن کے اندر اور باہر میلے اور تہہ میلے چیتھڑوں میں ملبوس سیکڑوں کاریگروں، مزدوروں اور محنت کشوں پر مشتمل اس قوم نجیب نے جسے شاعر مشرق علامہ اقبال نے چرب دست و تر دماغ کہا ہے، اپنا روز مکافات ڈھونڈ نکالنے کی جدوجہد کے عزم کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے شاہ ہمدان کے اس صحن میں اپنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر جبر و استبداد کی ان طاقتوں کو للکارا جنہوں نے اس قوم کو سیاسی، سماجی، اقتصادی اور دوسری تمام قسم کی آزادیوں سے یکسر محروم کر دیا تھا اور پھر ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے واقعہ نے پورے کشمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو ایک شخص عبدالقدیر کی تاریخ پیشی مقرر تھی جس کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے قانونی پابندیوں کو توڑ کر سیاسی تقریر کی ہے۔ اس کے خلاف قائم کئے گئے مقدمے کی سماعت سرینگر سنٹرل جیل کی چار دیواری کے اندر ہو رہی تھی اور لوگ گروہ در گروہ یہ جاننے کے لئے کہ عبدالقدیر کی تقدیر کا کیا فیصلہ ہوتا ہے، سرینگر سنٹرل جیل کے باہر الگ الگ ٹولیوں کی صورت میں جمع ہو گئے تھے؛ جس پر ڈوگرہ فوج کے سپاہیوں کو جو جیل کی حفاظت کے لئے متعین تھے طیش آ گیا اور انہوں نے نہتے اور بے گناہ عوام پر گولی چلا دی۔ اس فائرنگ میں کم سے کم ۱۹ کشمیری ہلاک ہو گئے۔ ڈوگرہ فوج کی طرف سے معصوم لوگوں پر اس سفاکانہ فائرنگ کی گونج جموں کشمیر کے کونے کونے تک جا پہنچی اور ۱۳ جولائی کے شہیدوں کا خون رنگ لایا اور شہیدوں کا یہ خون ایک منظم سیاسی تحریک کی بنیاد بن گیا جس پر جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی عمارت کھڑی کی گئی

مسلم کانفرنس میں کشمیر کے تقریباً سبھی سرکردہ لوگ شامل تھے، ان میں میر واعظ مولوی محمد یوسف اور شیخ محمد عبداللہ خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ مسلم کانفرنس کی تشکیل کے فوراً بعد میر واعظ صاحب کے حلقۂ احباب نے انہیں یہ یاد دلانے کی کوشش کی کہ اب تک ان کا خاندان کشمیری مسلمانوں کی مسند قیادت پر فائز تھا لیکن اب اس بات کے آثار نظر آنے لگے ہیں کہ میر واعظ خاندان کی قیادت چھین لی جائے گی چنانچہ تحریک کے قائدین کے درمیان اندر ہی اندر

اختلافات پرورش پانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد میرواعظ صاحب نے مسلم کانفرنس سے احمدیوں کو خارج کرنے کا مطالبہ کر دیا، جسے نوجوان مسلم قیادت نے نامنظور کر دیا۔ اس پر میرواعظ صاحب اور ان کے حامی مسلم کانفرنس سے الگ ہو گئے اور مسلم کانفرنس کی قیادت براہ راست شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ میں آ گئی۔ بعد میں میرواعظ مولوی محمد یوسف صاحب اور ان کے حامیوں نے آزاد مسلم کانفرنس کے نام سے اپنی ایک الگ پارٹی قائم کر لی اور اس طرح کشمیر کی سیاست دو مختلف سیاسی نظریوں کی بجائے اس کے دو مرکزی کرداروں ایک شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے میرواعظ مولوی محمد یوسف کے درمیان بٹ گئی اور بعد میں شیخ محمد عبداللہ کے حامیوں کو "شیر" کہا جانے لگا اور میرواعظ مولوی محمد یوسف کے حامیوں کو "بکرا" کہا جانے لگا۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز یعنی ۱۹۳۸ء میں شیخ محمد عبداللہ اور جموں کے چوہدری غلام عباس اور دوسرے سرکردہ سیاسی راہنماؤں نے مسلم کانفرنس کی بجائے ایک قومی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ ۱۹۳۸ء ہی میں باقاعدہ طور پر نیشنل کانفرنس قائم کر لی گئی۔ لیکن نیشنل کانفرنس قائم کرنے والوں کے درمیان یہ اتحاد زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ چنانچہ جلد ہی جموں کے سرکردہ سیاسی راہنما جن کی قیادت چوہدری غلام عباس کر رہے تھے اور جو نیشنل کانفرنس قائم کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھے نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے اور انہوں نے بعد میں میرواعظ مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ مل کر مسلم کانفرنس کو دوبارہ زندہ کر لیا۔ ادھر برطانوی ہند میں سرعت کے ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی واقعات کشمیر پر بھی اثر انداز ہوتے گئے۔ اور دوسری عالمی جنگ کے دوران آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگرس دونوں جماعتوں کی طرف سے جموں کشمیر میں اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے اور اسے بڑھانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ تاہم ان کوششوں کے باوجود کشمیر کی سیاسی تحریک بڑی حد تک الگ تھلگ اور مقامی نوعیت کی رہی۔ اسی دوران ۱۹۴۵ء کا وہ واقعہ رونما ہوا۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح موسم گرما کے دوران کشمیر آئے۔ یہ وہ وقت تھا جب وادی میں مسلم کانفرنس برائے نام رہ گئی تھی اور عوام کی اکثریت نیشنل کانفرنس کے ساتھ وابستہ تھی البتہ جموں صوبے میں صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ چنانچہ جب جناح صاحب کشمیر آئے تو نیشنل کانفرنس کی طرف سے ان کا استقبال کیا گیا۔ جناح صاحب کی آمد پر خود نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر کی پرتاپ پارک میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں سپاس نامہ پیش کیا۔ جناح صاحب سری نگر میں بنڈ کے قریب ایک

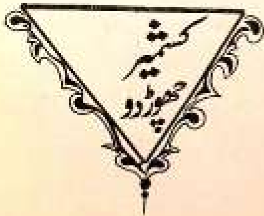
ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے۔ ان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ان کی آمد کے اگلے دن شیخ محمد عبداللہ ان سے ملنے ہاؤس بوٹ میں گئے۔ جہاں ان کے درمیان طویل بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کے دوران مسلم لیگ کے صدر نے شیخ صاحب کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ نیشنل کانفرنس کی بجائے مسلم کانفرنس کی قیادت سنبھالیں۔ شیخ صاحب نے جناح صاحب کی اس دلیل سے اگرچہ اتفاق کیا کہ کشمیر میں زیادہ تر مسلمان مظلوم ہیں اور آزادی کے لئے جدوجہد بھی وہی کر رہے ہیں لیکن شیخ محمد عبداللہ کا نظریہ تھا کہ مسلم کانفرنس کے نام پر ہندو مہاراجہ کے خلاف جدوجہد کو چونکہ فرقہ وارانہ قسم کی تحریک تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اپنی تحریک کو ایک قومی تحریک بنا کر چلائیں لیکن مسلم لیگ کے صدر نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ دوسری طرف مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے بھی جناح صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی اور انہیں بتایا کہ شیخ محمد عبداللہ اصل میں کانگریس کے ساتھ ہیں اور نیشنل کانفرنس کانگریس ہی کی ایک شاخ ہے۔ اختلافات کی بنا پر مسلم لیگ کے صدر اور نیشنل کانفرنس کے لیڈر شیخ محمد عبداللہ کے درمیان ایک ٹکراؤ کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ سرینگر کی جامع مسجد میں مسٹر جناح نے شیخ محمد عبداللہ کے خلاف تقریر کے دوران انہیں غلط کار سیاستدان قرار دیا جس پر شیخ محمد عبداللہ کے حامیوں نے مہاراجہ کی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسٹر جناح کو یہاں سے فوراً چلے جانے کو کہے ورنہ یہاں خون خرابے کا خطرہ ہے جس کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہو گی۔ چنانچہ اس مطالبے پر مہاراجہ کی حکومت نے مسٹر جناح کو یہ مشورہ دیا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر یہاں سے چلے جائیں۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت اور مسلم لیگ کے سربراہ کے درمیان یہ سیاسی ٹکراؤ ایک ایسی دشمنی میں تبدیل ہو گیا جو آگے چل کر صرف کشمیر بلکہ پورے برصغیر کی تاریخ کا رخ تبدیل کرنے کا ایک بہت بڑا سبب بن گیا۔ مسلم لیگ کے صدر اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے درمیان اس ٹکراؤ کا کانگریس کی قیادت نے خوب فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اسی سال پنڈت جواہر لال نہرو اور خان عبدالغفار خان جیسے سرکردہ کانگریسی راہنما بھی کشمیر آئے اور انہوں نے نیشنل کانفرنس کی قیادت کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ کانگریس کے یہ دونوں سرکردہ لیڈر نیشنل کانفرنس کے اس سالانہ اجلاس میں بھی شریک ہوئے جو سوپور میں منعقد ہوا۔ اور اس طرح نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ دراصل کانگریس کے ساتھ ہیں اور اس کے اصولوں اور مقاصد کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کے بعد نیشنل کانفرنس کے لیڈر اس سٹیٹ پیپلز کانفرنس کے اہم عہدوں پر فائز کئے گئے جو کانگریس

کے لیڈروں نے برصغیر میں ریاستوں کے اندر الگ الگ سیاسی تحریکوں کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے لئے قائم کی تھی۔

تقسیم ہند سے قبل کشمیر کی یہ سیاسی صورت حال اور مندرجہ بالا واقعات زیر نظر کتاب کا سیاسی پس منظر تصور کئے جانے چاہئیں۔ کیونکہ اسی سیاسی پس منظر میں آئندہ کے واقعات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔



۳



مارچ ۱۸۴۶ء میں بیعنامہ امرتسر اور کشمیر پر ڈوگرہ خاندان کے تسلط کے پورے ایک سو برس بعد مئی ۱۹۴۶ء میں اس بیعنامے کو کشمیریوں نے چیلنج کر دیا، جب کہ نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ نے متعدد پبلک جلسوں میں پہلی مرتبہ اور اعلانیہ طور پر اس معاہدے کی منسوخی کا مطالبہ کر دیا۔ سری نگر کے مائسمہ بازار کے اس چوک میں جہاں ٹانگے ٹھہرنے کا ایک اڈہ تھا ایک جلسے میں شیخ محمد عبداللہ نے ایک زوردار تقریر کی اور "کشمیر کو چھوڑ دو" بیعنامہ امرتسر توڑ دو" کا مطالبہ کیا۔ جب کشمیر چھوڑ دو، بیعنامہ امرتسر توڑ دو کے مطالبے کی گونج جموں پہنچی تو مہاراجہ ہری سنگھ سخت پریشان ہو گئے چنانچہ وہ ۲۰ مئی کو جموں سے سری نگر پہنچے۔ اسی دن جب شیخ محمد عبداللہ ایک پرائیویٹ کار میں سری نگر سے راولپنڈی جا رہے تھے تو سری نگر راولپنڈی شاہراہ پر ۲۰ ویں میل کے قریب انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری کی اطلاع ٹیلیفون پر مہاراجہ کو ان کے محل میں پہنچائی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ کی سری نگر سے راولپنڈی کے لئے اچانک روانگی کے بارے میں خود شیخ صاحب نے آج تک کسی کو یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ کشمیر میں اس نئی تحریک کے آغاز ہی میں باہر کیوں جا رہے تھے۔ البتہ سیاسی حلقوں میں دو قسم کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں، ایک یہ کہ وہ اس

مطالبے کے حق میں ہندوستان کی رائے عامہ کو ہموار بنانے کے لئے کشمیر سے باہر جا رہے تھے اور دوسری یہ کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے ریاست سے باہر رہنا چاہتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کر کے سری نگر لایا گیا اور بادامی باغ کی فوجی چھاؤنی میں رکھا گیا۔ اُن کے خلاف بغاوت کے الزام میں جو مقدمہ چلایا گیا اُس کی سماعت بھی بادامی باغ کی فوجی چھاؤنی میں ہی ہوئی۔ اس مقدمے میں ۱۰ ستمبر ۱۹۴۶ء کو انہیں تین برس قید اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی اور بعد میں انہیں بادامی باغ کی چھاؤنی سے بھدرواہ جیل منتقل کر دیا گیا۔

اسی اثنا میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس سری نگر میں طلب کیا گیا تھا۔ حکومت نے اسے منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی لیکن مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے اجلاس منعقد کر لیا جس کی پاداش میں اس کے صدر چودھری غلام عباس اور اُن کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر کے سری نگر سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ چودھری غلام عباس کی اس اچانک گرفتاری سے مسلم کانفرنس کو سخت سیاسی نقصان پہنچا اور اس کے جو لیڈر جیل سے باہر رہ گئے تھے اُن کے درمیان سر پھٹول شروع ہو گئی۔ چودھری غلام عباس کی گرفتاری کے بعد میرواعظ مولوی محمد یوسف صاحب نے اعلان کیا کہ وہ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر ہیں لیکن چونکہ مسلم کانفرنس کی لیڈر شپ کے ایک حلقے میں میرواعظ صاحب کی سیاسی پوزیشن کچھ مشتبہ سی تھی اس لئے انہوں نے میرواعظ صاحب کو قائم مقام صدر تسلیم نہیں کیا اور چودھری حمید اللہ خان کو قائم مقام صدر بنا دیا۔

ایک طرف کشمیر میں ۱۸۴۶ء کے بیعنامہ امرتسر کو چیلنج کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف برطانوی حکومت ہندوستان کو آزادی دینے کے سوال پر ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی۔ اس بات چیت کا آغاز برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل کے معتمد خصوصی مسٹر کرپس نے ہندوستان آ کر کیا تھا۔ مسٹر کرپس نے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ مسٹر محمد علی جناح اور دوسرے سرکردہ سیاسی عمائدین کے ساتھ ملاقاتیں کیں لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اُن کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ نے گفت و شنید کے لئے ایک کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا۔ مشن کے ممبروں اور ہندوستانی لیڈروں کے درمیان طویل مذاکرات کے باوجود کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ اسی

دوران ہندوستان کے وائسرائے جنرل ویول نے برطانوی حکومت کے ایما پر خود بھی ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ سیاسی بات چیت شروع کر دی۔ جنرل ویول کو دوسری عالمگیر جنگ کے دوران مشرق وسطیٰ کے محاذ پر جرمن فوج کے ہاتھوں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس محاذ پر ناکام ہونے کے بعد انہیں ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ جنرل ویول ہندوستان آکر سیاسی بات چیت میں بھی ناکام رہے اور مسٹر محمد علی جناح نے ان کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر کے الزام لگایا کہ وہ کانگریس کی طرف داری کر رہے ہیں ۔۔۔ ان کی غیر جانبداری چونکہ مشتبہ ہو گئی تھی اس لئے برطانوی حکومت نے برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک رکن اور جنوب مشرقی ایشیا میں برطانیہ کے بحری بیڑے کے کمانڈر انچیف لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا اور انہیں ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ سیاسی بات چیت کا مشن سپرد کیا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس، مسلم لیگ اور بعض دوسری سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ مذاکرات کے بعد برطانوی حکومت کو جو رپورٹ پیش کی، اس میں انہوں نے برطانوی حکومت کو بتا دیا کہ اگر برطانیہ ہندوستان کی تقسیم پر آمادہ ہو جائے تو وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے درمیان سیاسی سمجھوتہ کروا سکتے ہیں۔ چنانچہ حکومت برطانیہ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کے لئے کانگریس اور مسلم لیگی لیڈروں کو ایک سمجھوتے پر آمادہ کر لیا۔ جس کی بنیاد پر برطانوی پارلیمنٹ نے برصغیر ہند کو آزادی دینے کا ایک مسودۂ قانون پاس کر دیا جسے "انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ" کہا گیا۔ اس مسودۂ قانون کی رو سے ہندوستان کو تقسیم کر کے بعض شرائط کے تحت مسلم اکثریت کے صوبوں پر مشتمل اس کے انتہائی مغرب اور انتہائی مشرق کے علاقوں کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ صوبہ پنجاب جس میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی اکثریت تھی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور اس صوبے کی ہندو اکثریت کے ضلعے ہندوستان میں شامل رہیں۔ صوبوں کی تقسیم کا کام ایک بااختیار کمیشن کے سپرد کیا جائے۔

۲۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں اس بات پر ریفرنڈم کروایا جائے کہ کیا اس صوبے کے

لوگ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں (اور ریفرنڈم میں پٹھانوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا)

۳۔ صوبہ بنگال کو بھی مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے علاقوں کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

۴۔ برصغیر ہند میں جو ریاستیں تھیں ان کے مستقبل کا فیصلہ ریاستوں کے حکمران کرنے کے مجاز قرار دیئے گئے البتہ انہیں اپنی اپنی ریاست کی رعایا کی خواہشات اور جغرافیائی اور دوسرے حالات مد نظر رکھنے کو کہا گیا۔

صوبوں کی تقسیم کے لئے یہ اصول طے کیا گیا تھا کہ جس ضلعے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی وہ پاکستان کو دیا جائے گا اور جس ضلعے میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو گی وہ ہندوستان میں شامل رہے گا چنانچہ ریڈکلف کمیشن نے جسے پنجاب کی تقسیم کا کام سونپا گیا تھا، ضلع گورداسپور کے سوا سارے پنجاب کی تقسیم اسی اصول کے تحت عمل میں لائی لیکن ضلع گورداسپور جس میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی اکثریت تھی کو تحصیلوں کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا' اس طرح دو تحصیلیں جن میں پٹھانکوٹ بھی شامل تھا کے ہندوستان میں شامل رکھنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ اگر طے شدہ اصول کے تحت گورداسپور کا ضلع پاکستان کو دیا جاتا' تو ریاست جموں کشمیر اور ہندوستان کے درمیان سرحدی رشتہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا' لیکن ضلع گورداسپور کو اس کی تحصیلوں میں آبادی کی اکثریت اور اقلیت کی بنا پر تقسیم کر دیا گیا۔

اسی اثنا میں جبکہ پورا برصغیر ہند مسلم کش فسادات اور ملک کی تقسیم کی وجہ سے تذبذب، غیر یقینی اور انارکی کا شکار ہو رہا تھا' جولائی ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئی دہلی سے کشمیر آئے۔ وہ ایک خاص مشن پر کشمیر آئے تھے اور یہاں مہاراجہ ہری سنگھ کے مہمان رہے۔ اپنی آمد کے دوسرے روز لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ملاقات کی۔ ماؤنٹ بیٹن مہاراجہ ہری سنگھ کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ ان کی پہلی ملاقات پرنس آف ویلز کی جموں میں آمد کے موقع پر ہوئی تھی جہاں مہاراجہ ہری سنگھ اور ماؤنٹ بیٹن نے ایک ساتھ پولو کھیلا تھا

اور دونوں میں دوستی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے وائسرائے جس خاص مشن پر کشمیر آئے تھے یہ مشن مہاراجہ کو کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی ترغیب دینے کا تھا۔ اگرچہ مونٹ بیٹن کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس ریاست کی نوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس کی بیشتر سرحدیں پاکستان سے ملتی ہیں۔ اس کے تمام دریا پاکستان کی طرف بہتے ہیں اور اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے باوجود مونٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی کہ کشمیر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے۔ انہوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات میں اُن سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن مہاراجہ نے اس سے صاف انکار کر دیا اور کہا۔ "میں کسی بھی حالت میں پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں کرنا چاہتا۔" چنانچہ ہندوستان کے وائسرائے نے اس پر مہاراجہ سے کہا "یہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ پاکستان سے الحاق نہیں کرنا چاہتے تو پھر آپ کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لینا چاہیئے۔ اس صورت میں آپ کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے میں ایک ڈویژن فوج بھیجنے کے لئے تیار ہوں۔" لیکن مہاراجہ نے جواب دیا۔ "میں ہندوستان کے ساتھ بھی الحاق نہیں کرنا چاہتا بلکہ خود مختار رہنا چاہتا ہوں۔" مہاراجہ کے اس جواب پر مونٹ بیٹن خفا ہو گئے اور انہوں نے مہاراجہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا اور اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ اپنا تخت و تاج کھو بیٹھیں گے۔ لیکن مہاراجہ اُن کی باتوں سے قائل نہیں ہوا۔ تاہم مہاراجہ ہری سنگھ نے اس مسئلے پر مونٹ بیٹن سے بات چیت جاری رکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن عملاً وہ اس سے کتراتے رہے۔ کشمیر سے واپسی کے قبل مونٹ بیٹن نے اپنے مشیروں سمیت مہاراجہ ہری سنگھ اور اُن کے مشیروں کے ساتھ ایک مشترکہ اجلاس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی تاکہ الحاق کا مسئلہ طے کیا جائے لیکن مہاراجہ ہری سنگھ نے پیچش کا بہانہ بنا کر اس اجلاس میں شمولیت سے معذرت ظاہر کی۔ چنانچہ ہندوستان کے وائسرائے اپنے مشن میں ناکام ہو کر واپس دہلی چلے گئے۔

لارڈ مونٹ بیٹن کی ناکامی کے بعد یکم اگست ۱۹۴۷ء کو مہاتما گاندھی کشمیر آئے۔ ایک ڈرامائی انداز میں مہاتما گاندھی نے ۳۰ جولائی کو اپنی ایک پرارتھنا سبھا میں جب یہ اعلان کیا کہ وہ کشمیر جا رہے ہیں تو اُن سے پوچھا گیا کہ کیا وہ

مہاراجہ ہری سنگھ اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان مصالحت کروائے اور کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق کروانے کشمیر جا رہے ہیں؟ لیکن مہاتما گاندھی نے بظاہر اس کی تصدیق نہیں کی۔ اُن کی خاموشی کے باوجود اُن کے اس دورے کو برصغیر کے اخبارات میں بڑی زبردست اہمیت دی گئی اور یہ قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں کہ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کو ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں کشمیر کا الحاق کروانے کی ترغیب دینے کیلئے کشمیر آئے ہیں۔ مہاتما گاندھی سرینگر میں تین دن ٹھہرے اور واپسی سے قبل انہوں نے گلاب محل میں مہاراجہ سے ملاقات کی جو ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی۔ اس ملاقات کے موقعے پر مہارانی بھی موجود تھیں۔ مہاتما گاندھی جب شاہی محل میں آئے تو انہیں مہاراجہ کی طرف سے دودھ کا ایک گلاس پیش کیا گیا لیکن مہاتما گاندھی نے دودھ کا یہ گلاس پینے سے انکار کیا اور کہا "جس راجہ سے اُس کی پرجا ناراض ہو میں اُس کے ہاں کچھ نہیں کھانا چاہتا۔" اس مرحلے پر مہارانی نے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر مہاتما گاندھی کو یقین دلایا کہ گاندھی جی حالات کو سدھارنے کے لئے جو بھی ارشاد فرمائیں گے اُس کی تعمیل ہوگی۔ مہاراجہ نے بھی اس کی تائید کی جس پر مہاتما گاندھی دودھ پینے پر رضامند ہو گئے۔ گفتگو کے دوران مہاتما گاندھی نے مہاراجہ کو نصیحت کی کہ وہ ایک تجربہ کار، محب وطن اور ملک کا سپوت ہونے کے ناطے اس ملک کو مضبوط بنانے اور مختلف مسائل حل کرنے کے کام میں تعاون کریں۔ انہوں نے مہاراجہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کو رہا کر کے انہیں ملک کی سیاست میں اپنا رول ادا کرنے کا موقع فراہم کریں۔ گفت و شنید کے دوران مہاراجہ نے گاندھی جی کی نصیحت اور مشوروں پر عمل کرنے اور کچھ دوسرے معاملات کے بارے میں اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے اُن کی راہنمائی حاصل کرنے کا انہیں یقین دلایا۔

مہاتما گاندھی کی مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ملاقات اور کشمیر سے گاندھی جی کی واپسی کے بعد ریاست کی سیاسی اور انتظامی صورت حال بڑی سرعت کے ساتھ تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ چنانچہ ۱۱ اگست کو مسٹر رام چندر کاک کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا گیا اور اُن کی جگہ مہاراجہ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار ٹھاکر جنک سنگھ کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ مسٹر رام چندر کاک اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے درمیان براہ راست دشمنی کا تاثر عام تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی

اس خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں کہ وہ ریاست جموں کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان سے الگ ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے، پنڈت رام چندر کاک دو بار مسٹر محمد علی جناح سے ملاقات بھی کر چکے تھے۔ اُدھر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر کے مسلم علاقوں پر مشتمل مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آگیا اور اس کے اگلے دن یعنی ۱۵ اگست کو ہندوستان کی آزادی عمل میں لائی گئی۔

برطانوی ہند کے ان واقعات سے کشمیر میں سیاسی بے چینی بڑھتی چلی گئی اور ان حالات میں مہاراجہ کی حکومت اور حکومت پاکستان کے درمیان "STANDSTILL AGREEMENT" یعنی جوں کے توں حالات برقرار رکھنے کا معاہدہ بھی ہو گیا اور پاکستان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم رہے۔ یاد رہے کہ کشمیر کی تمام تر تجارت کے راستے اُن علاقوں سے ملتے تھے جو علاقے پاکستان میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کا مواصلاتی نظام بھی اُن علاقوں کے ماتحت تھا، جو پاکستان میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر سری نگر کے ڈاک و تار گھر کے اوپر پاکستان کا پرچم نصب کیا گیا۔ برصغیر میں برق رفتاری کے ساتھ رونما ہونے والی تاریخی اور سیاسی تبدیلیوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کو سخت پریشان کر دیا اور وہ اس ریاست کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔ اسی دوران حکومت ہندوستان کے کچھ اعلیٰ افسر سری نگر آئے اور انہوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ اُن کے محل میں گفت و شنید کی، لیکن اس کے باوجود مہاراجہ ہری سنگھ کوئی فیصلہ کرنے میں ہچکچا رہے تھے اور پھر ۲۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اچانک اور ڈرامائی انداز میں شیخ محمد عبداللہ کو بھدرواہ جیل سے سری نگر لایا گیا اور انہیں بادامی باغ فوجی چھاؤنی میں رکھا گیا، جہاں بہت سے لوگوں نے اُن کے ساتھ ملاقاتیں کیں، جو لوگ بادامی باغ چھاؤنی میں اُن سے ملے اُن میں نئے وزیر اعظم مسٹر جنک سنگھ بھی شامل تھے۔ انہیں بھدرواہ سے بادامی باغ چھاؤنی میں منتقل کرنے کے ۸ روز بعد یعنی ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو رہا کر دیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے فوراً بعد کشمیر کے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی سے قبل ریاست کے بعض سرحدی علاقوں میں مسلمانوں اور ڈوگرہ فوج کے درمیان مسلح جھڑپیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ ان سرحدی علاقوں میں امن و امان کی برقراری کا سارا کام ڈوگرہ

فوج کے سپرد تھا، جس نے بعض علاقوں میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے تھے اور جس کی خود شیخ محمد عبداللہ نے بھی اپنے بیانات میں تصدیق کی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی سے قبل ہی مسلم کانفرنس کے بعض راہنما مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ کشمیر کے معاملے پر تبادلۂ خیال کرنے پاکستان جا چکے تھے۔ ان راہنماؤں میں میرواعظ مولانا محمد یوسف بھی شامل تھے جو ستمبر کے تیسرے ہفتے میں لاہور پہنچ چکے تھے۔ پاکستان کے کچھ لیڈر جن میں میاں افتخار الدین، بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن، ابن ناصرہ صدیقی اور ڈاکٹر تاثیر بھی شامل تھے، سری نگر آئے اور یہاں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اُن کی بات چیت ہوئی۔[1] سری نگر میں اس بات چیت کے نتیجے میں نیشنل کانفرنس کا ایک وفد جس کی قیادت خواجہ غلام محمد صادق کر رہے تھے، سری نگر سے مسلم لیگی لیڈروں سے الحاق کے سوال پر بات چیت کرنے لاہور گیا اور انہوں نے لاہور میں نواب افتخار حسین خان ممدوٹ اور دوسرے مسلم لیگی راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ میرواعظ مولوی محمد یوسف صاحب اور اُن کے کچھ رفقاء لاہور ہی میں تھے کہ اسی دوران ۴ اکتوبر کو خواجہ غلام نبی گلکار نے "انور" کا لقب اختیار کر کے جموں کشمیر کے لئے ایک متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان لاہور کے اخبارات میں شائع ہوا، جس کے فوراً بعد گلکار صاحب راولپنڈی کے راستے سری نگر آپہنچے۔ ان کی روانگی کے دو دن بعد میرواعظ مولانا محمد یوسف بھی سری نگر کے لئے روانہ ہوگئے، لیکن وہ مری سے آگے نہیں آسکے کیوں کہ اُنہیں بتایا گیا کہ کوہالہ اور سری نگر کے درمیان ٹرانسپورٹ کا چلنا بند ہوگیا ہے اور یہ سارا راستہ غیر محفوظ ہے۔ راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے نیشنل کانفرنس کا وہ وفد بھی جو مسلم لیگی لیڈروں سے بات چیت کرنے لاہور گیا تھا اسی راستے سے واپس سری نگر نہیں آسکا۔

---

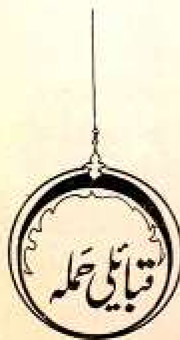
[1] پاکستان کے ان لیڈروں اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان بات چیت کی روئیداد لکھنے والے بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن نے راولپنڈی میں بتائی جو شیخ صاحب سے ملنے کے بعد بے حد مایوس ہو گئے تھے۔ بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن میرپور کے رہنے والے تھے اور انہوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسٹر سبھاش چندر بوس کے دوش بدوش کام کیا تھا اور انڈین نیشنل آرمی کو منظم کرنے میں ان کا زبردست دخل تھا۔





"من تو شدم ، تو من شدی"
سری نگر کے لال چوک میں جب جواہر لال نہرو اور شیخ صاحب نے کشمیر اور ہندوستان
کے درمیان عہد و پیمان کیا۔

۴





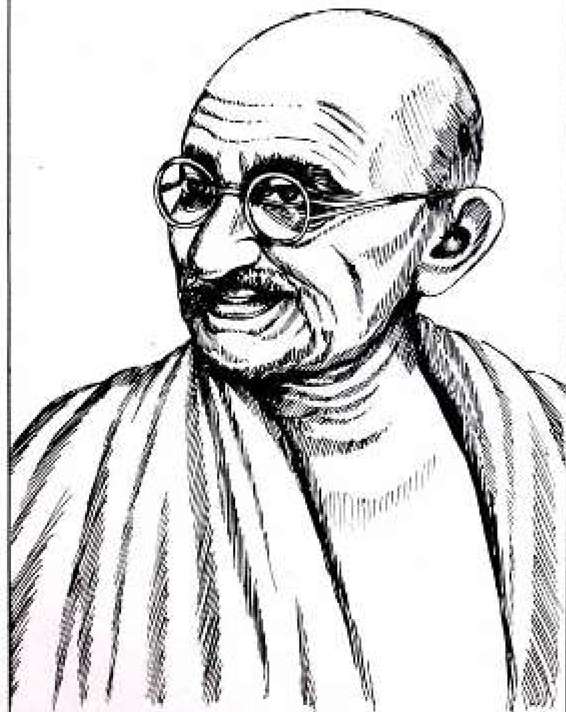
مہاراجہ ہری سنگھ



شیخ محمد عبداللہ



پنڈت جواہر لال نہرو جن کی کشمیر سے غیر معمولی دلچسپی نے سیاسی حالات کا
رُخ بدل کر رکھ دیا۔



۱۹۴۷ء
گاندھی جی — جو تقسیم ملک سے صرف دو ہفتے قبل کشمیر آئے اور جن کے کشمیر کے
دورے کے بڑے دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔



میرواعظ مولانا محمد یوسف



خواجہ غلام نبی گلکار انور جنہوں نے ۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں کشمیر کیلئے ایک
متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور جس کے وہ خود انور کے نام سے سربراہ تھے۔



گوپالاسوامی آئینگر



چوھدری سر محمد ظفراللہ خان



غلام محی الدین قرہ



چوھدری غلام عباس



ایک تاریخی منظر —— جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کراچی میں بانیٔ پاکستان کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف دلوایا
حلف اٹھانے کے بعد جناح صاحب آئین ساز اسمبلی کے ممبروں کے سامنے انتقالِ اقتدار کی دستاویز پڑھ رہے ہیں —— ★★

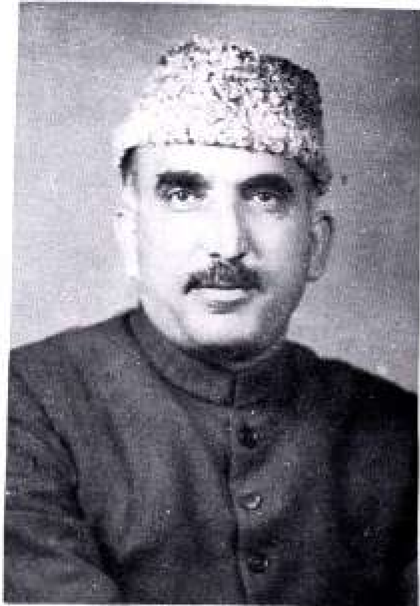


لیاقت علی خان کمپنی باغ (راولپنڈی) کے جلسے میں شرکت کیلئے آ رہے ہیں



لیاقت علی خان کی خدمت میں کمپنی باغ (راولپنڈی) کے جلسے میں سپاسنامہ پیش کیا جا رہا ہے

نئی دہلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پنڈت جواہر لال نہرو کو ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کے طور پر حلف دلوا رہے ہیں



بخشی غلام محمد



لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جنھیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو
ایک جلسۂ عام میں قتل کر دیا گیا۔



لیاقت علی خان پر گولی چلانے کے بعد
سید اکبر کی لاش کمپنی باغ میں پڑی ہوئی ہے



صدیوں پرانی درگاہ حضرت بل کی عمارت۔ جہاں سے موئے شریف کو چرا لے گئے



ہزاروں کشمیری عیدگاہ اور درگاہ میں موئے مبارک کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔



غلام محمد صادق



شمس الدین



جنوری ۱۹۶۴ء میں ہزاروں افراد کا سرینگر کی شاہراہوں پر موئے مبارک کے
چوری ہو جانے پر زبردست احتجاج کا ایک اور منظر۔



جنوری ۱۹۶۴ء میں سرینگر کی شاہراہوں پر مرد اور خواتین موئے مبارک کی چوری
پر احتجاج کرتے ہوئے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے ایک دوست اور ایک سرکردہ قانون دان مسٹر مہر چند مہاجن کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ ۱۵ اکتوبر کو مسٹر مہر چند مہاجن کی بطور وزیر اعظم کی تقرری کے ایک دن بعد یعنی ۱۶ اکتوبر کو شیخ محمد عبداللہ اچانک یہاں سے نئی دہلی گئے اور وہاں ایک ہفتے تک قیام کیا۔ انہوں نے نئی دہلی میں اپنے قیام کے دوران مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر رفیع احمد قدوائی، مسٹر آصف علی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل جو اُس وقت ہند کے وزیر داخلہ تھے کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور ان ملاقاتوں میں مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے حکومت ہند کو بھیجی گئی وہ دستاویز الحاق زیر بحث آئی، جو حکومت ہند کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر وی پی مینن کشمیر آکر اور مہاراجہ کے ساتھ طویل مذاکرات کے بعد مرتب کر کے اپنے ہمراہ دہلی لے گئے تھے اور جس میں مہاراجہ ہری سنگھ نے ہند یونین کے ساتھ دفاع، مواصلات اور امور خارجہ کے معاملات میں الحاق کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مسٹر مینن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مشیر اعلیٰ تھے اور انہوں نے والیان ریاست اور وائسرائے کے درمیان ہند یونین سے مختلف

ریاستوں کے الحاق کی بات چیت میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ حکومت ہند نے شیخ محمد عبداللہ سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ کی دستاویز الحاق اس شرط کے تحت قبول کر لی کہ جموں کشمیر میں صورت حال معمول پر آتے ہی ہند یونین سے جموں کشمیر کے الحاق کے مسئلے پر ریاستی عوام کی رائے معلوم کی جائے گی۔

شیخ محمد عبداللہ اور ہندوستان کے لیڈروں کے درمیان جموں کشمیر کے مستقبل پر بات چیت جاری تھی کہ اسی دوران ۲۴ اکتوبر کی صبح کو جنرل لاک ہارٹ نے جو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ افواج کے سپریم کمانڈر تھے، حکومت ہند کو مطلع کیا کہ انہیں پاکستان کی بری فوج کے قائم مقام کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کی طرف سے یہ اطلاع ملی ہے کہ مسلح قبائلیوں کے ایک لشکر نے جس کی تعداد پانچ ہزار ہے، کشمیر پر حملہ کر دیا ہے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس معاملے سے شیخ محمد عبداللہ کو باخبر کر دیا۔ چنانچہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان گفتگو کے نتیجے میں یہ طے ہوا کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے جموں کشمیر کے ہند یونین سے الحاق کی دستاویز حکومت ہند کے لئے اس شرط کے تحت قابل قبول ہے کہ ریاست کے ہند یونین سے الحاق کا معاملہ تب تک عارضی اور عبوری نوعیت کا رہے گا جب تک ریاستی عوام سے استصواب رائے کے ذریعے اس کی توثیق نہیں کرائی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی جموں کشمیر میں حکومت کی تشکیل نو اور فوجی امداد کی ترسیل وغیرہ کے معاملات طے کرنے کے بعد اگلے روز یعنی ۲۴ اکتوبر کو شیخ محمد عبداللہ ایک خصوصی فوجی طیارے میں نئی دہلی سے سرینگر واپس پہنچے۔ ان کی سرینگر میں واپسی کے بعد شہر کے سیاسی حلقوں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ شیخ صاحب کو مہر چند مہاجن کی جگہ وزیر اعظم بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نہایت ڈرامائی انداز میں مہاراجہ ہری سنگھ نے جو سرینگر سے فرار ہو کر جموں جا چکے تھے، شیخ محمد عبداللہ کو جموں کشمیر کی ایڈمنسٹریشن کا ناظم اعلیٰ مقرر کرنے کا پیغام بھیجا۔ دوسری طرف اس وقت تک قبائلی بارہمولہ پر قابض ہو چکے تھے اور ۲۴ اکتوبر کو آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا باقاعدہ اعلان بھی ہو چکا تھا۔ آزاد کشمیر حکومت کی باقاعدہ تشکیل کے سلسلے میں حکومت پاکستان نے سابق صوبہ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب کے وزرائے اعلیٰ یعنی خان عبدالقیوم خان اور نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے راولپنڈی کے کمشنر مسٹر عبدالرحیم سے اس بارے میں ضروری کارروائی کرنے کو کہا۔ مسٹر عبدالرحیم حکومت پاکستان کی خواہش کے مطابق آزاد کشمیر کی پہلی انقلابی حکومت کا سربراہ میرواعظ مولانا محمد

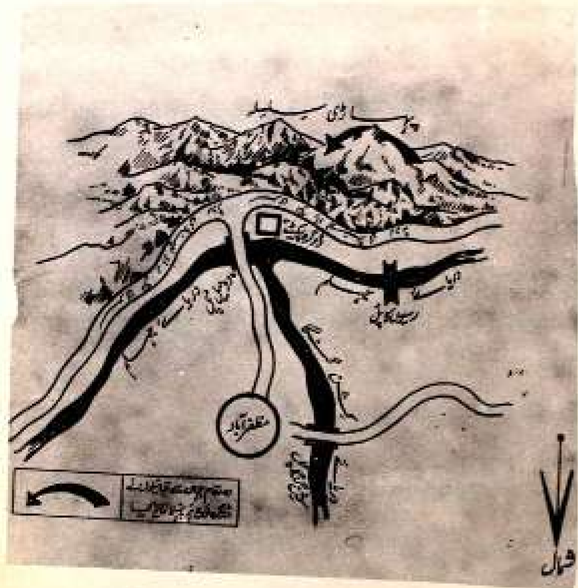
یوسف صاحب کو بنانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے میرواعظ صاحب سے مری آ کر ملاقات بھی کی اور انہیں آزاد کشمیر حکومت کی سربراہی قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میرواعظ صاحب اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے اس بارے میں یہ خدشہ ظاہر کیا کہ چونکہ ان کے بیوی بچے سرینگر میں ہیں، اسلئے اگر وہ متوازی حکومت کے سربراہ بن جاتے ہیں تو اس سے ان کے اہل خاندان کو سرینگر میں تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے اور اس طرح حکومت پاکستان ایک غیر معروف اور جونیئر مسلم کانفرنسی لیڈر سردار ابراہیم کو آزاد کشمیر حکومت کا صدر بنانے پر مجبور ہو گئی حالانکہ اس کے صرف چند ماہ بعد خود میرواعظ مولانا محمد یوسف کی استدعا پر انہیں صدر ابراہیم کی کابینہ میں وزیر تعلیم بنایا گیا۔

اصل حقائق

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے پہلے قبائلی پٹھانوں کی ایک خاصی تعداد پرائیویٹ چھکڑوں اور بسوں میں ایبٹ آباد کے راستے مظفر آباد کے قرب و جوار میں پہنچ چکی تھی لیکن نہ تو ان کی تعداد پانچ ہزار تھی اور نہ ہی کسی فوج کے ساتھ کسی جگہ ان کا ٹکراؤ ہوا تھا جیسا کہ پاکستان کے انگریز قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے اپنے انگریز سپریم کمانڈر جو اس وقت دہلی میں تھا کو اطلاع دی تھی۔ جو قبائلی غیر منظم طور پر دیسی ساخت کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر پرائیویٹ بسوں اور چھکڑوں میں ایبٹ آباد کے راستے مظفر آباد کے دیہات میں آئے تھے ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد دو ہزار تھی۔ وہ دو دن تک مظفر آباد کے مغرب میں دریائے جہلم اور دریائے کشن گنگا کے کنارے پر واقع بعض علاقوں میں ہی رہے۔ ۲۳ اور ۲۴ اکتوبر کی درمیانی شب کو مظفر آباد سے قریب تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف مسلح قبائلیوں کی دو ٹولیاں دریائے جہلم پر جا کے رسیوں کے پل پر سے رات کے اندھیرے میں گزر کر دریا کے مشرقی کنارے پر آ اتریں۔ رسیوں کا یہ پل جس پر بیک وقت صرف ایک آدمی چل سکتا تھا سول آبادی کے عبور و مرور کے لئے پہلے سے بنا ہوا تھا۔ دریا عبور کرنے کے بعد مسلح قبائلیوں کا یہ گروہ چھپ چھپا کر اس چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر پہنچ گیا جس کے دامن میں عین دریائے جہلم کے کنارے کوہالہ جانے والی سڑک پر دومیل پل سے صرف چند فرلانگ کے فاصلے پر ڈوگرہ فوج کا سرحدی کیمپ تھا۔ فوج کے کچھ سپاہی مظفر آباد میں سول انتظامیہ کی مدد کے لئے بھی موجود رہتے تھے اور دوسری جانب دریائے کشن گنگا کے پل پر بھی ان کی ایک حفاظتی چوکی تھی۔

مسلح قبائلیوں کا جو گروہ ڈوگرہ فوج کے کیمپ کی عقب والی پہاڑی پر پہنچا تھا اس نے ۲۴ اکتوبر کو صبح ہونے سے

پہلے ڈوگرہ فوج کے کیمپ پر فائرنگ کی۔ اس اچانک غیر متوقع اور عقب سے فائرنگ نے فوجی کیمپ میں زبردست بھگدڑ اور ابتری پیدا کر دی اور صرف چند گھنٹوں میں ڈوگرہ فوج کا یہ سرحدی کیمپ خالی ہو گیا۔ فوج گاڑیوں میں سوار ہو کر وہاں سے سرینگر راولپنڈی شاہراہ کے راستے سرینگر کی طرف بھاگنے لگی اور قبائلی بھی اسی اثنا میں چھکڑوں اور پرائیویٹ بسوں میں سوار ہو کر اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔ دومیل کے پُل سے اوڑی تک دو ایک مقامات پر ڈوگرہ فوج اور قبائلیوں کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوئیں لیکن ڈوگرہ فوج کہیں بھی جم کر نہیں لڑ سکی۔ اوڑی پہنچنے کے بعد ڈوگرہ فوج نے وہ پل تباہ کر دیا جو اس شاہراہ پر بڑی اہمیت کا حامل تھا اور جس کی تباہی قبائلیوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ بن گئی۔ اب پل کے ایک کنارے پر ڈوگرہ فوج مورچہ بند تھی اور دوسرے کنارے پر قبائلی لشکر جمع ہو رہا تھا۔ سارا دن خاموشی طاری رہی۔ رات کے وقت قبائلیوں نے فائرنگ شروع کر دی اور بہت سے قبائلی پیدل دریا عبور کر کے اُس علاقے میں آ پہنچے جہاں ڈوگرہ فوج مقابلہ کر رہی تھی۔ چنانچہ قبائلیوں کی آمد اور فائرنگ پر ڈوگرہ فوج پسپا ہو کر بڑی سرعت کے ساتھ بارہمولہ کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ گرد و نواح کی دیہاتی آبادی نے صرف ایک دن اور ایک رات میں قبائلیوں کی گاڑیوں کے لئے (DIVER SION) بنا دی اور وہ ریاستی فوج کے تعاقب میں بارہمولہ کی طرف چل پڑے۔ ڈوگرہ فوج بھاگتے ہوئے بارہمولہ پہنچی جہاں اس نے کئی دکانیں لوٹ لیں اور سامان خورد و نوش حاصل کیا۔ قصبے کی بیشتر آبادی قبائلی حملے کے پیش نظر اپنے گھر خالی کر کے محفوظ مقامات پر منتقل ہو گئی تھی۔ جب ڈوگرہ فوج کو قبائلیوں کے وہاں تک آنے کی اطلاع ملی تو وہ اُن کی آمد سے پہلے ہی بارہمولہ خالی کر کے سرینگر کی طرف فرار ہو گئی اور قبائلیوں نے بغیر ایک گولی چلائے بارہمولہ پر قبضہ کر لیا اور یہاں اُنہوں نے بھی لوٹ مار شروع کر دی۔ مظفرآباد سے برق رفتاری کے ساتھ صرف دو دن میں بارہمولہ پہنچنے والے قبائلی بارہمولہ سے آگے نہیں بڑھے اور وہیں قیام کیا تاوقتیکہ ۲۷ اکتوبر کی صبح کو آل انڈیا ریڈیو سے دو اہم خبریں نشر ہوئیں۔ ایک یہ کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست جموں کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کر لیا ہے اور حکومت ہندوستان نے مہاراجہ کی درخواست قبول کرتے ہوئے ریاستی فوج کی مدد کے لئے انڈین آرمی بھیجنا شروع کر دیا ہے اور دوسری اہم خبر جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی وہ یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموں کشمیر کی ایڈمنسٹریشن کے ناظم اعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیا ہے کچھ عرصہ بعد مہاراجہ نے شیخ محمد عبداللہ کو باقاعدہ اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور اُنہوں نے جو اپنی کابینہ بنائی اس میں بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم، مرزا محمد افضل بیگ وزیر مال اور پنڈت شیام لال صراف



وزیر مملکت بنائے گئے۔ اس کابینہ میں جموں کے گردھاری لال ڈوگرہ اور کرنل پیر محمد بھی شامل تھے۔

جنرل طارق سرینگر کے دروازے پر

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے بھارتی ہندوستانی فوج طیاروں کے ذریعے سرینگر کے ہوائی اڈے پر اترتی رہی۔ ریاست جموں کشمیر کے ہند یونین کے ساتھ الحاق کے باقاعدہ اعلان نے پاکستان کے حکمرانوں کو تشویش میں ڈال دیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

چنانچہ وزیر اعظم لیاقت علی خان فوراً کراچی سے لاہور آئے۔ اور انہوں نے وہاں اعلیٰ سیاسی لیڈروں اور فوجی افسروں کی مشترکہ کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم، پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ، سردار شوکت حیات خان، میجر جنرل سکندر مرزا جو اس وقت وزارت دفاع میں جوائنٹ سیکرٹری تھے، بریگیڈیئر شیر خان اور بریگیڈیئر اکبر خان بھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں فوجی افسروں نے صورت حال کے پیش نظر فوری طور پر جموں پر قبضہ کرنے کی تجویز پیش کی لیکن وزیر اعظم نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ ایسی صورت میں ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے گا۔ اور ان کے سنگین خطرے پیدا ہو جائیں گے۔ البتہ اس کانفرنس میں حملہ آور قبائلیوں کی امداد، انہیں گولہ بارود فراہم کرنے اور مزید لوگوں کو کشمیر میں لڑنے کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اہم کام پر بریگیڈیئر اکبر خان کو مقرر کیا گیا اور انہوں نے جنرل طارق کے نام سے ایک بے ترتیب بکھری ہوئی غیر منظم اور سابق فوجیوں اور قبائلیوں پر مشتمل فوج کی کمان سنبھالی۔

اس سلسلے میں سب سے اہم اور دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جوں ہی پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح کو جموں کشمیر کے ہندوستان سے باقاعدہ الحاق کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے پاکستان کی بری فوج کے انگریز سربراہ کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر جموں پر قبضہ کر لے۔ گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری نے جب یہ احکامات بری فوج کے کمانڈر انچیف تک پہنچائے تو اس نے اس پر عمل کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ان دونوں ملکوں یعنی ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ فوجی کمان کے سپریم کمانڈر جنرل آکن لیک کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ جنرل طارق ۲۹ اکتوبر کو راولپنڈی سے سرینگر کی طرف روانہ ہوئے اور بغیر کسی مزاحمت کے بارہمولہ پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ قبائلی ۲۶ اکتوبر کی صبح کو ہی اگرچہ بارہمولہ پہنچ چکے تھے لیکن وہ ۲۸ اکتوبر تک بارہمولہ میں رکے رہے۔ جنرل طارق کو اس پر تعجب ہوا اور انہوں نے اس بارے میں جب پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ قبائلی لشکر کو سپہ سالار میجر خورشید نے جسے حکومت پاکستان نے اس عہدے پر فائز کیا تھا دو دن

تک بارہمولہ میں اس لئے روکے رکھا کیونکہ اس نے سردار ابراہیم کو بارہمولہ آنے کا پیغام بھیجا تھا تاکہ اس کے ساتھ یہ طے کیا جا سکے کہ کشمیر کی حکومت میں میجر خورشید کی پوزیشن کیا ہوگی۔ میجر خورشید کو یقین تھا کہ قبائلی بارہمولہ سے پیش قدمی کرنے کے چند گھنٹے بعد ہی آزاد حکومت سرینگر پر قابض ہو جائیں گے لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ان دو دنوں کے دوران جو کچھ ہوا اس نے تاریخ کا دھارا بدل ڈالا۔ ہو سکتا تھا کہ اگر قبائلی بارہمولہ سے اسی دن سرینگر آ جاتے تو کشمیر کی کہانی بالکل مختلف ہوتی۔ جنرل طارق نے بتایا کہ وہ تقریباً نصف شب تک بارہمولہ میں ٹھہرے اور اس کے بعد وہاں سے اپنی فوجی جیپ گاڑی میں سرینگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ بارہمولہ سے سرینگر تک انہیں کسی جگہ بھی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ البتہ جب سرینگر کے قریب پہنچے تو فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ سرینگر سے تقریباً چار میل دور سڑک پر رک گئے۔ کیونکہ اس سے آگے جیپ گاڑی میں آنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے وہاں ایک مقام پر قبائلیوں کو سڑک کی جانب فائرنگ کرتے دیکھا جس سے انہیں یقین ہو گیا کہ وہ محاذ جنگ پر پہنچ چکے ہیں۔ جنرل طارق نے اسی جگہ ایک مکان میں اپنی قیام گاہ بنائی اور سرینگر میں داخل ہونے کے منصوبے باندھنا شروع کئے لیکن چونکہ سرینگر کے باہر کے علاقے میں پانی ہی پانی تھا اور کھیت بھی پانی سے بھرے تھے اور بعض جگہوں پر بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا جس سے یہ سارا علاقہ ایک جھیل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس لئے جنرل طارق آسانی کے ساتھ سرینگر میں داخل نہیں ہو سکے۔ انہوں نے جب ہر طرف مایوسی کے آثار دیکھے تو قبائلیوں کے ایک گروہ کو سڑک کے راستے

ل۔ بریگیڈیئر اکبر خان المعروف جنرل طارق سے میرا تعارف بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن نے راولپنڈی میں اپنی قیام گاہ پر کرایا تھا۔ وہ اکثر وہاں آیا کرتے تھے۔ اور سیاسی مسائل پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات ان کے ہمراہ ان کی بیوی بیگم نسیم اکبر بھی ہوا کرتی تھی۔ اس بحث و مباحثے میں عبدالرحمٰن قدسی جو سرینگر سے ہجرت کر کے راولپنڈی میں مقیم تھا بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ بریگیڈیئر اکبر خان کو کشمیر کی زبردست تڑپ تھی اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کشمیر لیاقت علی خان کی غلطیوں کی وجہ سے پاکستان کے ہاتھ سے چلا گیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء میں جنرل اکبر خان کو جو اس وقت پاکستان کی بری فوج کے چیف آف سٹاف تھے، حکومت پاکستان کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ بعد میں وہ باعزت طور پر بری ہو گئے۔ جنرل اکبر اور جنرل محمد ایوب خان کے درمیان شروع سے ہی اختلافات چلے آ رہے تھے چنانچہ پاکستان میں جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کے اقتدار کے خاتمے کے بعد مسٹر بھٹو نے جنرل اکبر خان کو برطانیہ میں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیجا۔ جہاں وہ ۱۹۸۰ء میں انتقال کر گئے۔

فوج کے مورچے پر حملے سے اور براہِ راست ہوائی اڈہ لینے کا حکم دیا تاکہ سرینگر میں داخل ہونے کا راستہ صاف ہو جائے۔ قبائلیوں نے فوج کی پوسٹ پر حملے سے پہلے ہی زور دار حملہ کیا تو مشین گنوں، مارٹروں اور رائفلوں نے اُن سب کو بھون کے رکھ دیا اور یہ حملہ ناکام ہو گیا۔ جنرل طارق دن کو اسی علاقے میں چھپ کر بیٹھتے۔ انہوں نے اپنی گاڑی کو درختوں سے کاٹی ہوئی ٹہنیوں اور جھاڑیوں سے ڈھانپ دیا تھا اور شام کے بعد جبکہ ہوائی حملے کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا تھا وہ اپنی فوجی سرگرمیاں شروع کر دیتے۔ جنرل طارق نے ہندوستانی فوج کے بارے میں تقریباً ساری معلومات حاصل کر لیں اور سرینگر کے دفاع کے بارے میں اُنہیں یقین ہو گیا کہ اگر اُن کے پاس صرف ایک بٹالین فوج ہو تو وہ سرینگر پر قبضہ کر سکتے تھے۔ اُن کا ٹارگیٹ سرینگر تھا۔ ایک دو بار اُنہوں نے کشتیوں کے ذریعے سرینگر میں داخل ہونے کا منصوبہ بنایا لیکن چونکہ اس کے لئے مقامی لوگوں کی مدد کی ضرورت تھی اور کسی مقامی شخص نے ایسی مدد فراہم کرنے پر ڈر کے مارے آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس لئے اس مدد کی عدم موجودگی میں ان کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ تیسری شام کو جب سورج غروب ہو گیا اور طیاروں کا غلغلہ ٹل گیا تو جنرل طارق نے اپنی جیپ گاڑی نکالی اور واپس روانہ ہو گئے۔ راولپنڈی پہنچ کر اُنہوں نے جنرل ہیڈ کوارٹر کے کوارٹر ماسٹر سے رابطہ قائم کیا اور متعلقہ افسر سے دو کمپنی توپ گولہ بارود اور فوج کی ایک رجمنٹ مانگی۔ اُنہیں یقین تھا کہ صرف اس فوجی جمعیت سے وہ سرینگر پر قبضہ کر لیں گے اور متعلقہ افسر یہ سب کچھ دینے کے لئے تیار بھی ہو گیا تھا لیکن بریگیڈیئر شیر خان نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ قبائلی بے یارو مددگار چھوڑ دیئے گئے اور وہ واپس ہو کر راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ وہ جس برق رفتاری کے ساتھ سرینگر پہنچے تھے اُسی تیزی کے ساتھ واپس بھاگتے ہوئے اوڑی جا پہنچے۔ اوڑی میں بھی اُن کی معمولی سی تعداد ٹھہری اور باقی لوگوں نے اپنا راستہ لیا۔ کوئی ایک ہفتے بعد حکومتِ پاکستان نے جنرل طارق کو دوبارہ محاذِ جنگ پر جانے کے لئے آمادہ کر لیا چنانچہ وہ پھر کشمیر آئے۔ اوڑی تک کا سارا علاقہ ابھی قبائلیوں ہی کے قبضے میں تھا۔ جنرل طارق نے اوڑی پہنچ کر منتشر قبائلیوں اور بکھرے ہوئے سابق فوجیوں کو دوبارہ اکٹھا کر کے محاذ قائم کر لیا

۵



کشمیر میں جنگ چھڑنے کے دو ماہ بعد ہندوستان نے جنوری ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتے میں کشمیر کا سوال اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں پیش کر دیا اور اقوام متحدہ سے یہ درخواست کی کہ چونکہ آئینی اور قانونی لحاظ سے ریاست جموں کشمیر ہند یونین کا ایک حصہ بن چکی ہے اور پاکستان نے ہندوستان کے اس علاقے پر جارحانہ حملہ کیا ہے۔ اس لئے اقوام متحدہ پاکستان کو جارح قرار دے کر اس علاقے سے نکل جانے کی ہدایت کرے۔

چنانچہ جب سلامتی کونسل میں اس مسئلے پر بحث شروع ہوئی تو ہندوستان کے نمائندے مسٹر گوپالا سوامی آئنگر اور پاکستان کے نمائندہ وزیر خارجہ چوہدری سر ظفر اللہ خان نے اس بحث میں حصہ لیا۔ دلائل اور جوابی دلائل سننے کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے کشمیر پر اپنی پہلی قرارداد پاس کی جس کے ذریعے ایک کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا اور اسے یہ کام سونپا گیا کہ وہ برصغیر جا کر وہاں صورت حال اور حقائق کا جائزہ لینے کے بعد سلامتی کونسل کو اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان کے ممبر یہاں آئے۔ انہوں نے کراچی اور نئی دہلی کے علاوہ سری نگر اور مظفر آباد کا بھی

دورہ کیا۔ کمیشن کے کچھ ممبر خفیہ طور پر محاذ جنگ پر بھی پہنچے اور حقائق معلوم کرنے کے بعد انہوں نے سلامتی کونسل کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ ۱۹۴۹ء کے دوران سارا سال کئی بار سکیورٹی کونسل کا اجلاس ہوا۔ اس میں کشمیر پر بحث ہوتی رہی اور دوسری طرف کشمیر کے اہم سرحدی علاقوں میں جنگ جاری رہی۔ اس کے علاوہ بھی ہندوستان اور پاکستان کشمیر میں جنگ لڑنے کی بجائے گفت و شنید کے ذریعے اس مسئلے کو طے کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ خود کشمیر میں بھی وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ اور مسلم کانفرنس کے راہنما چوہدری غلام عباس جو اس وقت ہیرا نگر سنٹرل جیل سے جموں جیل میں منتقل کئے جا چکے تھے کے درمیان متعدد بار تبادلہ خیال ہوا۔ وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے جنوری اور فروری ۱۹۴۸ء کے مہینوں میں جب کہ ریاست کا صدر مقام موسم سرما کے سلسلے میں سری نگر سے جموں منتقل ہو چکا تھا، جموں جیل میں چوہدری غلام عباس کے ساتھ تین بار ملاقات کی اور تیسری ملاقات کے دوران دونوں سیاسی لیڈر ایک فارمولے پر متفق ہو گئے چنانچہ وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے ۲۶ فروری ۱۹۴۸ء کو اپنے نائب بخشی غلام محمد کو جن کی تحویل میں لاء اینڈ آرڈر کا محکمہ تھا، اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا کہ وہ چوہدری غلام عباس کو جموں جیل سے رہا کرنے اور سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان بھیجنے کا انتظام کریں۔ چنانچہ ۲۸ فروری ۱۹۴۸ء کو چوہدری غلام عباس جموں جیل سے رہا کر دیئے گئے اور ۳ مارچ کے پاکستانی اخبارات میں ان کی رہائی اور سوچیت گڑھ کے راستے ان کے سیالکوٹ پہنچنے کی خبر شائع ہوئی۔ چوہدری غلام عباس کے خویش و اقارب اور بیوی بچے سیالکوٹ میں ہی تھے، جو ستمبر ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران جموں سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آ گئے تھے۔ چوہدری صاحب کی پاکستان میں آمد کی خبر جب سیاسی اور اخباری حلقوں میں پھیلی تو کشمیر کے بہت سے سرکردہ سیاسی لیڈر اور پاکستان کے کچھ صحافی سیالکوٹ ان سے ملنے گئے۔ چوہدری صاحب ہر شخص سے ملتے رہے لیکن انہوں نے اپنی آمد اور اپنے مشن کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا بلکہ سارا معاملہ صیغۂ راز میں ہی رکھا۔ جب اخباری نمائندوں نے انہیں کچھ بتلانے پر مجبور کیا تو انہوں نے بڑے پُراسرار انداز میں یہ کہا ——— جب تک میں کراچی جا کر قائد اعظم سے نہیں ملتا میں کوئی بات ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے قائد اعظم سے ملنے دیجئے پھر سب کچھ آپ کو بتاؤں گا۔ مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر شخص اس بات کا منتظر رہا کہ وہ کب کراچی جاتے ہیں! سیالکوٹ میں کچھ عرصہ تک قیام کے بعد چوہدری غلام عباس سیالکوٹ سے لاہور پہنچے۔ وہاں دو دن گزارنے کے بعد وہ کراچی روانہ ہو گئے۔ چوہدری غلام عباس

کراچی پہنچے اور انہوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ ملاقات بھی کی اور کوئی ایک ہفتے تک کراچی میں قیام کرنے کے بعد جب واپس لاہور پہنچے [1] اور بعض صحافیوں کو ان کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے چوھدری غلام عباس کی قیام گاہ پر جا کر ان سے کچھ پوچھنا چاہا۔ چوھدری غلام عباس نے ان صحافیوں کو سرسری طور پر بتایا کہ وہ کل اخباری نمائندوں کو ساری صورت حال سے آگاہ کریں گے لیکن وہ اسی دن شام کو چپکے سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر لاہور سے واپس سیالکوٹ جا پہنچے اور پھر خاموش ہو گئے۔ چند برس کے بعد جب چوھدری صاحب ایبٹ آباد میں قیام پذیر تھے تو ایک دن میں نے اس بارے میں ان سے استفسار کیا کہ آپ جب کشمیر سے سیالکوٹ آئے تھے تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ اپنے مشن کے بارے میں اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتے جب تک کہ آپ قائد اعظم سے نہ مل لیں، لیکن بعد میں قائد اعظم سے ملنے کے باوجود آپ نے اپنے مشن کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا کہ آخر آپ کی جموں جیل سے رہائی اور پاکستان میں آمد کا پس منظر کیا تھا! —

چوھدری غلام عباس اس معاملے کو ٹال گئے البتہ یہ وعدہ کیا کہ وہ یہ ساری بات اپنی زیر تصنیف کتاب "کشمکش" میں ظاہر کریں گے۔ جب "کشمکش" شائع ہوئی تو اس میں بھی اس معاملے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن موقع پا کر میں نے چوھدری غلام عباس کو یاد دلایا کہ وہ "کشمکش" میں بھی اپنی جموں جیل سے رہائی اور پاکستان میں آمد کے مشن کا مسئلہ ٹال گئے ہیں اور پھر میں نے انہیں بتایا کہ مجھے آپ کے مشن کے بارے میں اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ معلوم ہے کیونکہ وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کا سیکورٹی افسر مسٹر سلہریا [2] کشمیر سے پاکستان آ چکا ہے اور اس نے مجھے جموں جیل میں آپکے اور شیخ صاحب کے درمیان ملاقاتوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ — چنانچہ چوھدری صاحب نے مجھ سے یہ قول و قرار لینے کے بعد کہ میں اس بارے میں اخبار میں کچھ بھی نہیں شائع کروں گا یہ انکشاف کیا کہ — "میرے اور شیخ صاحب کے درمیان بہت سے

---

[1] چوھدری غلام عباس سے میری پہلی ملاقات لاہور میں انارکلی کے دہلی مسلم ہوٹل میں ہوئی، جہاں چوھدری صاحب کراچی روانہ ہونے سے پہلے وارد ہوئے تھے۔ اور اس کے بعد ۱۹۵۰ء تک ان کے ساتھ گہرے مراسم رہے۔

[2] مسٹر سلہریا جموں کے رہنے والے تھے اور جموں کشمیر پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ وہ کشمیر میں جنگ بندی کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں انہوں نے وزارت میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

معاملوں پر بات چیت ہوئی تھی۔ اس بات چیت کے دوران ہم دونوں اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے کسی نہ کسی طرح ختم کیا جانا چاہئے (یاد رہے کہ ان دنوں ریاست میں جنگ ہو رہی تھی) چنانچہ ہم دونوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ — کشمیر میں ہندوستان اور پاکستان جنگ بند کر دیں اور جموں کشمیر کی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی پوزیشن بحال کر دی جائے۔ ریاست میں عبوری دور کے لئے نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کی ایک ملی جلی حکومت انتظام سنبھال لے اور ریاست کے دونوں ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات اور راستوں کی آمد و رفت بحال کر دی جائے۔ تین برس کے بعد اس مقصد کے لئے رائے شماری کروائی جائے گی کہ ریاست کے لوگ اپنی پوزیشن کو کونسی شکل دینا چاہتے ہیں، یا ہندوستان اور پاکستان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں۔ ان تمام مسائل اور امور کو طے کرنے کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے با اختیار لیڈروں، شیخ محمد عبداللہ، میرے اور ہم دونوں کے رفقاء کی ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پر بھی اتفاق رائے ہو چکا تھا۔"

چوھدری غلام عباس نے مجھے بتایا کہ — "میں نے جب یہ سارا معاملہ قائد اعظم کے سامنے رکھا تو انہوں نے اس معاملے پر شبہات ظاہر کرتے ہوئے یہ فارمولا مسترد کر دیا اور کہا کہ چونکہ کشمیر کا معاملہ ہندوستان اقوام متحدہ میں لے گیا ہے، اس لئے ہمیں عالمی ادارے کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

چنانچہ میں نے "قومی مفاد کے پیش نظر" ہر مرحلے پر اپنے اس مشن کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہا۔" —

انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ — "جب اپریل ۱۹۵۲ء کے دوسرے ہفتے میں امریکہ کے نائب صدر مسٹر ایڈلائی سٹیونسن راولپنڈی آئے تھے تو خود انہوں نے ہی پاکستانی حکام کے ذریعے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں ان سے ملوں، چنانچہ میں ایبٹ آباد سے راولپنڈی گیا، جہاں سرکٹ ہاؤس میں مسٹر ایڈلائی سٹیونسن کے ساتھ ملاقات کے دوران اس فارمولے پر بھی بات چیت ہوئی تھی اور مسٹر سٹیونسن نے مجھے بتایا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ نے انہیں اس فارمولے اور میری رہائی وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔" — یاد رہے کہ مسٹر ایڈلائی سٹیونسن جو امریکہ کے نائب صدر اور صدارتی انتخابات میں امریکی صدر کے عہدے کے امیدوار تھے، جب اس برصغیر کے دورے پر آئے تو وہ نئی دہلی سے سرینگر بھی گئے تھے۔ یہاں انہوں نے اپنے مختصر قیام کے دوران وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ سے بھی ملاقات کی تھی۔ ان کی آمد سے پہلے نئی دہلی میں متعین

امریکی سفیر نے بھی سرینگر آکر حالات کا جائزہ لیا تھا اور شیخ محمد عبداللہ کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔

۱۹۴۸ء کی ابتدا میں بھی ایک مرحلے پر وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس مسئلے کو سیاسی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کے لیے دونوں ملکوں کے درمیان ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تجویز پیش کی تھی۔ انہوں نے اپنی اس تجویز میں کہا تھا کہ اس گول میز کانفرنس میں ہندوستان اور پاکستان کے گورنر جنرل یعنی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر محمد علی جناح، دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم یعنی پنڈت جواہر لال نہرو اور خان لیاقت علی خان اور مہاراجہ ہری سنگھ اور جموں کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ شامل ہوں۔ تجویز میں باہمی صلاح مشورے سے مزید لوگوں کی کانفرنس میں شرکت کی گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔ حکومت پاکستان نے اس تجویز پر غور کرنے کے بعد بعض شرائط کے تحت قبول کر لیا تھا۔ لیاقت علی خان نے اس سلسلے میں حکومت ہند کو بتایا کہ چونکہ گورنر جنرل پاکستان کی طبیعت ناساز ہے، اس لیے وہ دہلی نہیں جا سکیں گے۔ پاکستان مجوزہ گول میز کانفرنس لاہور میں منعقد کرنے پر آمادہ ہے اور حکومت ہند کی طرف سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جو نام تجویز کیے گئے ہیں، ان میں سے جموں کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کے سوا سارے نام پاکستان کے لیے قابل قبول ہیں۔ لیکن بعد میں یہ گول میز کانفرنس منعقد نہیں ہو سکی۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان نے دونوں ملکوں کی حکومتوں کو جموں کشمیر میں جنگ بندی اور اس تنازعے کے تصفیے کے بارے میں اپنی تجویزیں پیش کیں، جنہیں دونوں ممالک نے قبول کر لیا۔ ایک ہفتے بعد یعنی ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو گورنر جنرل پاکستان مسٹر محمد علی جناح انتقال کر گئے اور کچھ روز بعد ہی ہندوستان کی فوج حیدرآباد میں داخل ہو گئی۔



٦

کشمیر میں جنگ بندی

کشمیر کے معاملے پر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان نے دونوں ملکوں کے ساتھ طویل بات چیت کے بعد جنگ بندی کا جو مجوزہ تجویز کیا، اس میں یہ طے ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان فوری طور پر کشمیر میں جنگ بند کر دیں، جس کے بعد جنگ بندی کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین تعینات کئے جائیں گے اور اس کے بعد ریاست میں معمول کی صورت حال بحال کرنے کے لئے دونوں جانب مسلح سپاہیوں کی تعداد بالکل کم کر دی جائے گی اور جب معمول کی صورت حال بحال ہو جائے گی تو اقوام متحدہ کی نگرانی میں اس بات پر استصواب رائے کروایا جائے گا کہ جموں کشمیر کے لوگ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے ہیں یا پھر ایک خود مختار ملک کی حیثیت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فارمولا ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں نے منظور کیا جس کے مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کو رات کے بارہ بجے کشمیر کے پورے محاذ پر جنگ بندی کا نفاذ ہوا چنانچہ ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو سیکورٹی کونسل نے دونوں ملکوں کے درمیان سمجھوتے کی توثیق کے سلسلے میں ایک قرارداد پاس کر دی جس کے مطابق جنگ بندی کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ

کے فوجی مبصرین کشمیر آنا شروع ہو گئے۔ جب جنگ بندی ہوئی تو اس وقت ریاست کی صورت حال یہ تھی کہ ضلع میرپور کا تقریباً نصف علاقہ جو پاکستان کی سرحد کے ساتھ ملتا تھا، ضلع پونچھ کا تقریباً نصف علاقہ جو پاکستان کی سرحد کے ساتھ ملتا تھا، اور ضلع مظفرآباد کا وہ بیشتر علاقہ جو پاکستان کی سرحد کے ساتھ ملتا تھا، پاکستان کی تحویل میں چلا گیا اور باقی ساری ریاست ہندوستان کی عملداری میں آ گئی۔

جموں کشمیر میں جنگ بندی کے سوال پر پاکستان کی مسلح افواج کے بعض جرنیلوں اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کے درمیان اتفاق رائے نہیں تھا۔ فوجی افسروں کا خیال تھا کہ جنگ بندی اس وقت ہونی چاہیے تھی جب پونچھ کا بیشتر علاقہ پاکستان کے قبضے میں تھا اور پاکستان کی فوج پار ڈوڈہ کے سلسلہ کوہ سے بارہمولہ کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ یہ صورت حال جنگ بندی سے صرف ۳ ماہ پہلے کی تھی اور غالباً حکومت ہند اس امر سے بخوبی واقف تھی کہ ڈیڑھ دو مہینے میں جنگ بند ہو جائے گی، اس لئے اس نے کشمیر میں ایک ایسا زوردار حملہ کیا جس میں اس نے فوجی اہمیت کے بہت سے مقامات پاکستانیوں سے چھین لئے لیکن دوسری طرف پاکستان کی حکومت اور کشمیر میں لڑنے والے اس کے اہلکار سارے معاملات سے بالکل بے خبر تھے چنانچہ جب جنگ بندی کے بارے میں فوجی افسروں سے صلاح مشورہ کیا گیا تو انہوں نے پاکستان کے وزیر اعظم کو یہ مشورہ دیا کہ وہ جنگ بندی کو کم از کم دو ایک ماہ کے لئے ملتوی رکھیں تاکہ پاکستان دوبارہ صف بندی کر کے محاذ جنگ پر ایسی پوزیشن اختیار کر لے جو سیاسی مذاکرات میں پاکستان کی بات منوانے کا سبب بن سکے لیکن لیاقت علی خان نے یہ مشورہ مسترد کر دیا اور جنگ بندی کے سمجھوتے پر دستخط کر دیئے گئے۔

جموں کشمیر میں جنگ بندی کے بعد جب مسئلے کے حل کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی تو پاکستان کی درخواست پر سیکیورٹی کونسل کا اجلاس ہوا اور کونسل نے ایک قرارداد پاس کی جس کی رو سے آسٹریلیا کے ایک قانون دان اوون ڈکسن کو فریقین کے درمیان مصالحت کرانے اور کشمیر کا تنازعہ حل کرانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ مسٹر ڈکسن ۲۷ مئی ۱۹۵۰ء کو برصغیر آئے۔ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ کشمیری لیڈروں سے بھی اس مسئلے کے تقریباً تمام پہلوؤں پر طویل مذاکرات کئے اور ان مذاکرات کے نتیجے میں مسئلے کے تصفیے کے لئے ایک پلان پیش کیا۔ ڈکسن پلان کے مطابق وادی کو آزاد کشمیر اور جموں کے بعض علاقوں سے الگ کئے جانے اور اسے ایک مختصر مدت تک خود مختاری دینا مقصود تھی اور اس

مختصر مدت کے خاتمے پر ساری ریاستی آبادی کی مجموعی رائے حاصل کرکے اس مسئلے کا کوئی پائیدار حل نکالنا بھی ڈکسن پلان کا منشا تھا اور خود جموں کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے بھی ڈکسن پلان کی حمایت کی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک برطانوی اخبار ابزرور کو ایک انٹرویو بھی دیا تھا جس پر نئی دہلی کو تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ شیخ صاحب کو نئی دہلی بلایا گیا۔ جہاں انہوں نے اس قسم کے انٹرویو سے لاتعلقی ظاہر کردی۔ ڈکسن کی ناکامی کے بعد سلامتی کونسل نے ایک اور مصالحت کنندہ ڈاکٹر گراہم کو کشمیر بھیجا اور وہ بھی ناکام ہوگیا۔ اس کے بعد بھی سلامتی کونسل کے اجلاس ہوتے رہے اور اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ چنانچہ پاکستان کی درخواست پر ۱۹۵۶ء میں سلامتی کونسل کا جو اجلاس ہوا۔ اس میں طویل صلاح مشورے کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو ایک قرارداد کونسل کے گیارہ ممبران (اس وقت کونسل کے صرف گیارہ ممبر ہوا کرتے تھے۔) میں سے دس کی حمایت سے منظور کر لی گئی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ چونکہ ہندوستان اور پاکستان سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عمل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس لئے کشمیر سے دونوں ممالک کی افواج کو واپس بلایا جائے اور ان کی جگہ امن و امان کی برقراری کے لئے اقوام متحدہ کی فوج اس وقت تک کشمیر میں متعین کی جائے، جب تک کشمیری عوام ایک آزادانہ رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں ـــــ لیکن روس نے اس قرارداد کو ویٹو کر دیا۔ اس کے بعد بعض ترمیموں کے ساتھ ایک دوسری قرارداد پیش کی گئی اور اسے بھی روس نے ویٹو کر دیا۔ تاہم کونسل کا اجلاس تھوڑے تھوڑے وقفے سے جاری رہا اور پھر کونسل میں ایک اور قرارداد پیش کی گئی جس میں کونسل کے اس وقت کے صدر مسٹر یارنگ کو کشمیر کے تنازعے کا تصفیہ کروانے کے لئے مصالحت کنندہ مقرر کرنے کی تجویز رکھی گئی اور انہیں یہ کام سونپا گیا کہ وہ کشمیر سے فوجوں کے انخلا کا طریقہ کار بھی طے کریں۔ اس قرارداد کے حق میں بھی گیارہ میں سے دس ووٹ آئے البتہ چونکہ روس غیر جانبدار رہا۔ اس لئے قرارداد منظور ہوگئی اور مسٹر یارنگ بھی اس تنازعے کو طے کروانے کے لئے کشمیر آئے اور طویل مذاکرات کے بعد ناکام ہوکر واپس لوٹ گئے۔

جموں کشمیر میں جنگ بندی کے بعد داخلی طور پر سیاست کا ایک نیا باب بھی شروع ہوچکا تھا۔ ہندوستان کی عملداری جن علاقوں پر تھی وہاں نیشنل کانفرنس کی حکومت تھی اور جو علاقہ پاکستان کی تحویل میں چلا گیا اس میں مسلم کانفرنس کی حکومت تھی۔ نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس اس ریاست کی دو بڑی سیاسی پارٹیاں تھیں اور آہستہ آہستہ ان

دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں میں پھوٹ پڑنے لگی۔ چنانچہ چوہدری غلام عباس نے لیاقت علی خان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ آزاد کشمیر میں سردار ابراہیم خان کی حکومت برطرف کردی جائے اور اس علاقے کے معاملات چوہدری صاحب کے سپرد کئے جائیں۔ سردار محمد ابراہیم خان کی برطرفی کے بعد چوہدری غلام عباس خود صدر نہیں بنے کیونکہ وہ آزاد کشمیر کے صدر کے عہدے کو اپنے شایان شان نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے میرپور کے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر علی احمد شاہ کو آزاد کشمیر کی حکومت کا صدر بنایا اور خود اس حکومت کے سپریم ہیڈ بن گئے۔ مسلم کانفرنس کے لیڈروں میں پھوٹ بڑھتی چلی گئی۔ سردار ابراہیم چوہدری غلام عباس کے خلاف برسر پیکار تھے اور مسلم کانفرنس کے جنرل سیکریٹری آغا شوکت علی اور مسلم کانفرنس کے بانیوں میں سے ایک اہم رہنما میرواعظ مولانا محمد یوسف جو اس وقت وزیر تعلیم تھے، نے پارٹی اور حکومت دونوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اختلافات زور پکڑتے گئے اور ان کے سبب بعض کشمیری رہنماؤں کی روزی کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ مولوی عبدالرحیم، میرواعظ محمد عبداللہ شاہ شوپیانی، پیر ضیاء الدین بڈگامی اور محمد یوسف قریشی کے لئے مستقل ماہانہ تنخواہیں مقرر کرکے چوہدری غلام عباس نے انہیں اپنے ساتھ ملالیا لیکن اس کے باوجود چوہدری صاحب کو اطمینان اور چین میسر نہیں آسکا کیونکہ پاکستان کے وزیر برائے امور کشمیر نواب مشتاق احمد گورمانی ان کے خلاف تھے۔ گورمانی صاحب کا کہنا تھا کہ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں اسی طرح ایک ملک کے دو قائد ملت نہیں ہو سکتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ قائد ملت لیاقت علی خان کی موجودگی میں غلام عباس کی حیثیت ہی کیا ہے کہ وہ قائد ملت بنا پھرتا ہے۔ لیکن جب خان لیاقت علی خان کے قتل اور خواجہ ناظم الدین کے پاکستان کا وزیر اعظم بننے پر نواب مشتاق احمد گورمانی ملک کے مرکزی وزیر داخلہ بنائے گئے تو انہوں نے صرف چار ماہ کی مدت کے اندر اندر چوہدری غلام عباس کی سبکدوشی کا انتظام کرلیا اور میرواعظ مولانا محمد یوسف کو آزاد کشمیر کی عبوری حکومت کا صدر بنا دیا گیا۔ میرواعظ صاحب خود امور حکومت سے چونکہ بالکل ناواقف تھے اس لئے انہوں نے اپنے چچازاد بھائی مولوی محمد نورالدین، محمد یوسف شیدا اور مولوی عبدالرحیم کو اپنا مشیر مقرر کیا

میرواعظ صاحب کو دھوکہ دیا گیا

مسٹر محمد یوسف شیدا اس سے پہلے چوہدری غلام عباس سپریم ہیڈ آف آزاد کشمیر گورنمنٹ کے پرسنل سیکریٹری اور مولوی عبدالرحیم چوہدری صاحب کے مشیر خاص رہ چکے تھے۔ میرواعظ صاحب کی عبوری حکومت صرف

گیارہ مہینے چل سکی کیونکہ پاکستان کی وزارت امور کشمیر کے سیکرٹریوں اور میر واعظ صاحب کے درمیان بد اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے انہوں نے کراچی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ میر واعظ صاحب کی جگہ آزاد کشمیر ہی کے کسی باشندے کو صدر بنایا جائے۔ ان ہی دنوں آزاد کشمیر کا سالانہ بجٹ بنا کر امور کشمیر کے جوائنٹ سیکرٹری جن کا دفتر راولپنڈی میں ہوا کرتا تھا کو منظوری کے لئے بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ جوائنٹ سیکرٹری نے میر واعظ صاحب کو راولپنڈی آ کر اس بجٹ پر بات چیت کرنے کے لئے کہا۔ میر واعظ صاحب راولپنڈی گئے جہاں حکومت پاکستان کے جوائنٹ سیکرٹری برائے امور کشمیر نے انہیں ایک متبادل بجٹ کا مسودہ پیش کیا اور انہیں بتایا کہ پاکستان کے اہلکاروں نے جو بجٹ تیار کیا ہے اس میں آزاد کشمیر کی ترقی کے لئے زیادہ امدادی رقومات منظور کی جا رہی ہیں۔ میر واعظ صاحب نے گفت و شنید کے دوران تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اس بات سے اتفاق کر لیا کہ حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر جو بجٹ تجویز یا آزاد کشمیر کے لئے تیار کرے گی، وہ میر واعظ صاحب کیلئے قابل قبول ہوگی۔ چنانچہ اگلے دن جوائنٹ سیکرٹری نے میر واعظ صاحب کی قیام گاہ اصغر مال روڈ راولپنڈی میں ٹیلیفون پر میر واعظ صاحب سے استدعا کی کہ وہ شہزادہ کوٹھی جہاں وزارت امور کشمیر کے دفاتر تھے، تشریف لائیں تاکہ انہیں آزاد کشمیر کے نئے بجٹ کا گوشوارہ پیش کیا جا سکے۔ میر واعظ صاحب بعد دوپہر وزارت امور کشمیر کے سیکرٹریٹ میں گئے جہاں جوائنٹ سیکرٹری نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں اپنے کمرے میں لے جا کر آزاد کشمیر کے نئے بجٹ کا انگریزی مسودہ دکھایا اور اس کے ساتھ ہی اس گوشوارے کی کچھ اہم باتیں پڑھ کر میر واعظ صاحب کو اطمینان دلا دیا۔ اس کے بعد جوائنٹ سیکرٹری نے میر واعظ صاحب کو بتایا کہ اگر وہ اسے قبول کرتے ہیں تو وہ اس کی منظوری دیدیں تاکہ اسے وزارت خزانہ سے منظوری حاصل کرنے کے لئے کراچی بھیجا جا سکے۔ میر واعظ صاحب نے جہاں جہاں جوائنٹ سیکرٹری نے انہیں بتایا کہ دستخط کرنا مطلوب ہیں، بڑی سادگی کے ساتھ دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اسی روز شام کو آزاد کشمیر ریڈیو سے اعلان کیا گیا کہ آزاد کشمیر کے نگران صدر میر واعظ محمد یوسف ________ صدارت سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ آزاد کشمیر ریڈیو کے اس اعلان سے خود میر واعظ صاحب بھی ششدر ہو کر رہ گئے، کیونکہ انہوں نے کوئی استعفیٰ وغیرہ نہیں دیا تھا۔ چنانچہ جب ان کے سیکرٹری میر ہدایت اللہ نے اس بارے میں ریڈیو سٹیشن اور امور کشمیر کے جوائنٹ سیکرٹری سے ٹیلیفون پر بات چیت کی تو انہیں بتایا گیا کہ میر واعظ صاحب واقعی استعفیٰ دے چکے

ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انگریزی میں ٹائپ کئے گئے بجٹ کے جس مسودے پر میر واعظ صاحب سے دستخط لئے گئے تھے اس میں ان کا استعفیٰ بھی شامل تھا۔ اور چونکہ میر واعظ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے، اس لئے انہوں نے جوائنٹ سیکرٹری کی گفتگو پر اعتبار کر کے اس پر بھی دستخط کئے تھے۔ اب آزاد کشمیر حکومت کی باگ ڈور ایک ریٹائرڈ صوبیدار میجر (جسے اعزازی طور پر کرنل بنایا گیا تھا) شیر احمد خان کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ آزاد کشمیر میں سیاسی قیادت کی یہ جو تبدیلی تھی اور سرحد کی دوسری جانب جہاں نیشنل کانفرنس کی حکومت تھی، حالات اس سے بھی زیادہ مایوس کن تھے۔ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں میں باہمی اختلافات وسیع ہوتے جا رہے تھے اور نئی دہلی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان بھی اعتماد کم ہوتا جا رہا تھا۔ اندریں اندرونی صورت حال یہ تھی اور بظاہر کشمیر میں غیر یقینی پر قابو پانے کے لئے ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام کا فیصلہ بھی کیا گیا تھا۔ اس اسمبلی کے لئے اگرچہ یہ طے پایا کہ یہ بالغ حق رائے دہی کے اصول پر منتخب کی جائے گی لیکن جب اس کے لئے انتخابات کا مرحلہ آیا تو حکمران پارٹی جس کی قیادت شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ میں تھی، نے وادی میں کسی ایک نشست کے لئے بھی کسی مخالف امیدوار کو کھڑا نہیں ہونے دیا اور وادی کی بیالیس سیٹوں پر نیشنل کانفرنس بلا مقابلہ قابض ہو گئی۔ اس اسمبلی کا قیام ۱۹۵۱ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کا ایوان ایک سو ممبروں پر مشتمل تجویز کیا گیا تھا جس کی پچیس نشستیں جنہیں آزاد کشمیر کے لئے مخصوص کیا گیا تھا، خالی رکھی گئی تھیں۔ آئین ساز اسمبلی کے اغراض و مقاصد کے بارے میں بھی نئی دہلی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان بنیادی اختلافات تھے۔ اس کے قیام پر جب شیخ محمد عبداللہ نے یہ اعلان کیا کہ ریاست کی یہ آئین ساز اسمبلی جموں کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہوگی تو پاکستان نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے سیکورٹی کونسل کی توجہ اس طرف مبذول کروائی جس پر ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ کے ایوان میں یہ واشگاف اعلان کیا کہ جموں کشمیر میں بنائی گئی آئین ساز اسمبلی کسی بھی طرح اس ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں اور حکومت ہند اقوام متحدہ کی ان قراردادوں کی پابند ہے جن میں کشمیر کا سوال رائے شماری کے ذریعے حل کرنا طے پایا ہے۔ ہندوستان کے وزیر اعظم نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر جموں کشمیر میں بنائی گئی آئین ساز اسمبلی کشمیر کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے بھی تو حکومت ہند اس فیصلے کی پابند نہیں ہوگی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم کی طرف سے اس واضح اور واشگاف اعلان کے بعد ریاست کی آئین ساز اسمبلی میں

بنیادی اصولوں (BASIC PRINCIPLES) سے متعلق رپورٹ ـــــ پر شیخ محمد عبداللہ نے جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ریاست کے مستقبل کے بارے میں جو تین متبادل راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سے جہاں تک پاکستان کے ساتھ الحاق کا تعلق ہے۔ اس کا بالکل سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جہاں تک خود مختاری کا راستہ ہے ایسا ہو کہ کشمیر کی جغرافیائی اور سیاسی پوزیشن کے پیش نظر بالکل ممکن نہیں۔ اس لئے ہمارے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم نے ہندوستان کے ساتھ کئے گئے الحاق کی توثیق کر کے اسے دائمی شکل دے دے۔ اس آئین ساز اسمبلی نے جہاں جموں کشمیر میں ڈوگرہ خاندان کی موروثی حکومت کے خاتمے اور ۱۹۴۹ء میں نافذ کی گئی زرعی اصلاحات کے فیصلوں کی توثیق کر دی وہاں بعد میں جموں کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے اس فیصلے کی بھی توثیق کر دی جو نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے ۱۹۴۷ء میں کیا تھا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان تمام تر کارروائیوں کے باوجود نئی دہلی کو کشمیری قیادت کی طرف سے پورا اطمینان حاصل نہیں تھا اور وہ کشمیر میں زیادہ سے زیادہ انتظامی، سیاسی اور مالی اختیارات حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔ خود نیشنل کانفرنس کی قیادت بھی بے اطمینانی اور پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

چنانچہ ۱۹۵۲ء کے شروع میں خواجہ غلام محی الدین قرہ نے علانیہ نیشنل کانفرنس قیادت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دوسرے قریبی رفقاء کے درمیان بھی اختلافات شدید ہوتے گئے اور کشمیر میں مسلسل سیاسی غیر یقینی اور شکوک کے زیر سایہ رہنے سے نیشنل کانفرنس عوام میں اپنی تمام تر ساکھ کھو بیٹھی تھی۔ خود شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی نظریات بھی تبدیل ہو رہے تھے جس کا پہلا اشارہ واضح طور پر اس وقت سامنے آیا جب شیخ محمد عبداللہ نے موسم بہار کی آمد کے سلسلے میں سرینگر میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا: ـــــ "کشمیر ایک خوبصورت باغ ہے اور ساری دنیا اس کی خوبصورتی کو پسند کرتی ہے۔ کشمیری عوام چاہتے ہیں کہ یہ خوبصورت باغ اس برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نفرت اور دشمنی کی بجائے دوستی اور محبت کا پل بن جائے" ـــــ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیشنل کانفرنس میں پھوٹ بڑھتی چلی گئی اور نئی دہلی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان اختلافات بھی نمایاں ہوتے گئے چنانچہ وزیر اعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۵۳ء کے موسم بہار کی ابتدا میں سری نگر آئے اور انہوں نے کشمیری قیادت اور نئی دہلی کے درمیان اختلافات کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ دوسری طرف ریاست کا ایک

نیا رخ سامنے آیا جب کہ شیخ محمد عبداللہ کی تقریر سننے کے لئے لوگوں کے بڑے بڑے مجمعے دیکھے گئے حالانکہ اس سے قبل لوگ شیخ محمد عبداللہ کی تقریر سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے جلسوں میں تنخواہ دار سرکاری ملازموں اور دو چار نیشنل کانفرنس کارکنوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اسی دوران شیخ محمد عبداللہ نے رنبیر سنگھ پورہ، اکھنور اور جانیا میں بڑی اہم تقریریں کیں۔ اپنی ان تقریروں میں شیخ محمد عبداللہ نے نہایت واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ ـــــ "چونکہ ہندوستان اور پاکستان اس بات پر متفق ہو چکے ہیں اور یہ اقرار کر چکے ہیں کہ کشمیری عوام اپنے مستقبل اور اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے خود مجاز ہیں اس لئے اب وقت آ گیا ہے کہ انہیں یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں۔ کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں"۔ ان کی ان تقریروں سے نہ صرف کشمیر بلکہ سارے ہندوستان اور پاکستان میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اس ہلچل کا زیادہ تر سبب یہ تھا کہ شیخ صاحب اس وقت تک کشمیر میں رائے شماری کرانے کی زبردست مخالفت کرتے چلے آئے تھے اور انہوں نے اپنی سینکڑوں تقریروں، بے شمار بیانات، اعلانات یہاں تک کہ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں بھی یہ اعلان کیا تھا کہ کشمیری عوام نے اپنی تقدیر ہمیشہ کے لئے ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر دی ہے"۔ اب اس فیصلے پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی۔ اسی اثناء میں خواجہ غلام محی الدین قرہ نے سہیارڈ لوکدل میں ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ اس جلسے کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو رہی تھیں کہ اس میں قرہ صاحب پاکستان کا نعرہ لگائیں گے اور اس میں قرہ صاحب کشمیر کی خود مختاری کا مطالبہ کریں گے۔ چنانچہ اس جلسے میں جوق در جوق لوگ شامل ہو گئے اور جب اس کی اطلاع وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کو ملی تو وہ اس جلسے کی کارروائی بذات خود سننے کے لئے پیچھے سے لوکدل کے جا پہنچے اور انہوں نے خواجہ غلام محی الدین قرہ کی تقریر کا ایک ایک لفظ خود سنا۔ جلسے میں قرہ صاحب نے اپنی تقریر کے اختتام پر جب لوگوں سے یہ کہا ـــــ "میں کشمیری عوام کے فطری رجحان کی ترجمانی کرنے کے لئے میدان میں آیا ہوں۔ اس لئے آپ واضح طور پر بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟" ـــــ تو اس پر مجمع نے یک زبان ہو کر کہا ـــــ "پاکستان" ـــــ اسکے تین ایک روز بعد ہی خواجہ غلام محی الدین قرہ کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

۷



ادھر پاکستان میں اپنی سیاسی حکمتِ عملی میں ناکامیوں کے بعد اور اس احساس کے تحت بھی کہ اقوامِ متحدہ شاید ہی کشمیر میں اپنی قراردادوں پر عمل درآمد کرا سکے۔ وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کے طرزِ فکر میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جن سے یہ اندازہ لگایا جاتا تھا کہ لیاقت علی خان اینگلو امریکی بلاک کی بجائے ماسکو کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں اور اُنھوں نے اپنی دو ایک تقریروں میں برطانیہ کو بُری طرح نکتہ چینی کا ہدف بنایا جس سے اس خیال کو تقویت پہنچی کہ لیاقت علی خان اب اینگلو امریکی بلاک پر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہتے چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں جب وہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کے دورے پر نکلے تو اس دورے کے سلسلے میں وہ راولپنڈی بھی آئے جہاں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء بعد دوپہر چار بجے اُنھیں کمپنی باغ (جسے اب لیاقت گارڈن کہا جاتا ہے) میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ جلسہ گاہ میں سٹیج غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ اس سٹیج پر ڈائس کے عقب میں صرف ایک کرسی رکھی گئی تھی اور باقی سٹیج خالی رکھا گیا تھا۔ سٹیج پر مسلم لیگ کے کچھ عہدیدار فرش پر بیٹھے تھے۔ لیاقت علی خان مقررہ وقت پر جلسہ گاہ میں تشریف لائے جہاں ان کا پُرتپاک استقبال کیا گیا اور اُنھیں پھول مالائیں پہنائی گئیں——

میں اس سٹیج پر اپنی ٹانگیں نیچے کی طرف لٹکائے مائیک کے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ اور جب وہ سٹیج پر آئے اور وہاں رکھی گئی واحد کرسی پر بیٹھ گئے تو راولپنڈی مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد عمر نے مائیک پر آکر مختصر الفاظ میں اُن کا خیر مقدم کیا اور وزیر اعظم سے استدعا کی کہ وہ جلسے سے خطاب کریں۔ اس پر مسٹر لیاقت علی خان کھڑے ہو کر مائیک پر آئے ——

وہ اپنی تقریر کے آغاز میں بمشکل ——

"برادرانِ ملت" ——

کے الفاظ ادا کر پائے تھے کہ جلسہ گاہ کی طرف سے اُن پر فائر کیا گیا۔ گولی اُن کے سینے میں بائیں طرف جا لگی اور فوراً ہی بعد اُن پر دوسرا فائر بھی کیا گیا۔ جلسہ گاہ میں سناٹے کا عالم تھا۔ میں یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ لیاقت علی خان کو گولی ماری گئی ہے —— لیاقت علی خان —— برادرانِ ملت —— کہنے کے بعد خاموش ہو گئے اور جونہی میری نگاہیں مائیک کی طرف گئیں تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکھڑا رہے ہیں اور اُن کے سینے سے خون کے فوارے اُبل رہے ہیں —— عین اُسی وقت سٹیج کے عقب سے سٹین گنوں کی فائرنگ کی آواز سُنی گئی۔ یہ فائرنگ ہوا میں کی گئی تھی اور یہ اُس سکیورٹی سٹاف کی طرف سے کی گئی تھی جو وزیر اعظم کی آمد کے سلسلے میں سٹیج کے عقب میں متعین تھا۔ ان ڈرامائی اور ہیبت ناک واقعات نے جلسہ گاہ جس میں تقریباً ۲۰ ہزار لوگ تھے۔ میں سراسیمگی، بھگدڑ، افراتفری اور محشر کا سا عالم بپا کر دیا۔ لوگ افراتفری کے عالم میں بھاگ رہے تھے جیسے کہ اچانک قیامت آ گئی ہو۔ ایک دوسرے کو کچلتے اور دھکیلتے ہوئے سب بھاگ رہے تھے —— خود میں تقریباً حواس باختہ ہو چکا تھا۔ مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ میں کس حالت میں سٹیج سے گرا دیا گیا۔ اور میں نیم جان سا سٹیج کے نیچے خالی جگہ پر پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں خود کو سنبھالا تو مجھے محسوس ہوا کہ ایک سکوت سا طاری ہے۔ خوف و دہشت کے اسی عالم میں میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور سٹیج کے قریب بصد مشکل خود کو کھڑا کر لیا —— میرے سامنے عجیب منظر تھا۔ سٹیج کے بالکل سامنے پولیس کے کچھ سپاہی لاٹھیاں لئے ایک دائرہ سا بنائے کھڑے تھے۔ اور ان کے درمیان ایک لاش پڑی ہوئی تھی جس کا چہرہ تقریباً مسخ ہو چکا تھا —— یہ سعید اکبر کی لاش تھی جس نے پاکستان کے وزیر اعظم کو گولی ماری تھی۔ میں ساکت کھڑا اس جلسہ گاہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں ابھی چند منٹ قبل تقریباً ۲۰ ہزار لوگ تھے لیکن اب پولیس کی ایک گاڑی اُن کے

درمیان پڑی ایک لاش اور آس پاس ٹوپیوں، دوپٹوں، جوتوں، چپلوں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے چھوٹے چھوٹے سے انبار تھے۔ جو شاید بھگدڑ کے دوران لوگ وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

چنانچہ خود کو سنبھالنے کے بعد میں آہستہ آہستہ کمپنی باغ سے باہر آ گیا۔ اور جب میں سڑک پر آ گیا۔ تو لوگوں کے گروہ راولپنڈی صدر کی طرف رُخ کئے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ لیاقت علی خان کو زخمی حالت میں کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں لے جایا گیا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں بھی اسی جانب چل پڑا اور تقریباً ۸ بجے رات ہسپتال کے قریب پہنچا جہاں ہزاروں لوگ ہسپتال کے باہر انتظار کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے نواب مشتاق احمد گورمانی جو لیاقت علی خان کی کابینہ میں وزیر امور کشمیر تھے۔ ہسپتال سے باہر آئے۔ جب وہ ہسپتال کے پھاٹک پر پہنچے تو میں نے دیکھا اُن کے ہاتھ میں ایک سفید رومال تھا جس سے وہ اپنے آنسو پونچھ رہے تھے —— وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اپنی کار میں سوار ہو کر چلے گئے اور ہسپتال کے باہر لوگوں میں مایوسی اور تذبذب شدید ہو گیا۔ اور انہوں نے نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک فوجی ڈاکٹر ہسپتال کے پھاٹک پر آیا اور بڑے غمناک لہجے میں کہا —— "میرے بھائیو! ہم نے وزیر اعظم کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن ہم کامیاب نہ ہو سکے اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔" اس پر مجمعے نے بلند آواز میں "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھا اور مجمع افسردگی کے عالم میں آہستہ آہستہ بکھر گیا ——

بعد میں لیاقت علی خان کی میّت کو راولپنڈی کے سرکٹ ہاؤس پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تقریباً رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ جب میں سرکٹ ہاؤس پہنچا تو وہاں کچھ شہری اور سرکاری افسر سڑک پر تھے۔ دس یا پندرہ منٹ بعد خواجہ ناظم الدین جو پاکستان کے گورنر جنرل تھے اور کوہ مری کے قریب نتھیا گلی میں تعطیلات منانے گئے تھے اچانک اپنی موٹر کار میں سرکٹ ہاؤس کے گیٹ پر پہنچے۔ ان کی کار گیٹ کے اندر نہیں گئی۔ وہ سڑک پر ہی کار سے باہر آ گئے۔ خواجہ ناظم الدین رو رہے تھے اور اسی حالت میں سرکٹ ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ اُن کی آمد کے تقریباً نصف گھنٹے بعد فوجی افسر لیاقت علی خان کی میّت جو پاکستان کے قومی پرچم میں لپٹی ہوئی تھی ایک سٹریچر پر باہر لائے اور اُسے فوجی گاڑی میں رکھ کر ہوائی اڈے پر لے گئے جہاں سے اُن کی میّت کو ایک خصوصی طیارے میں کراچی پہنچا دیا گیا۔ اور تجہیز و تکفین کے بعد

اُسے پُرزہ خاک کیا گیا۔

بعد کے واقعات، حالات اور دُوسری تبدیلیوں کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لیاقت علی خان کا قتل ایک منصوبے کے تحت ہوا اور ہو سکتا ہے کہ یہ قتل اُسی منصوبے کی ایک کڑی تھا جس کے تحت ۱۹۴۵ء میں مصر کے وزیرِ اعظم مسٹر ماہر پاشا، ۱۹۴۸ء میں مصر کے دوسرے وزیرِ اعظم مسٹر نقراشی پاشا اور ۱۹۵۱ء کے شروع میں ایران کے وزیرِ اعظم جنرل علی رزم آرا اور پھر مشرقِ اُردن کے حکمران شاہ عبداللہ کو پُراسرار طور پر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا

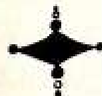
سعید اکبر ــــ جس نے پاکستان کے وزیرِ اعظم کو قتل کیا تھا، اصل میں ایک افغان باشندہ تھا اور [illegible] قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ میں نے اس کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں اُن کے مطابق سعید اکبر وہ ایک مرتبہ افغانستان میں حکومت کا تختہ اُلٹنے اور زمامِ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اپنی اس کوشش میں ناکامی کے بعد وہ فرار ہو کر برطانوی ہند میں آ گیا تھا اور برطانیہ نے اُسے سیاسی پناہ دی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کے لئے ماہانہ الاؤنس بھی مقرر کر دیا تھا ــــ ۱۹۴۷ء کے بعد برصغیر میں برطانوی اقتدار کے خاتمے پر سعید اکبر چونکہ پاکستانی علاقے میں تھا اس لئے معاہدے کے مطابق پاکستان نے اُس کا وظیفہ برقرار رکھا تھا جو ۱۹۵۱ء میں گیارہ سو پچاس روپے ماہوار تھا۔ البتہ سعید اکبر کی نقل و حرکت پر کچھ پابندیاں تھیں اور وہ ایبٹ آباد جہاں وہ رہائش پذیر تھا سے باہر جاتے وقت متعلقہ پولیس تھانے کو اس کی اطلاع دینے کا پابند تھا ــــ سعید اکبر نے ۱۲ اکتوبر کو متعلقہ تھانے کو اطلاع دی کہ وہ چند روز کے لئے مری جا رہا ہے جب وہ ایبٹ آباد سے مری گیا تو اس کے ساتھ اُس کا بھتیجا اور بیٹا بھی تھا۔ مری میں دو دن قیام کے بعد وہ پولیس کو اطلاع دیئے بغیر راولپنڈی گیا جہاں وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ غالباً اُسے معلوم تھا کہ لیاقت علی خان اگلے دن راولپنڈی آ رہے ہیں۔ چنانچہ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مطابق سعید اکبر ۱۶ اکتوبر کو تقریباً ۲ بجے دوپہر اپنے بیٹے کو ہوٹل میں چھوڑ کر کمپنی باغ کے جلسے میں گیا۔ خود پولیس کے بیان کے مطابق اُس کے پاس برطانوی ساخت کا ایک ریوالور تھا۔ سعید اکبر جلسہ گاہ میں پہلی صف میں جا بیٹھا۔ وہ ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے تھا جو پٹھان لوگ عام طور پر اوڑھے رہتے ہیں اور اُس نے عین اُس وقت جب لیاقت علی خان مائیک پر نمودار ہوئے اور جلسہ گاہ میں موجود تمام لوگوں کی نگاہیں مائیک پر جا لگیں اپنے ریوالور سے یکے بعد دیگرے فائر کر کے لیاقت علی خان کو قتل کر دیا۔ جھگڑے کے دوران راولپنڈی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

پولیس نجف خان جو سٹیج کے قریب کھڑا تھا، نے لیاقت علی خان پر فائرنگ کے فوراً بعد اپنا ریوالور نکالا اور سعید اکبر کے سر پر گولی ماری۔ اور وہ وہیں گر گیا۔ لوگوں نے بھی اُسے مارا۔ پولیس نے اس پر لاٹھیاں برسائیں جس سے اس کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا۔ اور لباس چیتھڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ نجف خان نے لیاقت علی خان کے قاتل کو یقیناً ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہلاک کر دیا۔ تاکہ اس سازش پر سے پردہ اُٹھنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ جو لیاقت علی خان کے قتل کے لئے کی گئی تھی۔ اور اس کا ثبوت اُس تعجب خیز اقدام سے ملا جس کے مطابق لیاقت علی خان کے قتل کے کچھ ہی عرصے بعد گورنر جنرل ملک غلام محمد کی خصوصی سفارش پر ڈی ایس پی نجف خان کو ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس بنا دیا گیا۔

اس پُراسرار اور معنی خیز قتل کے بعد پاکستان میں ڈرامائی تبدیلیاں شروع ہو گئیں۔ خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم اور ملک غلام محمد گورنر جنرل بنائے گئے۔ نواب مشتاق احمد گورمانی جو وزیرِ امورِ کشمیر تھے مرکزی وزیرِ داخلہ بنائے گئے۔ گورنر جنرل کے عہدہ کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے ملک غلام محمد نے نہایت پُراسرار طور پر اور بغیر کسی وجہ کے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ مسٹر محمد علی بوگرہ جو ان دنوں واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر تھے کو پاکستان کا نیا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ ملک غلام محمد کا یہ اقدام اس بات کی واضح دلیل تھی کہ لیاقت علی خان کے قتل میں اینگلو امریکی بلاک کا خفیہ ہاتھ کار فرما تھا۔

چونکہ مسٹر گورمانی اور چوہدری غلام عباس کے درمیان تعلقات بے حد خراب تھے۔ اس لئے لیاقت علی خان کے قتل کے فوراً بعد مسٹر گورمانی نے چوہدری غلام عباس کی آزاد کشمیر میں حکومت کو برطرف کرانے کا انتظام کر لیا۔ اور میر واعظ مولانا محمد یوسف کو آزاد کشمیر کی حکومت کا نگران صدر بنا دیا ــــ لیاقت علی خان کا قتل نہ صرف پاکستان میں مسلسل سیاسی عدم استحکام کا سبب بن گیا بلکہ اس کا کشمیر کے مسئلے پر بھی بہت بُرا اثر پڑا۔ اور خود آزاد کشمیر میں بھی ــــ [illegible] کے مطابق ایک کے بعد دُوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اعلان ہوتا چلا گیا۔ میر واعظ کی حکومت صرف گیارہ ماہ تک رہی اور اُسے بھی برطرف کر دیا گیا۔ اُن کی جگہ کرنل شیر احمد خان کو صدر بنایا گیا۔ اور جب چوہدری محمد علی پاکستان کے وزیرِ اعظم بنے۔ تو اُنہوں نے چوہدری غلام عباس کے مشورے پر شیر احمد کی حکومت کو برطرف کر کے سردار قیوم کو صدر بنا دیا۔ چوہدری محمد علی کے بعد جب مسٹر حسین شہید سہروردی پاکستان کے وزیرِ اعظم بنے۔ تو اُنہوں نے سردار قیوم کی حکومت کو برطرف کر کے مسٹر کے ایچ خورشید کو صدر بنا دیا۔ جب فیلڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان کی حکومت سنبھالی تو اُنہوں نے خورشید کی حکومت برطرف کر کے پھر سردار قیوم کو صدر

بنا دیا۔ اور جب جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ خان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تو انہوں نے سردار قیوم کو برطرف کر کے حکومت سردار محمد ابراہیم کے سپرد کر دی۔ اور جب جنرل ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تو انہوں نے بھی سردار ابراہیم کو چلتا کر دیا اور آزاد کشمیر کے امور بریگیڈیر محمد حیات خان کے حوالے کر دیئے۔





۸

۱۹۵۳ء کا خونی انقلاب

کشمیر میں خواجہ غلام محی الدین قرہ کی گرفتاری کے چند ہفتے بعد جب کہ شیخ محمد عبداللہ کی کابینہ میں زبردست پھوٹ پڑ چکی تھی، انہوں نے وزیرِ اعظم کی حیثیت میں اپنے وزیرِ صحت پنڈت شیام لال صراف سے استعفیٰ طلب کیا لیکن مسٹر صراف نے جو شیخ محمد عبداللہ کے مخالف نیشنل کانفرنس گروپ سے تعلق رکھتے تھے ۔ استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا جس سے کابینہ میں بحران کی کیفیت پیدا ہو گئی چنانچہ کابینہ کے اس بحران پر غور کرنے کے لئے وزیرِ اعظم شیخ محمد عبداللہ نے ریاست کے حکمران اعلیٰ یوراج ڈاکٹر کرن سنگھ سے ملاقات کی اور ڈاکٹر کرن سنگھ نے انہیں بتایا کہ "آئینی پوزیشن یہ ہے کہ آپ مستعفی ہو کر کابینہ کو نئے سرے سے تشکیل دیں اور اس میں پنڈت شیام لال صراف کو نہ لیں"۔ اس پر شیخ محمد عبداللہ برافروختہ ہو گئے اور ڈاکٹر کرن سنگھ سے کہا "آپ کا انجام بھی وہی ہوگا جو مہاراجہ ہری سنگھ کا ہوا"۔ اس کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے اعلیٰ قانونی مشیروں جن میں جسٹس شاہ تیمری اور مرزا محمد افضل بیگ بھی شامل تھے ، کے ساتھ صلاح مشورہ کیا ۔ اسی بحران کی سی حالت میں وزیرِ اعظم شیخ محمد عبداللہ سری نگر سے چند دن آرام کرنے کی غرض سے گلمرگ گئے ۔ بعض اعلیٰ افسر بھی ان کے

ہمراہ تھے ۔ ان کی عدم موجودگی میں نیشنل کانفرنس کے بعض سرکردہ لیڈر اور کابینہ کے کچھ وزراء نے ڈاکٹر کرن سنگھ کے ساتھ ملاقات کی ۔ مذاکرات کے دوران یہ طے پایا کہ شیخ محمد عبداللہ کی وزارت کو برطرف کر کے اور انہیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا جائے اور ان کی جگہ نائب وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کو وزیرِ اعظم مقرر کیا جائے ۔ اس سلسلے میں نئی دہلی کے ساتھ صلاح مشورہ کیا گیا اور امکانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے مسلح فوج کو چوکنا رکھا گیا ۔ تمام احتیاطی اقدامات کرنے کے بعد مسٹر لچھمن داس ٹھاکر ایس پی سری نگر اور پولیس کے کچھ افسروں کو شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کے احکامات لے کر گلمرگ جانے کے لئے کہا گیا ۔ گلمرگ میں شیخ محمد عبداللہ کی قیام گاہ کے آس پاس اور گرد و نواح میں مسلح پولیس کی بھاری تعداد متعین کر دی گئی اور وزیرِ اعظم کی برطرفی اور ان کی گرفتاری کے احکامات انہیں پیش کئے گئے ۔ انہیں ۹ ۔ اگست ۱۹۵۳ء کی صبح کا سورج طلوع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے گلمرگ سے ایک کار میں بٹھا کر سیدھا کد سپنچ لایا گیا جو سری نگر جموں شاہراہ کے ۱۹۱ ویں کلومیٹر پر واقع ہے اور اس طرح ۹ ۔ اگست ۱۹۵۳ء کا انقلاب رونما ہوا ۔ ان کی گرفتاری سے سارے کشمیر میں غم و غصہ اور احتجاج کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ سری نگر اور وادی کے تمام قصبوں میں جگہ جگہ مسلح پولیس کا زبردست پہرہ بٹھا دیا گیا تھا ۔ سری نگر کے علاوہ کئی مقامات پر احتجاج کرنے والے مظاہرین پر فائرنگ سے ان گنت لوگ مارے گئے ۔ گیارہ دن تک ساری وادی میں مکمل ہڑتال رہی ۔ شیخ محمد عبداللہ کے تمام تر حامیوں جن میں بہت سے اعلیٰ سرکاری افسر اکثر ممبرانِ اسمبلی اور وزیر بھی شامل تھے ، کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا ۔

(ان میں سے دو ایک کے سوا باقی تمام سرکاری افسروں اور تقریباً سبھی ممبرانِ اسمبلی نے جب نئی حکومت کی وفاداری کا یقین دلایا تو ان سب کو چند ہفتوں کے اندر رہا کر دیا گیا ۔)

شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی ، گرفتاری اور کشمیر میں وسیع پیمانے پر ہنگامی ٹینشن کا پاکستان میں بڑا شدید ردِ عمل ہوا ۔ اس معاملے پر غور کرنے کے لئے پاکستان کے اس وقت کے وزیرِ اعظم مسٹر محمد علی بوگرہ نے آزاد کشمیر کے لیڈروں کو کراچی طلب کیا تاکہ ان کے صلاح مشورے کے بعد کوئی اقدام کیا جا سکے ۔ کراچی میں وزیرِ اعظم پاکستان ، ان کی کابینہ کے بعض رفقاء چوہدری غلام عباس ، میرواعظ مولوی محمد یوسف ، سردار محمد ابراہیم خان اور آزاد کشمیر کے

صدر شیر احمد خان کے درمیان کانفرنس ہوئی جس میں چوہدری غلام عباس نے یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر میں مسلح جنگ شروع کی جائے اور اس مقصد کے لئے غیر فوجی کے پانچ دس ہزار تربیت یافتہ سپاہی ٹیٹوال کرگل اور اوڑی کے راستے کشمیر میں داخل ہو جائیں تاکہ ہندوستان کو کشمیر کا تصفیہ کرنے پر مجبور کیا جا سکے لیکن بیگ صاحب اور پاکستان کے دوسرے لیڈروں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور سیاسی لیڈروں کو بتایا کہ حکومت ہند اس مسئلے پر پاکستان سے بات چیت کرنے کے لئے آمادہ ہے اور اس نے وزیر اعظم پاکستان کو دہلی آنے کی دعوت بھی دی ہے اور وزیر اعظم اگلے چند دنوں میں اس مسئلے پر بات چیت کرنے دہلی جا رہے ہیں۔ اس پر چوہدری غلام عباس کانفرنس سے اٹھ کر چلے گئے جبکہ دوسرے لیڈروں یعنی میرواعظ مولانا محمد یوسف صاحب، سردار ابراہیم اور شیر احمد خان نے حکومت ہند کے ساتھ بات چیت کی تجویز سے اتفاق کر لیا۔ چوہدری صاحب حکومت پاکستان کو کچھ بتائے بغیر کراچی سے واپس روانہ ہو گئے اور جب حکام کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے حکومت پنجاب کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات دیں۔ چنانچہ جب چوہدری صاحب لاہور پہنچے تو لاہور کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے انہیں ایک حکم نامہ پیش کیا جس کے ذریعے چوہدری غلام عباس پر یہ پابندی لگا دی گئی تھی کہ وہ کشمیر کے بارے میں نہ تو کوئی بیان دے سکتے ہیں اور نہ کسی پبلک جلسے میں کوئی تقریر کر سکتے ہیں۔ چوہدری غلام عباس نے اس حکم کی پابندی کا وعدہ کر کے جان چھڑوائی اور لاہور سے سیدھے سیالکوٹ چلے گئے۔ ادھر وزیر اعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی بوگرہ کشمیر پر بات چیت کرنے کے لئے نئی دہلی آئے جہاں دونوں وزرائے اعظم کے درمیان تین روز تک بات چیت ہوتی رہی۔ دونوں وزرائے اعظم کے درمیان بات چیت کے بعد ایک مشترکہ اعلان جاری کیا گیا جس میں دونوں ملکوں نے کشمیر کے تنازعے کو ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے حل کرنے پر اتفاق رائے ظاہر کیا۔ دونوں وزرائے اعظم کے اس واشگاف اعلان کے باوجود کشمیر میں اس بات کے بالکل کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے کہ اس تنازعے کا مستقبل قریب میں کوئی حل نکلنے والا ہے۔

بخشی غلام محمد کی سربراہی میں بنائی گئی حکومت کو حکومت ہند کی طرف سے صحیح چلانے پر روپیہ پیسہ فراہم کر دیا گیا تاکہ وہ رائے عامہ کو ہندوستان کے حق میں ہموار کر سکے۔ بخشی غلام محمد اگرچہ معمولی

پڑھے لکھے تھے لیکن ان میں بہت سی ایسی صلاحیتیں موجود تھیں جو بہت کم سیاسی آقاؤں میں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے کشمیر میں ایک نئی فضا پیدا کرنے کے لئے اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ جسے پیسے سے خریدا جا سکتا تھا، اُسے پیسہ دے کر خریدا، جسے عہدے سے خریدا جا سکتا تھا اُسے عہدہ دے کر خریدا گیا اور جسے وہ کسی بھی قیمت پر پسند نہیں کرتے تھے اُسے انہوں نے جیل میں بند کر دیا۔ ساری وادی میں خوف و دہشت اور جبر و استبداد کے سائے محیط کر دیئے گئے اور اس خطے کو ایک پولیس سٹیٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ جاسوسوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا۔ اور مار دھاڑ کے لئے پیس بریگیڈ (PEACE BRIGADE) نامی سپیشل پولیس کی تنظیم کو وسیع اختیارات دیئے گئے۔ قانون کی عملداری برائے نام ہو کر رہ گئی۔ پولیس جہاں اور جس شخص کو چاہتی بلا پوچھے گرفتار کر لیتی تھی۔ عدالتیں پولیس افسروں کے ماتحت ہو کر رہ گئیں جس کے نتیجے میں ساری انسانی آبادی سہم کر رہ گئی۔ جاسوسوں کا جال نہ صرف شہری اور دیہاتی آبادی تک پھیلایا گیا بلکہ سیاسی قیدیوں کی نگرانی کے لئے بھی ایسے جاسوس پیدا کر لیے گئے جنہیں بظاہر شیخ محمد عبداللہ کا حامی ہونے کی بنا پر جیل بھیج دیا جاتا تھا لیکن اصل میں ان کے سپرد جیل کے اندر سیاسی لیڈروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا کام تھا۔ ۱۹۵۵ء میں ان جاسوسوں کے ذریعے جب وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر وہ مرزا محمد افضل بیگ کو رہا کر دیں گے تو اس سے انہیں سیاسی فائدہ حاصل ہوگا۔ تو انہوں نے اگست ۱۹۵۵ء میں مرزا محمد افضل بیگ کو جیل سے رہا کر دیا۔ چنانچہ مرزا محمد افضل بیگ نے اپنی رہائی سے پہلے جیل میں اپنے رفقاء کے مشورے کئے اور رہائی کے بعد جیل سے باہر اپنے رفقاء سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے قیام کا اعلان کر دیا۔ بخشی غلام محمد نے بیگ صاحب کے اس اعلان کو اپنی کامیابی اور اپنی سیاسی پوزیشن کے مستحکم ہونے سے تعبیر کیا کیونکہ نئی دہلی میں ایک با اثر سیاسی حلقہ اور خود وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے تھے کہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھی ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ جو بیگ صاحب کی طرف سے رائے شماری کا مطالبہ منوانے کے لئے ایک باقاعدہ تنظیم کا قیام بخشی غلام محمد کی تمناؤں کے عین مطابق تھا۔ اپنا یہ مقصد پورا کر لینے کے چند ہفتے بعد مرزا محمد افضل بیگ کو دوبارہ گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ان کے جیل چلے جانے کے بعد محاذ کے ایک نائب صدر مسٹر عبدالغنی گونی جن کا

جموں کے ضلع ڈوڈہ سے تعلق ہے تو اس کا قائم مقام صدر بنا دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مسٹر گونی کو بھی گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا اور بعد میں جیل کے اندر ہی اپنے آدمیوں کے ذریعے بخشی غلام محمد نے مسٹر گونی کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور انہیں بھی کچھ وقت کے لئے جیل کے اندر کچھ خصوصی فرائض سونپے گئے جن کی بجا آوری کے بعد وہ رہا ہوگئے اور رہائی کے چند ہفتے بعد باقاعدہ اس نیشنل کانفرنس میں شامل ہوگئے جس کے سربراہ بخشی غلام محمد تھے۔ مسٹر گونی کی جگہ سرینگر کے ایک سرکردہ تاجر منشی محمد اسحاق کو محاذ کا قائم مقام صدر بنایا گیا۔ بخشی غلام محمد بیک وقت تین محاذوں پر بڑی خوش اسلوبی سے کام کرتے رہے۔ ان کے لئے ایک محاذ نئی دہلی میں تھا۔ جہاں انہوں نے روپیہ پیسہ، تحفے تحائف اور دوسرے تمام ذریعے استعمال کرکے کانگریسی لیڈروں جن میں زیادہ تر بااثر ممبران پارلیمنٹ وغیرہ شامل تھے، کی ایک مناسب لابی پیدا کرلی تھی جو نئی دہلی میں بخشی غلام محمد کے لئے کام کرتی تھی۔ دوسرا محاذ ریاست کے اندر سیاسی برتری حاصل کرنے کا تھا چنانچہ صرف دو تین برس کے عرصے میں انھوں نے ریاست میں تقریباً ساری سیاسی اور انتظامی مشینری پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ تیسرا محاذ جس پر وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو بڑی آسانی سے کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں، وہ کشمیر میں ہندوستان کے خلاف تحریک کا محاذ تھا۔ بخشی غلام محمد کا یہ پختہ یقین تھا کہ اگر ہندوستان کے خلاف جدوجہد کرنے والے عناصر کمزور پڑ گئے تو اس کے نتیجے میں ان کا اپنا اقتدار بھی کمزور پڑ سکتا ہے اور ختم ہوسکتا ہے اسی خیال کے پیش نظر وہ محاذ رائے شماری کے کچھ لوگوں اور خواجہ غلام محی الدین قرہ کی عدم موجودگی میں ان کی پولیٹیکل کانفرنس کے علاوہ بعض پاکستان نواز عناصر کی بڑی فراخدلی سے خفیہ طور پر مالی امداد کرتے رہے۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے یہ کہا "ان عناصر کا وجود بہت ضروری ہے ورنہ نئی دہلی والے ہم جیسوں کو گے کرتے سمجھ بیٹھیں گے"۔ دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو، شیخ محمد عبداللہ کی مسلسل نظربندی پر ناخوش و ناراض تھے۔ وہ بار بار وزیر اعظم بخشی غلام محمد سے بھی اس معاملے پر بات چیت کرتے رہے لیکن بخشی صاحب اس مسئلے کو ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کا ابھی موقعہ نہیں آیا۔ حالات نے اس وقت ایک نئی کروٹ لی جب ۱۹۵۶ء میں روس کے صدر مسٹر بلگانن اور وزیر اعظم خروشچیف ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے۔ روس کے صدر اور وزیر اعظم کشمیر بھی آئے اور نئی دہلی اور سرینگر میں دونوں لیڈروں نے اپنی تقریروں کے دوران جموں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کی کھلم کھلا حمایت

کا اعلان کردیا ۔۔۔ ایک بڑی طاقت کے کشمیر کے معاملے پر اس موقف نے کشمیر کو بڑی طاقتوں کی سرد جنگ کی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۹۵۶ء تک روس بظاہر کشمیر کے معاملے پر غیر جانبدارانہ پالیسی کا اظہار کرتا رہا تھا لیکن اس کے موقف میں اس تبدیلی سے اس مسئلے کے کسی پُرامن اور پائیدار تصفیے کے امکانات بڑی حد تک تاریک ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی چین نے کشمیر کے سوال پر پاکستان کی حمایت شروع کردی اور امریکہ اور برطانیہ بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے لئے زور دینے لگے۔ لیکن امریکہ، برطانیہ اور خود پاکستان کے اصرار اور کوششوں کے باوجود اقوام متحدہ کی قراردادیں محض کاغذی دستاویزیں بن گئیں اور ان پر عملدرآمد نہیں کیا جاسکا۔

جس طرح ۱۹۴۷ء کے بعد شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس کی قیادت کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش ہوتی رہی ٹھیک اسی طرح ۱۹۵۳ء کے بعد بھی وزیر اعظم بخشی غلام محمد کی سربراہی میں رہی سہی نیشنل کانفرنس کی قیادت کا اتحاد توڑنے کی کوششیں جاری رہیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں وزیر اعظم بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق کے درمیان سیاسی اختلافات علیحدگی کی حد تک پہنچ گئے چنانچہ ۱۹۵۷ء میں جب ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کے نفاذ کے بعد یہاں پہلی بار ریاستی اسمبلی کے لئے برائے نام انتخابات کروائے گئے۔ (یہ انتخابات اس بنا پر برائے نام تھے کیونکہ ان میں بھی وادی کی بیالیس سیٹوں میں سے چالیس پر نیشنل کانفرنس کے امیدوار بلامقابلہ کامیاب قرار دیئے گئے اور ان کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے تمام کے تمام امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کروا دیئے گئے) تو ان انتخابات میں وزیر اعظم بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق جو کابینہ میں وزیر تعلیم تھے، کے درمیان اختلافات نے تصادم کی صورت اختیار کرلی اور نیشنل کانفرنس پھر سے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک کی سربراہی خود وزیر اعظم بخشی غلام محمد کر رہے تھے اور دوسرے کی سربراہی خواجہ غلام محمد صادق کے ہاتھ میں چلی گئی۔ بخشی صاحب کی کابینہ کے تین اہم وزرا مسٹر گردھاری لال ڈوگرہ، مسٹر درگا پرشاد دھر اور سید میر قاسم کے علاوہ اسمبلی کے سابق سپیکر خواجہ غلام رسول رینزو، جنہیں بخشی غلام محمد نے اپنی سیاسی حکمت عملی سے انتخابات میں ناکام بنا دیا تھا، بھی صادق صاحب سے مل گئے اور ان لوگوں نے نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں

ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس بنال جس کے اغراض و مقاصد اور نصب العین کا اعلان ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو سرینگر میں کیا گیا۔ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس نے ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے بارے میں بخشی صاحب کے نظریات کی تائید کے سوا باقی تمام نیشنل کی پالیسیوں کو مسترد اور اس کے ساتھ ہی شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کا بھی مطالبہ کر دیا۔ وزیر اعظم بخشی غلام محمد یہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ مطالبہ نئی دہلی کے اشارے پر کیا جا رہا ہے اور اس میں زیادہ تر پنڈت جواہر لال نہرو کا ہاتھ ہے۔ اسی اثنا میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ساڑھے چار برس کے وقفے کے بعد جولائی ۱۹۵۷ء میں وادی میں سیلاب کی صورت حال کا جائزہ لینے کے بہانے پہلی مرتبہ سرینگر آئے۔ پنڈت نہرو سرینگر کے ہوائی اڈے پر جیسے اترے تو وہ اداس اور مغموم نظر آ رہے تھے۔ ہوائی اڈے پر ریاستی حکام جو ان کے خیر مقدم کیلئے وہاں موجود تھے، کے ساتھ انہوں نے انتہائی بے رخی برتی اور چپ چاپ کار میں بیٹھ کر سرکاری قیام گاہ پر پہنچے۔ اس کے اگلے دن بخشی غلام محمد کی سرکاری قیامگاہ کے احاطے میں نیشنل کانفرنس کے چیدہ چیدہ کارکنوں کا ایک جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑی بے باکی کے ساتھ یہ کہا ـــ مجھے اپنے ایک قریبی ساتھی شیخ صاحب کی جدائی کا بے حد افسوس ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں کو قائل کر لیتا ہوں لیکن افسوس ہے کہ میں شیخ صاحب کو قائل نہیں کر سکا۔ ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں خود میرے ہی اندر کوئی کمزوری ہو لیکن اس کے باوجود میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے اور شیخ عبداللہ کے درمیان جو خلیج پیدا ہوگئی ہے وہ مزید وسیع ہو۔ میں اس کو پاٹنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ وزیر اعظم ہند کے اس اظہار خیال سے بخشی غلام محمد اور ان کے حامیوں کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں لیکن وہ دم بخود رہے۔ بخشی صاحب کے ساتھ بھی بات چیت کے دوران پنڈت نہرو اور بخشی صاحب کے درمیان بعض امور پر بڑی حد تک اتفاق ہو گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بخشی غلام محمد نے مجبوراً اتفاق کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نومبر ۱۹۵۷ء میں دہلی جا کر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اس معاملے پر کھل کر بات چیت کی اور جب پنڈت جواہر لال نہرو اس بات پر بضد رہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو مسلسل نظر بند رکھنا کوئی اچھی بات نہیں تو بخشی غلام محمد نے انہیں یقین دلایا کہ وہ چند ایک ہفتے تک سابق وزیر اعظم کشمیر کو رہا کر دیں گے۔ نئی دہلی سے واپسی پر بخشی غلام محمد جموں سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچے اور یہاں انہوں نے اپنے قریبی مشیروں اور قابل اعتماد ساتھیوں کے ساتھ اس

مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا اور سیاسی سطح پر اور انتظامی سطح پر تمام تر تیاریاں کرنے کا حکم دیا تا کہ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی سے پیدا ہونے والی ہر صورت حال کا مقابلہ کیا جا سکے۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں ریاستی کابینہ نے شیخ محمد عبداللہ کو رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کے مطابق ۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو شیخ محمد عبداللہ قید سے رہا کر دیئے گئے۔ اپنی رہائی کے بعد شیخ صاحب براستہ بانہال سرینگر آئے جہاں زبردست پابندیاں اور خوف و دہشت کی کارروائیوں کے باوجود ان کا نہایت پرتپاک استقبال کیا گیا۔ گرفتاریوں کے ڈر سے بے نیاز ہو کر اور پولیس کی طرف سے لاٹھیوں کے استعمال کے باوجود شہر اور دیہات کی تقریباً ساری آبادی اس راستے پر اُمڈ آئی جس راستے سے شیخ محمد عبداللہ کو گذرنا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی اور ان کی سرینگر میں آمد کے بعد برسراقتدار نیشنل کانفرنس اور اس کی حکومت تقریباً بے دست و پا ہو کر رہ گئی اور شیخ محمد عبداللہ کے جلسوں میں ہزاروں انسانوں کی حاضری نے وزیر اعظم بخشی غلام محمد اور نئی دہلی کو یکساں طور پر پریشان کر دیا۔ مقامی اخبارات پر کڑی پابندیاں عاید کر دی گئیں اور نئی دہلی یا بیرونی ممالک سے جو اخباری نامہ نگار شیخ محمد عبداللہ کی رہائی اور ان کی تقریروں کے بارے میں خبریں بھیجنے کے لئے یہاں آئے ان سب کو سرکاری مہمانوں کے طور پر بیڈورڈ اور براڈوے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ان میں بڑی فراخدلی سے روپیہ تقسیم کیا گیا اور کھانے پینے، شراب اور دوسری ہر چیز کے سلسلے میں ان کی بھرپور خاطر و مدارت کی جاتی رہی۔ سرینگر میں صورت حال یہ تھی کہ جب وزیر اعظم بخشی غلام محمد جموں میں صرف چند روز قیام کے بعد جنوری کے تیسرے ہفتے میں پھر سرینگر آئے تو ان کی آمد کی اطلاع ملنے پر میں ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گیا تو میں نے افسردگی، مایوسی اور پریشانی کی سی کیفیت دیکھی۔ وہاں گاندربل کے نورالدین صوفی نے مجھے بتایا کہ کوئی ایک شخص بھی اس احاطے میں داخل نہیں ہو رہا ہے حالانکہ جنوری ۱۹۵۸ء سے پہلے وزیر اعظم بخشی غلام محمد موسم سرما کے دوران جموں ہی میں ہوتے تھے۔ سرینگر آتے تو ہر روز سینکڑوں لوگ ان سے ملاقات کرنے اور انہیں اپنے مسائل پیش کرنے کے لئے ان کی قیام گاہ کے اندر اور باہر نظر آتے تھے لیکن اب حالت یہ تھی کہ وزیر اعظم کی قیام گاہ پر صرف بارہ آدمی موجود تھے ان میں سے چھ پولیس کے اعلیٰ افسران میں انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر مہرہ بھی شامل تھے اور باقی قیام گاہ کے سرکاری ملازم تھے لیکن اس کے باوجود بخشی غلام محمد نے ہمت نہیں ہاری اور انہوں نے ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ

ہند کی تقریب منانے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں برسرِ اقتدار نیشنل کانفرنس کے اہتمام سے مجاہد منزل سے ایک جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس میں سرکاری کارخانوں کے مزدور، نیشنل کانفرنس کی حامی مزدور انجمنوں کے ممبر، بہت سے سرکاری ملازم اور نیشنل کانفرنس کے چیدہ چیدہ کارکن شامل تھے۔ یہ جلوس لال چوک پہنچا، جہاں ایک جلسہ ہوا جس میں وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد نے تقریر کی۔ لال چوک کے اس جلسے میں پندرہ سے بیس ہزار تک لوگ تھے جن میں اکثریت غیر مسلم تاجروں، سرکاری ملازمین اور دیہات سے آئے ہوئے نیشنل کانفرنسیوں کی تھی۔

بخشی صاحب سرینگر میں مختصر قیام کے بعد واپس جموں چلے گئے اور جانے سے پہلے اُن کی ہدایت کے تحت وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ کا ایک منصوبہ بنایا گیا تاکہ شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ سرینگر کے مختلف تار گھروں سے ہزارہا تار وزیرِ اعظم ہند اور مرکزی وزیرِ داخلہ کو بھیجے گئے جن میں سیاسی حالات کو انتہائی سنگین اور شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کا مطالبہ درج کیا گیا تھا۔ ان تمام تاروں کا خرچ خصوصی فنڈ سے ادا کیا گیا۔ یہ خصوصی فنڈ مختلف طریقوں سے شیخ محمد عبداللہ کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا اور جن لوگوں کی تحویل میں یہ فنڈ تھا وہ روزانہ ہزاروں روپے اس میں سے خرچ کرتے تھے۔ توڑ پھوڑ کے اس منصوبے پر عملدرآمد کے سلسلے میں شہر اور دیہات میں مختلف مقامات پر محاذ رائے شماری اور نیشنل کانفرنس کے حامیوں کے درمیان جھڑپیں کروائی جاتی رہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ پروگرام بنایا گیا کہ آئندہ جمعہ کو معراج النبیؐ کی تقریب کے سلسلے میں شیخ محمد عبداللہ کی درگاہ حضرت بل میں تقریر کے موقعہ پر بڑے پیمانے پر فساد برپا کیا جائے اور حکمران پارٹی نیشنل کانفرنس کے تین حامیوں کو قتل کر کے اس کا الزام محاذ رائے شماری والوں کے سر تھوپ دیا جائے۔ چنانچہ بروز جمعہ جب دور و نزدیک، شہر اور دیہات سے ہزارہا لوگ درگاہ حضرت بل پہنچ رہے تھے تو اس علاقے میں جگہ جگہ سنٹرل ریزرو پولیس کے مسلح دستے گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد جو خود جموں میں تھے، کے بہت سے حامی اوقاف کے لئے چندہ جمع کرنے اور ان وقفوں کی سرپرستی کے لئے پولیس کی مدد کے بہانے درگاہ کے باہر موجود تھے۔ نمازِ جمعہ کی ادائیگی اور شیخ صاحب کی تقریر کے بعد جھڑپیں شروع ہوئیں اور لوگ خشکی اور آبی دونوں راستوں سے بھاگنے لگے۔ اس مار دھاڑ اور بھگدڑ میں تقریباً ۲۸ آدمی زخمی ہو گئے جن میں سے دس کے بارے میں یہ وثوق کے ساتھ

کہا گیا کہ انہیں پولیس نے بڑی بے دردی کے ساتھ پیٹا تھا۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے اُن تین حامیوں جنہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا، میں سے ایک کو واقعی اندر سے چھرا گھونپ دیا گیا اور وہ زمین پر تڑپنے لگا۔ اس کا نام محی الدین پانڈے تھا اور یہ شخص سپیشل پولیس میں ملازم بھی تھا جس کا سارا ریکارڈ خفیہ رکھا جاتا تھا۔ دوسرے دو افراد علی محمد اور محمد یوسف زرگر بھگدڑ مچتے ہی ان کے ہاتھ نہیں لگ سکے جنہیں اُن کے قتل کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور اس طرح صرف ایک آدمی کے قتل کا اہتمام ہو سکا۔ اس قتل کے الزام میں پولیس نے مولانا محمد سعید مسعودی اور صوفی محمد اکبر سمیت چھتیس ۳۶ سرکردہ لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور ان میں سے اٹھارہ کے خلاف درگاہ حضرت بل میں فساد برپا کرنے اور محی الدین کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ رجسٹر کیا گیا۔ بعد میں اس مقدمے کی پیروی سرینگر سنٹرل جیل میں ہوا کرتی تھی جہاں مولانا محمد سعید مسعودی اور ان کے ساتھی ملزموں کی حیثیت میں پیش ہوا کرتے تھے۔

اسی دوران بخشی غلام محمد کو اُن کے جاسوسوں نے یہ اطلاع بھی دی کہ مس مردولا سارا بھائی، جو کانگریس کی ایک اہم خاتون لیڈر تھی اور جس نے کشمیر کے معاملے پر اپنا رویہ بدل کر اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی تھی، وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک خصوصی مراسلہ لے کر سرینگر آئی ہے اور اس کی کوششوں کے نتیجے میں جلد ہی شیخ محمد عبداللہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ملاقات کا امکان ہے۔ اس پر وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کچھ زیادہ پریشان ہو گئے چنانچہ انہوں نے ۲۹ اور ۳۰ اپریل کی درمیانی شب کو شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کر کے انکے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ملاقات کے امکانات کو ختم کر کے رکھ دیا۔ شیخ صاحب دوبارہ کُد میں نظربند کر دیئے گئے اور جوں ہی حکومت کے اس اقدام کی خبر عوام میں پھیلی تو انہیں شیخ صاحب کی گرفتاری پر سخت صدمہ ہوا۔ لیکن چونکہ حکومت نے شہر اور دیہات کے تمام اہم مقامات، بازاروں اور سڑکوں پر مسلح سنٹرل ریزرو پولیس کا زبردست پہرہ بٹھا دیا تھا۔ اس لئے کوئی احتجاج وغیرہ نہیں کیا جا سکا۔ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ جو شخص بطورِ احتجاج اپنی دکان بند کریگا اس کی دکان لوٹ لی جائے گی۔ چنانچہ زینہ کدل میں دو ایک دکانوں کے قفل توڑ کر انہیں لوٹ بھی لیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کے لگ بھگ ایک ہفتہ بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا اس کے بارے میں یہ خبر نئی دہلی کے اخبارات میں شائع

ہوئی کہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں یہ دھمکی دی تھی کہ وہ وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو جانا چاہتے ہیں کیونکہ بہت سے اہم معاملات کے بارے میں انہیں بے خبر رکھا جا رہا ہے۔ حکومت ہند کے حلقوں کا یہ بیان تھا کہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری، بخشی غلام محمد اور مرکزی وزیر داخلہ مسٹر گوبند ولبھ پنتھ نے نہایت ڈرامائی انداز میں عمل میں لانے کا اقدام کیا تھا اور جواہر لال نہرو اس واقعہ سے خوش نہیں تھے۔

۹

آزاد کشمیر میں مسلح بغاوت

آزاد کشمیر میں بھی حکومتوں کی تبدیلی کے طریقہ کار اور مسئلہ کشمیر کے طول پکڑنے کے خلاف سیاسی عوام کی ایک بڑی اکثریت نالاں تھی اور عوام کی ایک ایسی منتخب حکومت کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا، جو کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی مثبت اقدام کر سکے۔ اس مقصد کے لئے مسلم کانفرنس کے بعض سرکردہ لیڈروں نے یہ تحریک بھی شروع کی تھی کہ آزاد کشمیر کی منتخب حکومت کو پاکستان جموں کشمیر کی حکومت تسلیم کرے اور بعد میں دوسرے ممالک سے بھی اس حکومت کو تسلیم کروانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن پاکستان نے اس تحریک سے اتفاق نہیں کیا۔ خاص طور پر شیر احمد خان جو برطانوی حکومت کی فوج میں صوبیدار تھا، کو اعزازی کرنل بنا کر آزاد کشمیر حکومت کا سربراہ مقرر کرنا بھی کوئی قابل قبول نہ تھا۔ اس حکومت کو عوام کے کسی بھی سیاسی طبقے کی حمایت حاصل نہیں تھی اور مسلم کانفرنس کے لیڈروں کو اس طرح کی حکومت کے قیام پر سخت اعتراض تھا۔

چنانچہ ۱۹۵۴ء کے ابتدائی ایام میں آزاد کشمیر کے صدر کرنل شیر احمد خان اور ان کے مخالفوں کے

درمیان محاذ آرائی کی سی صورت حال پیدا ہو گئی اور اس محاذ آرائی نے اس وقت سنگین صورت اختیار کر لی، جب پلندری میں ایک مخالف لیڈر شیر دل خان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔

شیر دل خان اپنے گاؤں سے حسب معمول قصبہ پلندری کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے آیا اور جب وہ مسجد میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ مسجد کو چاروں طرف پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد جب شیر دل خان مسجد سے باہر آیا تو پلندری کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انہیں گرفتاری کا وارنٹ پیش کیا۔ ابھی وہ گرفتاری کا وارنٹ اسے دکھا ہی رہا تھا کہ شیر دل خان نے پستول نکال کر اس پر فائر کیا اور پھر ہوا میں بھی ایک دو گولیاں چلائیں۔ اس کے نتیجے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس زخمی ہو کر گر گیا۔ پولیس کے جو سپاہی وہاں متعین تھے، وہ فرار ہو گئے اور شیر دل خان نے اپنا راستہ لیا۔

پلندری کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر عنایت مولا نے اس معاملے کا سخت نوٹس لیا اور مظفر آباد سے رابطہ قائم کر کے ہدایات حاصل کرنے کی کوشش کی، کہ اسی اثنا میں شیر دل خان نے اپنے ساتھیوں سمیت مسلح بغاوت کا اعلان کر دیا اور جب انہوں نے پلندری کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کی طرف رخ کیا تو آزاد کشمیر کی مسلح پولیس بھی باغیوں سے مل گئی۔ انہوں نے سب سے پہلے جیل پر دھاوا بول دیا اور وہاں سے تمام قیدیوں کو رہا کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر کی طرف پیش قدمی کی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر عنایت مولا کسی نہ کسی طرح وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور راولپنڈی جا پہنچا۔ باغیوں نے ضلع ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر کے ایک متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ضلع پونچھ کو پاکستان سے ملانے والے دو اہم راستوں کوہالہ اور کہوٹہ کی ناکہ بندی کر لی۔

اس صورت حال کا جب حکومت پاکستان کو علم ہوا تو وزارت دفاع نے کہوٹہ کے فوجی کیمپ اور مری کے راستے سے فوج کو پونچھ کی بغاوت پر قابو پانے کے لئے پیش قدمی کا حکم دیا۔ فوج پنجاب کی آرمڈ کانسٹیبلری کی مدد سے کوہالہ اور کہوٹہ کی طرف سے پیش قدمی کرتی ہوئی علاقے کے اندرونی حصوں میں پہنچی۔ جہاں بعض مقامات پر باغیوں اور فوج کے درمیان شدید تصادم ہوئے لیکن باغیوں کی تعداد کم ہونے اور گولی بارود کا سٹاک ختم

ہونے کی بنا پر فوج نے ضلع ہیڈکوارٹر سمیت سارے علاقے کو قبضے میں لے لیا۔

شیر ولی خان نے اس کے باوجود ہتھیار نہیں ڈالے اور وہ اپنے تقریباً ڈیڑھ سو ساتھیوں کے ساتھ پسپا ہو کر پلندری کے نزدیک بارل کے قلعے میں جا پہنچے، جہاں قلعہ بند باغیوں اور فوج کے درمیان دو دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ اس لڑائی میں کتنے لوگ مارے گئے، اس بارے میں بالکل کچھ نہیں بتایا گیا۔ البتہ بارل کا قلعہ فتح ہونے کے باوجود شیر ولی خان فوج کے ہاتھ نہیں لگا۔ امن و انتظام بحال کرنے کے بعد اس سارے علاقے میں گھر گھر تلاشی لی گئی اور ہتھیاروں کی بہت بڑی مقدار ضبط کر لی گئی۔ بہت سے لوگوں کا مال و اسباب ضبط کیا گیا۔ یہ مال و اسباب ضلع ہیڈکوارٹر پر لا کر نیلام کیا گیا اور اس کی نیلامی کا کام پلندری کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر عبدالرحمٰن سلیم کے سپرد کیا گیا۔ علاقے میں امن و انتظام بحال ہونے کے کوئی دو ہفتے بعد کشمیر اسٹیٹ پریس کا افسر تھا، مجھے پلندری جا کر صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے بھیجا اور جب میں پلندری پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس پورے علاقے میں خوف و دہشت کی سی فضا تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر نے اپنے ایک ماتحت کو ہدایت کی کہ وہ مجھے پلندری ہسپتال لے جائے۔ یہ سارا ہسپتال زخمیوں سے بھرا پڑا تھا، جن میں زیادہ تر تعداد خواتین کی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ بارل کے قلعے کی تسخیر کے بعد فوج شیر ولی خان کے آبائی گاؤں میں اس کی تلاش کے لئے گئی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ البتہ اس کے مکان کو مال مویشیوں سمیت ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا۔ بغاوت کے سلسلے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد کو گرفتار کیا گیا اور انہیں مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر کے حکام نے اس سارے معاملے کی بڑی سختی کے ساتھ پردہ پوشی کی اور جو واقعات کسی نہ کسی طرح اخبارات تک پہنچے، انہیں شائع کرنے پر بھی پابندی عاید کر دی گئی۔ ان واقعات کے بارے میں کشمیری لیڈروں نے پاکستان کے گورنر جنرل کو ایک میمورنڈم بھی پیش کیا اور انہوں نے تحقیقات کا یقین بھی دلایا لیکن نہ تو کوئی تحقیقات ہوئی اور نہ ہی کسی سے ان زیادتیوں اور مظالم کی باز پرس کی گئی، جو اس علاقے کے لوگوں پر ڈھائے گئے۔

۱۰



اپریل ۱۹۵۸ء میں شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کے بعد کشمیر پولیس نے بخشی غلام محمد کو وہ خاکہ پیش کیا جس کے مطابق سابق وزیر اعظم اور ان کے تمام تر قریبی ساتھیوں کے خلاف ریاستی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے پاکستان کے ساتھ سازباز کرنے کا مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ یہ خاکہ مرکزی سراغرساں ایجنسی آئی بی اور کشمیر پولیس کے کچھ افسروں نے مل کر تیار کیا تھا۔ کشمیر پولیس کے ان افسروں میں شیخ غلام قادر گاندربلی ایس پی سپیشل پولیس، پنڈت گوپی ناتھ کوترو ایس پی سی آئی ڈی اور اسی درجے کے کچھ دوسرے پولیس افسر پیش پیش تھے۔ اب بخشی صاحب بیک وقت دو محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ ایک محاذ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کا تھا اور دوسرا نئی دہلی میں ہندوستان کے ان لیڈروں پر مشتمل تھا جو کشمیر کے بارے میں بخشی غلام محمد کی پالیسیوں سے ناخوش تھے لیکن بخشی غلام محمد نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اپنا یہ مطالبہ منوا لیا کہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں پر پاکستان کے ساتھ سازش کرنے کا مقدمہ چلایا جائے۔ نئی دہلی کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ۲۱ مئی ۱۹۵۸ء کو باقاعدہ طور پر سازش کا مقدمہ رجسٹر کر لیا گیا۔ ریاستی حکومت نے ابتداء میں شیخ محمد عبداللہ کو اس مقدمہ

میں ملوث کرنے سے گریز کیا اور ملزموں میں سرِ فہرست سابق وزیر مال مرزا محمد افضل بیگ کا نام رکھا گیا۔ اس مقدمے کی سماعت سری نگر کی بجائے جموں میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے ایک کمزور اور حکومت کے آلۂ کار جج پنڈت نیلکنٹھ واک کو سماعت کے فرائض سونپے گئے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ بیرون کشمیر پنڈت نیلکنٹھ واک کی بجائے سماعت کرنے والے جج کا نام ان کے حق جتلایا جاتا تھا۔ مقدمے کی ابتدائی سماعت کے صرف چند ہفتے بعد شیخ محمد عبداللہ کو سب سے بڑے ملزم کی حیثیت سے اس میں ملوث کیا گیا اور انہیں کٹھوعہ سب جیل سے جموں منتقل کیا گیا تاکہ مقدمے کی سماعت کے دوران وہ عدالت میں پیش ہو سکیں۔ مقدمے کی سماعت جموں سنٹرل جیل کے ایک حصے میں ہو رہی تھی اور اس میں ملوث کئے گئے تمام ملزم جموں سنٹرل جیل میں رکھے گئے۔ اس مقدمے پر پانی کی طرح روپیہ صرف کیا جانے لگا۔ سازش کے اس مقدمے میں اصل گواہ وہ لوگ تھے، جنہیں کشمیر پولیس جاسوسی کے لئے پاکستان بھیجا کرتی تھی۔ ان تمام ترکاروائیوں کے باوجود بخشی غلام محمد نہ تو جواہر لال نہرو کو متاثر کر سکے اور نہ وہ داخلی طور پر ایک مضبوط حکمران بن سکے۔

داخلی طور پر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس ان کے خلاف برسرِ پیکار تھی اور کشمیری پنڈت بھی ان سے ناخوش تھے کشمیری پنڈتوں کی بڑھتی ہوئی مخالفت بخشی غلام محمد کے لئے بڑی حد تک ناقابلِ برداشت تھی اور وہ جب بھی اس موضوع پر مجھ سے بات کرتے تھے تو کہا کرتے "دیکھئے میں نے ہندوستان کے لئے کیا کچھ نہیں کیا لیکن اس کے باوجود ہندو مجھ سے خوش نہیں ہیں" ۔۔۔ اور دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو برابر بے اطمینانی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کے زبردست دباؤ کے تحت بخشی غلام محمد نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو واپس نیشنل کانفرنس میں لے لینے اور انہیں وزارتی عہدوں پر فائز کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی چنانچہ ۵ دسمبر ۱۹۶۰ء کو ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس توڑ دی گئی اور خواجہ غلام محمد صادق اور ان کے رفقا دوبارہ بخشی غلام محمد کے ساتھ مل گئے۔ اس ملاپ کے نتیجے میں صادق صاحب، ڈی پی دھر، سید میر قاسم اور گردھاری لال ڈوگرہ کو کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ ان کی کابینہ میں شمولیت اس لئے بھی ضروری تھی کیونکہ ریاستی اسمبلی کے انتخابات آنے والے تھے اور حکمران جماعت کے کسی بھی

خلاف کو الیکشن لڑنے دیا۔ اس میں کامیابی کی قطعی کوئی اُمید نہیں ہوا کرتی تھی اور صادق صاحب کو مسٹر ڈی پی دھر نے اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو بخشی غلام محمد کو اب کشمیر کا وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہتے۔ جواہر لال نہرو نے بخشی غلام محمد کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ چونکہ ایک طویل عرصے سے کشمیر کے وزیر اعظم چلے آ رہے ہیں اس لئے وہ اب ریاست سے باہر آ کر کام کریں۔ یہاں تک کہ انہیں مرکزی وزیر داخلہ بنانے کی پیشکش بھی کی گئی لیکن بخشی صاحب نے بڑی صفائی کے ساتھ اس معاملے کو ٹال دیا اور فروری ۱۹۶۲ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات اپنی نگرانی میں کروائے اور اپنے بیشتر ساتھیوں کو پھر ایک بار بلا مقابلہ کامیاب کروا لیا۔ اس مرتبہ بھی انتخابات برائے نام ہوئے کیونکہ وادی کی ۴۳ اسمبلی کی سیٹوں میں سے ۳۸ بلا مقابلہ حاصل کر لی گئیں اور حکمران نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے اُمیدواروں میں سے بعض کو لالچ دیا گیا، بعض کو اغوا کر لیا گیا اور جو اس کے باوجود اُمیدوار بنے رہے اُن کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر دیئے گئے۔ اس طرح بخشی غلام محمد نے اپنی حکمرانی کو برقرار رکھنے کا انتظام کر لیا۔ لیکن یہ بات اُن کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی کہ نئی دہلی اُن کی حکمرانی کو اب پسند نہیں کرتی۔ نئی ریاستی کابینہ کی تشکیل کے بعد ۹ جولائی ۱۹۶۲ء کو جواہر لال نہرو ایک ہفتے کے طویل قیام کے لئے کشمیر آئے اور انہوں نے بخشی صاحب کے علاوہ اُن کے تمام رفقاء کے ساتھ فرداً فرداً کشمیر میں لیڈرشپ کی تبدیلی کے بارے میں گفت و شنید کی۔ پنڈت شیو نرائن فوطیدار جو اُن دنوں قانون ساز کونسل کے چیئرمین تھے نے مجھے بتایا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخشی غلام محمد کی حکومت کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ کیونکہ پنڈت جی اس بات پر بضد ہیں کہ لیڈرشپ میں تبدیلی کر کے شیخ محمد عبداللہ کو رہا کیا جائے تاکہ اُن کے ساتھ گفت و شنید کی جا سکے۔" وزیر اعظم ہند پورے پانچ دن تک کشمیر میں رہے۔ لیکن بخشی صاحب اور اُن کے رفقاء کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکے۔

اس کے تقریباً تین ماہ بعد یعنی ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور اس کی فوجیں مارتی دھاڑتی ہوئی نیفا پر قابض ہو گئیں اور انہوں نے لداخ میں بھی پیش قدمی کر کے بعض اہم علاقوں

پر قبضہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چینی فوج چند دن میں سارے آسام پر قابض ہو جائے گی لیکن چین نے یکطرفہ طور پر بہت ڈرامائی انداز میں جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ چین کا یہ حملہ سارے برصغیر کے لئے ایک زبردست ہیجان کا سبب بن گیا اور اس سے جواہر لال نہرو کی سیاسی شخصیت کو بھی ٹھیس پہنچی۔ چین کی طرف سے یکطرفہ جنگ بندی کے اعلان کے صرف ایک ہفتہ بعد نئی دہلی میں زبردست سفارتی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ ان سفارتی سرگرمیوں کے نتیجے میں ۲۳ نومبر ۱۹۶۲ء کو امریکہ اور برطانیہ کے دو ممتاز ڈپلومیٹ ایورل ہیری مین اور ڈنکن سینڈس اچانک نئی دہلی پہنچے جہاں انہوں نے چار روز تک جواہر لال نہرو اور کچھ دوسرے لیڈروں کے ساتھ طویل بات چیت کی۔ چار دن کی اس بات چیت کے بعد ۲۸ نومبر کی صبح کو مسٹر ڈنکن سینڈس نئی دہلی سے راولپنڈی گئے اور وہاں صدر محمد ایوب خان کے ساتھ مختصر گفت شنید کے بعد شام کو واپس نئی دہلی آ گئے۔ اس کے اگلے روز یعنی ۲۹ نومبر کو نئی دہلی اور راولپنڈی سے بیک وقت ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان کشمیر کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس معاملے کی تفصیلات اور دوسرے امور کے بارے میں وزیر اعظم ہند نے ۳۰ نومبر کو پارلیمنٹ میں بھی بیان دیا جس میں انہوں نے بتایا کہ بات چیت وزارتی سطح پر شروع کی جا رہی ہے۔ مسٹر ایورل ہیری مین اور ڈنکن سینڈس کے اس مشن کا اصل پس منظر یہ تھا کہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو چینی فوجوں کی آسام کی طرف پیش قدمی سے قبل پیکنگ نے صدر ایوب کو اعتماد میں لیکر اُن سے کہا تھا کہ وہ اس موقع پر پاکستان کی مسلح افواج کو کشمیر میں داخل کر کے وادی پر قبضہ کر لیں۔ صدر ایوب اور چینی لیڈروں کے درمیان اس کارروائی کے لئے سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ صدر ایوب خان نے ہندوستان پر چین کے حملے سے دو دن قبل راولپنڈی میں پاکستان کی قومی اسمبلی کا خفیہ اجلاس طلب کیا۔ جس میں انہوں نے اس کارروائی کے لئے قومی اسمبلی سے بھی منظوری حاصل کر لی۔ البتہ صدر ایوب نے سینٹو کا ممبر ہونے کی حیثیت میں یہ مناسب سمجھا کہ وہ اپنے اتحادیوں کو بھی اپنی اس کارروائی سے باخبر رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لئے پاکستان میں متعین ترکی، ایران، امریکہ اور برطانیہ کے سفیروں کے ساتھ الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کے بعد سفیروں نے اپنے اپنے ملک کو اس سارے معاملے سے آگاہ کر دیا جس پر امریکہ اور برطانیہ کو تشویش پیدا ہو گئی اور انہوں

نے فوراً راولپنڈی سے رابطہ قائم کر کے صدر ایوب کو یہ یقین دلایا کہ اگر وہ چین اور ہندوستان کی جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے تو امریکہ اور برطانیہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مذاکرات کے ذریعے کشمیر پر تصفیہ کروانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لئے تیار ہیں۔ صدر ایوب نے اس معاملے پر اپنے اعلیٰ فوجی مشیروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے بعد انگلو امریکی پیش کش قبول کر لی چنانچہ جونہی چین نے یکطرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کیا تو امریکہ اور برطانیہ نے باہمی صلاح مشورے کے بعد فوراً کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کے درمیان مصالحت کروانے کا مشن شروع کیا۔ اور امریکہ اور برطانیہ کے دو نمائندوں ایورل ہیری مین اور ڈنکن سینڈیس کی کوششوں کے نتیجے میں جو فیصلہ ہوا اُس کے مطابق ۲۶ دسمبر ۱۹۶۲ء کو ہندوستان کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ ایک اعلیٰ سطح کا وفد لے کر راولپنڈی پہنچے جہاں کشمیر پر بھٹو سورن سنگھ مذاکرات کا دور شروع ہوا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ان ایام میں پاکستان کے وزیر خارجہ تھے بات چیت کا یہ دور کئی ماہ تک چلتا رہا اور اس میں کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے دونوں جانب سے مختلف اور متبادل قسم کی تجویزیں پیش کی جاتی رہیں اور اُن پر تبادلۂ خیال کیا جاتا رہا۔ ایک مرحلے پر جموں کشمیر کی تقسیم کے منصوبے پر اعلیٰ فوجی افسروں سے بھی صلاح مشورہ کیا گیا۔ پاکستان اس بات پر بضد تھا کہ بانہال کے درّے تک ساری وادی اُسے دے دی جائے اور جموں کا سارا علاقہ ہندوستان لے لے۔ تقسیم کا ایک ایسا منصوبہ بھی زیر غور لایا گیا جس کا مقصد دریائے جہلم تقسیم کی حد مقرر کرنا تھا۔ شاید کوئی شخص اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ سری نگر میں بہت سے غیر مسلم جن کے مکان اور جائیدادیں دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر واقع تھیں اپنے مکانوں اور جائیدادوں کا سودا کرنے لگے کیونکہ اُنہیں یقین ہو چلا تھا کہ شہر کا مشرقی حصہ ہندوستان میں شامل رہے گا اور اس کا مغربی حصہ پاکستان میں جا رہا ہے لیکن کئی ماہ کے یہ طویل مذاکرات بھی آخر کار ناکام ہو گئے اور مسئلہ جوں کا توں لٹکتا رہا۔ بھٹو سورن سنگھ مذاکرات کی ناکامی کے بعد جون اور جولائی ۱۹۶۳ء میں ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو دو مرتبہ کشمیر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی حل نکالنے کے لئے مضطرب ہیں۔ یہاں اُنہوں نے وزیر اعظم بخشی غلام محمد اور اُن کے رفقاء کے ساتھ طویل بات چیت کی۔ جواہر لال نہرو جولائی میں شاید آخری کوشش کے لئے سری نگر آئے

یہاں اُنہوں نے لال چوک میں ایک بہت بڑے جلسے سے بھی خطاب کرتے ہوئے بظاہر رائے شماری کے مطالبے کو ایک ٹاق قرار دیا لیکن اندر ہی اندر وہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت شروع کرنے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کوششوں کا جب کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو وہ ناراض ہو کر سری نگر سے پہلگام چلے گئے۔ چنانچہ بخشی غلام محمد اور اُن کے اعلیٰ مشیر بھی پہلگام جا پہنچے۔ جب پہلگام میں بخشی غلام محمد جواہر لال نہرو سے ملنے گئے تو وزیر اعظم ہند اُن پر برس پڑے اور نہایت غصے میں آ کر اُن سے کہا "میں کل صبح خود براستہ بانہال جموں جا رہا ہوں تاکہ وہاں جیل میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت کر سکوں۔" اس پر بخشی غلام محمد بہت گھبرائے اور پہلگام میں اپنی قیام گاہ پر واپس آ کر اپنے اعلیٰ مشیروں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔ مشیروں کے صلاح مشورے کے مطابق تقریباً دس بجے شب بخشی صاحب پھر جواہر لال نہرو کی رہائش گاہ پر گئے اور اُنہیں یہ یقین دلایا کہ صرف ایک ماہ کے اندر اندر وہ اس بات کا انتظام کریں گے کہ شیخ محمد عبداللہ جیل سے اُنہیں خط لکھیں جو کسی بات چیت کی سبیل پیدا کر سکے۔ بظاہر اس یقین دہانی پر اطمینان کا اظہار کرنے کے بعد دوسرے دن وزیر اعظم ہند واپس نئی دہلی چلے گئے لیکن اُنہیں واپس گئے ہوئے ابھی دس دن ہی ہوئے تھے کہ بخشی غلام محمد کو نئی دہلی طلب کیا گیا۔ جہاں جواہر لال نہرو نے اُن سے کہا "چونکہ مسٹر کامراج نے کانگریس پارٹی اور حکومت میں بہتری لانے اور سرکردہ لیڈروں کی طرف سے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنے کے لئے یہ پلان بنایا ہے کہ ہندوستان کی ساری ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکزی کابینہ کے تمام وزیر جواہر لال نہرو کی قیادت پر اظہار اعتماد کا عملی ثبوت دینے کے لئے اپنے استعفے اُنہیں پیش کریں۔ اس لئے اگر آپ بھی اپنا استعفیٰ دیں تو میرے ہاتھ بہت مضبوط ہو سکتے ہیں۔ اس سے میرا مقصد سیاسی طور پر ایک نئی سیاسی فضا پیدا کرنا ہے۔" بات چیت کے دوران بخشی صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ شاید اُن کا استعفیٰ منظور نہیں ہوگا کیونکہ کشمیر میں اُن کے بغیر کام نہیں چل سکے گا۔

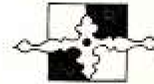
بخشی غلام محمد نے جواہر لال نہرو کے سامنے بظاہر اور نیم دلی سے حامی بھری اور تیسرے دن واپس سری نگر آ گئے۔ یہاں آتے ہی اُنہوں نے اپنے قریبی رفقاء سے اس مسئلے پر صلاح مشورہ کیا لیکن جیسا کہ خود اُنہوں نے مجھ سے کہا کسی نے بھی اس بات سے اتفاق نہیں کیا بلکہ اُنہیں مشورہ دیا گیا کہ چونکہ وہ کانگریسی وزیر اعلیٰ نہیں ہیں اس لئے کامراج

پلان کے تحت ان کے مستعفی ہونے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ بخشی غلام محمد انتہائی کشمکش میں تھے۔ ایک طرف تو وہ نئی دہلی میں جواہر لال نہرو کے سامنے یہ اقرار کر آئے تھے کہ وہ بھی اپنا استعفیٰ اُن کو بھیج دیں گے اور دوسری طرف انہیں زبردست خدشات محسوس ہو رہے تھے آخر کار انہوں نے اپنے استعفےٰ کا متن تیار کروا کر اور اسے ٹائپ کروا کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور نئی دہلی روانہ ہو گئے نئی دہلی اور سری نگر کے درمیان اندر ہی اندر یہ جو کچھ ہو رہا تھا عوام اس سے بالکل بے خبر تھے بخشی صاحب نے نئی دہلی پہنچ کر وہاں بھی اپنے بہت سے ہمدردوں اور دوستوں سے اس معاملے پر صلاح مشورہ کیا۔ ۲۴ اور ۲۵ اگست ۱۹۶۳ء کی تاریخیں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے لئے مقرر تھیں۔ ساری ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکزی کابینہ کے سارے وزیروں کے استعفے جواہر لال نہرو کو پہنچ چکے تھے لیکن ریاست جموں کشمیر کے وزیر اعظم کا استعفےٰ آنا ابھی باقی تھا۔ چنانچہ بخشی غلام محمد نے بڑی بے دلی کے ساتھ ۲۴ اگست کی شام کو وزیر اعظم ہند کے ساتھ ایک مختصر سی ملاقات کے دوران اپنا ٹائپ شدہ استعفےٰ انہیں پیش کر دیا۔ اس موقع پر بھی وزیر اعظم ہند کے اُن سے جو بات چیت ہوئی، اُس سے ایسا ظاہر ہوا انہیں کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ وزیر اعظم نے اُن سے یہ بھی کہا کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے کل کے اجلاس میں ایک خصوصی ممبر کی حیثیت میں شریک ہوں۔ ۲۵ اگست بعد دوپہر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کامراج پلان کے تحت منظور کئے گئے استعفوں کا اعلان کر دیا اور جن لوگوں کے استعفے منظور کر لئے گئے اُن میں جموں کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد، پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار پرتاپ سنگھ کیرون اور مرکزی وزیر خزانہ مسٹر مرار جی ڈیسائی کے نام خاص طور پر شامل تھے۔ اس اعلان سے بخشی غلام محمد کی کیا حالت ہوئی ہو گی یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا کہ بخشی غلام محمد نے اسی اجلاس میں کانگریس کا ممبر بننے کا اعلان کر دیا اور چار آنے پیش کر کے کانگریس کی باقاعدہ ممبر شپ حاصل کر لی۔ نئی دہلی میں مزید دو دن تک قیام کے بعد بخشی غلام محمد بذریعہ طیارہ واپس سرینگر پہنچے جہاں اُن کے حامیوں نے یہ ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ لیکن استعفیٰ واپس لینا بخشی غلام محمد کے بس میں نہ تھا۔ کیونکہ پنڈت جی

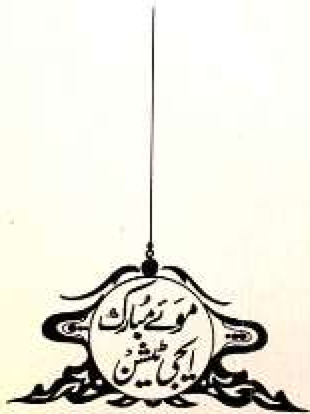
کے وزیر اعظم کے وقار کا سوال تھا۔ انہوں نے نہایت پُر اسرار اور ڈرامائی انداز میں بخشی غلام محمد کو کامراج پلان کے تحت حکومت سے بے دخل کر دیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ بخشی غلام محمد کا جانشین کون ہو گا۔ جواہر لال نہرو یہ چاہتے تھے کہ حکومت کی باگ ڈور غلام محمد صادق کو سونپی جائے تاکہ وہ پنڈت نہرو کے اصل منصوبے کو روبہ عمل لا سکیں۔ بخشی غلام محمد سب کچھ جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے وزیر اعظم ہند کو سری نگر سے ایک مراسلہ بھیجا جس میں بخشی صاحب نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں شیخ محمد عبد اللہ کے خلاف سازش کا مقدمہ واپس لے لینے اور شیخ صاحب کو رہا کرنے کی اجازت دی جائے جس کے جواب میں وزیر اعظم ہند نے بخشی صاحب کو یہ لکھا کہ یہ معاملات اس قدر جلدی طے نہیں ہو سکتے اس لئے عجلت میں وہ کسی ایسے اقدام کو پسند نہیں کریں گے۔

جواہر لال نہرو کا یہ جواب بخشی صاحب کی مزید مایوسی کا سبب بنا اور انہوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ غلام محمد صادق کو اپنا جانشین نہیں بننے دیں گے۔ بخشی صاحب نے اپنی ساری پارٹی کو اس مقصد کے لئے متحد اور منظم کر لیا اور پارٹی کا یہ متفقہ فیصلہ کروا لیا گیا کہ کسی نہ کسی طرح جواہر لال نہرو کو اس بات پر رضامند کر لیا جائے کہ نیشنل کانفرنس کی لیجسلیچر پارٹی جسے چاہے اپنا لیڈر منتخب کرے۔ نئی دہلی سے سری نگر واپس آنے کے بعد بخشی غلام محمد نے اپنے چار امکانی جانشین تجویز کئے۔ بخشی عبد الرشید، خواجہ شمس الدین، غلام محمد میر راجپوری اور گردھاری لال ڈوگرہ اپنے انتہائی قریبی ساتھیوں سے صلاح مشورے کے بعد بخشی غلام محمد نے خواجہ شمس الدین کو اپنا جانشین مقرر کرنا پسند کیا اور اس طرح ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو مسٹر شمس الدین کشمیر کے نئے وزیر اعظم بنائے گئے۔ مسٹر شمس الدین محض ایک کٹھ پتلی تھے حکومت سے علیحدگی کے باوجود بخشی غلام محمد نے منصوبہ بندی کا شعبہ اپنی ہی تحویل میں رکھا اور وہ ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے خود چیئرمین بن بیٹھے رہے۔ انہوں نے منصوبہ بندی کے چیئرمین کے لئے سول سیکرٹریٹ میں وہ دفتر بھی اپنے پاس رکھا جو وزیر اعظم کے لئے مخصوص تھا۔ چنانچہ صرف دو دن میں اس دفتر کے باہر جہاں وزیر اعظم لکھا ہوا تھا "چیئرمین پلاننگ کمیشن" کا بورڈ آویزاں کیا گیا۔ مسٹر شمس الدین کی کابینہ کے سارے وزیروں کا تقرر بھی خود بخشی صاحب ہی نے کیا۔ غلام محمد صادق، ڈی پی دھر، سید میر قاسم اور گردھاری لال ڈوگرہ نے نئی کابینہ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور

اس طرح حکومت کی ساری باگ ڈور بالواسطہ طور پر بخشی صاحب ہی کے ہاتھوں میں رہی اور مسٹر شمس الدین محض برائے نام وزیرِ اعظم تھے۔ اُس وقت یہ کسے معلوم تھا کہ مستقبل قریب میں کیا ہونے والا ہے اور کون جانتا تھا کہ قدرت کا نہایت طاقتور اور خفیہ ہاتھ بہت جلد نئے گُل کھلانے والا ہے؟



١١



۲۶ اور ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کی درمیانی شب کو سرینگر کی درگاہ حضرت بل سے موئے مبارک نہایت پراسرار طور پر چوری ہوگئے۔ یہ خبر صورِ اسرافیل ثابت ہوئی اور جنگل کی آگ کی طرح ساری وادی میں پھیل گئی اور اس نے کشمیر کی مُردہ روح میں اچانک ایک نئی زندگی پھونک دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سویا ہوا آتش فشاں جسے جبر و استبداد اور ظلم و زیادتیوں سے خاموش کردیا گیا تھا، اچانک پھوٹ پڑا ہے اور اس کا لاوا نہ معلوم کیا کچھ بہا کر لے جائے گا۔ پوری وادی میں ایک عجیب انقلاب کی سی کیفیت بپا ہوگئی اور اسی عالم میں ۲۷ دسمبر کو سرینگر اور وادی کے تمام حصوں میں ایک زبردست ایجی ٹیشن شروع ہوگیا۔ ۲۸ دسمبر کی صبح ایک بہت بڑا جلوس سرینگر کے نچلے حصوں سے ہوتا ہوا لال چوک پہنچا اور اس چوک سے اس نے ریذیڈنسی روڈ کا رخ کیا۔ یہ جلوس ابھی چند فرلانگ ہی آگے بڑھا تھا کہ دوسری جانب سے ایک جیپ گاڑی آئی جس میں نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری بخشی عبدالرشید کھڑے تھے۔ انہوں نے اس جلوس سے خطاب کرنے

کی کوشش کی کہ اچانک ایک طرف سے ایک انگارہ ہوا میں لہراتا ہوا اس جیپ گاڑی پر آ گرا اور اس میں دبی ہوئی چنگاریاں فضا میں بکھر گئیں۔ اس کے ساتھ ہی جلوس میں سے ایک مشتعل ہجوم اس جیپ گاڑی پر حملہ آور ہوا۔ بخشی عبدالرشید اس زبردست ہنگامے کی وجہ سے گھبرا کر وہاں سے فرار ہوگئے۔ اس معمولی سے واقعہ نے سارے ایجی ٹیشن کا رخ بخشی غلام محمد کے خلاف پھیر دیا۔ چنانچہ جس جیپ گاڑی پر بخشی عبدالرشید سوار ہوکر آئے تھے اسے لال چوک میں ہی نذرِ آتش کردیا گیا اور اس کے بعد اس مشتعل ہجوم نے بڑی تیزی کے ساتھ ریذیڈنسی روڈ پر آگے بڑھ کر بخشی غلام محمد کے بھائی بخشی عبدالمجید کے دونوں سینما گھروں امریش اور ریگل کو آگ لگا دی۔ یہ مشتعل ہجوم ان دو سینماؤں کو آگ لگانے کے بعد سرینگر کے ریڈیو سٹیشن کو نذرِ آتش کرنے کے لئے دوڑ پڑا کیونکہ اس سٹیشن سے ہمیشہ جھوٹا پروپیگنڈا ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ یہ ہجوم ریڈیو سٹیشن کی عمارت کو نذرِ آتش کرتا اس عمارت کو چاروں طرف سے سنٹرل ریزرو پولیس کے مسلح سپاہیوں نے گھیر لیا تھا۔ بخشی غلام محمد اس وقت سرینگر میں موجود نہیں تھے اور کشمیر میں جو شعلے بھڑک اٹھے تھے ان کی شدت کو نئی دہلی میں فوراً محسوس کرلیا گیا چنانچہ خود وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے نہایت غیر متوقع انداز میں ۲۸ دسمبر شام کو ایک خصوصی ریڈیو براڈکاسٹ میں کشمیری مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اس معاملے کی شد و مد کے ساتھ تحقیقات کی جائے گی اور جس کسی شخص نے یہ بری حرکت کی ہے اسے کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا۔ لیکن جواہر لال نہرو کی اس اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا اور ایجی ٹیشن برابر خطرناک صورت اختیار کرتا گیا۔ اس کے اگلے دن شام کو وزیر اعظم ہند نے دوسری بار پھر ایک خصوصی ریڈیو براڈکاسٹ میں اپنی یقین دہانی کو دہرایا اور کہا کہ اب چونکہ بخشی غلام محمد سرینگر پہنچ چکے ہیں اس لئے مجرم کو جلد پکڑ لیا جائے گا۔ جواہر لال نہرو کے ان الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ایجی ٹیشن شدت اختیار کرگیا جس پر حکومتِ ہند ایک آئی سی ایس افسر مسٹر وشواناتھن کو صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے سرینگر بھیجنے پر مجبور ہوگئی۔ مرکزی خبر رساں ایجنسی کے بہت سے افسر جن میں ایجنسی کے سربراہ مسٹر بھولے ناتھ ملک بھی شامل تھے، بھی سرینگر پہنچے اور انہوں نے کشمیر پولیس کے ساتھ مل کر اس معاملے کا سراغ لگانے کی جد و جہد شروع کردی۔ سارے کشمیر میں مکمل ہڑتال تھی اور ہزاروں کی تعداد میں باہر سے مسلح پولیس منگوا کر جگہ جگہ متعین کردی

گئی۔ اس صبح پولیس نے بڈشاہ چوک، کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے بس اڈے اور سرائے بالا میں عوام پر بڑی بے دردی سے گولیاں چلائیں جس میں متعدد افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے۔ ساری وادی میں نظم و نسق خود عوام کے ہاتھوں میں تھا۔ حکومت کے کارندے، اہل کار اور نیشنل کانفرنس کے اراکین روپوش ہو چکے تھے کہ اسی اثنا میں شیخ محمد عبداللہ کے فرزند ڈاکٹر فاروق عبداللہ گاندربل گئے جہاں سے وہ مولانا مسعودی کو اپنے ہمراہ لائے تاکہ وہ اس منتشر عوامی فوج کی کمان سنبھال سکیں جس کا خوفناک سیلاب ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا تھا۔ عوام یہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اس تحریک کے لیڈر کون ہیں۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ میرواعظ منزل گئے اور ۱۷ سے ۱۸ سالہ مولوی فاروق، جنہیں ان کے والد مولوی محمد امین کی وفات پر بخشی صاحب نے قائم مقام میرواعظ مقرر کیا تھا۔ کو کھینچ کر باہر لے آئے۔ مولوی فاروق سیاہ جھنڈوں والی ایک جیپ گاڑی میں سوار ہو کر جب پہلی مرتبہ عوام میں آئے تو وہ کمسن ہونے کی وجہ سے کوئی تقریر کرنے کی بجائے صرف رو رہے تھے۔ اس منتشر اور بکھری ہوئی قیادت کا کوئی نام تک نہیں تھا۔ اور جب بیرونی اخبارات کے نامہ نگاروں نے کشمیر کے بارے میں خبریں بھیجنا چاہیں تو ان کے سامنے یہ سوال کھڑا ہو گیا کہ وہ کیا لکھیں کہ یہ ایجی ٹیشن کس کے اہتمام سے چل رہا ہے۔ اس پر نئی دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ "انڈین ایکسپریس" کے سرینگر میں مقیم نامہ نگار مسٹر جے این سادھو نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ یہ لکھا جائے کہ یہ ایجی ٹیشن ایک ایکشن کمیٹی چلا رہی ہے اور جب دوسرے دن نئی دہلی کے اخبارات میں ایکشن کمیٹی کا نام آیا تو منتشر قیادت اور لوگوں نے فوراً اسے اپنا لیا۔

۲۸ دسمبر کے تشدد آمیز واقعات کے بعد شہر یا دیہات میں اگرچہ تشدد کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہوا لیکن عوام کا جوش و خروش اور موئے مبارک کے واقعہ کی تحقیقات اور اس کی بازیابی کا مطالبہ برابر شدید ہوتا گیا۔ ہر روز صبح ہوتے ہی لوگوں کے چھوٹے بڑے جلوس نکلنا شروع ہو جاتے جن میں یہ مطالبہ دہرایا جاتا کہ موئے مبارک کو تلاش کر کے واپس کیا جائے۔ بخشی غلام محمد کی سرینگر میں آمد کے فوراً بعد انہوں نے اعلیٰ سرکاری اور پولیس افسروں سے صورت حال پر مشورہ کیا اور اس کے ساتھ ہی بہت سے سیاسی لیڈروں کو گرفتار کر لینے کا حکم دے دیا۔ ان میں خواجہ غلام محی الدین قرہ، خواجہ صدرالدین مجاہد، مولانا یاسین ہمدانی اور محاذ رائے شماری کے کچھ

دوسرے لیڈر شامل تھے۔ جب ان گرفتاریوں کے بارے اخباری نمائندوں نے وزیر اعظم مسٹر شمس الدین سے استفسار کیا تو انہوں نے اس سارے معاملے سے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اس بارے میں سرینگر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ہی معلومات حاصل کر کے کچھ بتا سکیں گے۔ ایک طرف موئے مبارک کی ایجی ٹیشن جاری تھی اور دوسری طرف ریاستی ایڈمنسٹریشن بالکل مفلوج ہو چکی تھی۔ مسٹر وشواناتھن اپنی حکومت کے چلا رہے تھے اور بخشی غلام محمد اپنی۔ وزیر اعظم اب بالکل برائے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ ــــ مسٹر شمس الدین جب حکومت ہند کے سیکرٹری مسٹر وشواناتھن کے ساتھ بعض معاملات کے بارے میں کچھ صلاح مشورہ کرنے گیسٹ ہاؤس گئے جہاں مسٹر وشواناتھن قیام پذیر تھے تو انہیں چالیس منٹ تک مسٹر وشواناتھن سے ملاقات کے لئے باہر گیسٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں انتظار کرنا پڑا۔ پولیس اور سول انتظامیہ کے اعلیٰ سرکاری افسر خاص طور پر مرکزی محکموں کے افسر ہدایات لینے براہ راست مسٹر وشواناتھن ہی کے پاس جاتے تھے۔ سرینگر میں ہڑتال کی وجہ سے چونکہ تمام چھاپہ خانے بند تھے، اس لئے کوئی اخبار بھی شائع نہیں ہو سکتا تھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اچانک شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ موئے مبارک واپس مل گئے ہیں اور بتایا گیا کہ کشمیر پولیس نے کنگن سے کچھ دور دو گوجروں کو گرفتار کیا ہے جو موئے مبارک لے کر بقول ان کے پاکستان جا رہے تھے۔ میں نے اس افواہ کے بارے میں کشمیر کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس شیخ غلام قادر گاندربلی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو مجھے بتایا گیا کہ وہ اپنے دفتر نہیں آتے اور انہوں نے تھانہ شیرگڑھی میں ایک خصوصی تحقیقاتی سیل قائم کر رکھی ہے اور وہ اپنا بیشتر وقت اسی تھانے ہی میں گذارتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ درگاہ حضرت بل کے ایک سرکردہ متولی خواجہ عبدالرحیم بانڈے جو اکثر و بیشتر موئے مبارک کا دیدار کرواتے تھے، کو پولیس پوچھ گچھ کے لئے لے گئی ہے۔ میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ موئے مبارک کے مل جانے کی یہ جو افواہ گشت لگا رہی ہے اس میں کس حد تک صداقت ہے؟ خود تھانہ شیرگڑھی گیا، جہاں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس شیخ غلام قادر سے علاوہ بہت پریشان سے تھے دوران گفتگو انہوں نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے مجھ سے یہ استفسار کیا کہ ــــ "اگر موئے مبارک واپس مل جائیں تو لوگ یہ تو نہیں کہیں گے کہ یہ وہ موئے مبارک نہیں ہیں؟" ــــ میں اس سوال پر ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا چنانچہ ڈی آئی جی نے مجھے

سے یہ بھی پوچھا کہ۔ کنگن والے دو گوجروں کی گرفتاری اور اُن سے موئے مبارک کی برآمدگی کی اطلاع کے بارے میں عوام میں کیا ردِ عمل ہوا ہے؟ ۔۔۔ اس پر میں نے خود بخود یہ اخذ کر لیا کہ دراصل یہ افواہ سرکاری حلقوں نے عوام کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے پھیلائی ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس جو موئے مبارک کی گمشدگی کی تحقیقات کرنے والی سیل سے وابستہ تھے، نے دو تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا ۔۔۔ موئے مبارک آ تو گئے ہیں لیکن ہمیں خدشہ یہ ہے کہ لوگ ان کا اصلی ہونا اگر تسلیم نہ کریں تو پھر کیا ہوگا؟ اس کے اگلے روز بخشی غلام محمد نہایت پُراسرار طور پر سرینگر سے بذریعہ ہوائی جہاز نئی دہلی گئے۔ اسی دوران پھر ایک دن صبح سویرے سارے شہر میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ موئے مبارک واپس مل گئے ہیں اور بتایا گیا کہ کسی شخص نے موئے مبارک کو معہ اپنے خول کے ایک دوشالے میں لپیٹ کر درگاہ حضرت بل کے قریب ایک خالی کشتی کے اگلے حصے پر رکھ دیا تھا اور خود فرار ہو گیا ہے۔ اس مرتبہ میں نے اس افواہ کی تصدیق حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ افواہ بھی عوام کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے ایک قسم کا ریہرسل ہوگی البتہ جب میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سے تحقیقات کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے تھانہ شیر گڑھی میں پھر گیا تو شیخ غلام قادر اپنے مخصوص کمرے میں پولیس افسروں سے مصروفِ گفتگو تھے۔ میری آمد کی اطلاع پاتے ہی اس مخصوص کمرے میں بیٹھے ہوئے اصحاب کو انہوں نے باہر جانے کے لئے کہا چنانچہ میں نے اُن سے بخشی صاحب کے اچانک دہلی جانے کے بارے میں کچھ جاننا چاہا تو انہوں نے یہ بتایا کہ۔۔۔ "موئے مبارک واپس مل چکے ہیں اور بخشی صاحب اُن کے خول کے نچلے حصے جو (بقول اُن کے) چاندی کا ہے، کی معمولی مرمت وغیرہ کروانے کے لئے نئی دہلی گئے ہیں۔ کل تک واپس آجائیں گے۔"

اس انکشاف پر میں خوفزدہ اور ششدر سا ہو کر رہ گیا اور میں نے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سے نہایت انکساری کے ساتھ یہ معلوم کرنا چاہا کہ جب موئے مبارک بازیافت ہو چکے ہیں تو اس کا باقاعدہ اعلان کیوں نہیں کیا جاتا؟ ۔۔۔ اس پر انہوں نے کہا ۔۔۔ ہمیں کچھ خدشات لاحق ہیں جب تک ہم یہ اطمینان حاصل نہ کر لیں کہ موئے مبارک کے اصلی ہونے کو چیلنج نہیں کیا جائیگا۔ ہم اس کی بازیافت کا اعلان نہیں کر سکتے

اور آپ بھی اس کا کسی سے تذکرہ وغیرہ نہ کریں"۔ ۲ جنوری کی صبح کو جب میں بخشی غلام محمد کی نئی دہلی سے واپسی پر اُن کی قیام گاہ پر اُن سے ملنے گیا تو بخشی صاحب اپنے کمرے میں شہر کے بعض علما اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے جو لوگ بخشی صاحب کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں میرواعظ خاندان کے مولوی محمد شاہ، مفتی رشید الدین اور اسی طرح کے کچھ دوسرے اصحاب بھی شامل تھے۔ اس سے ایک روز قبل ایجی ٹیشن چلانے کے لئے ایک باقاعدہ کمیٹی کا قیام عمل میں لانے کا اعلان کیا گیا تھا اور عوام سے کہا گیا تھا کہ وہ ۲ جنوری کو بعد دوپہر خانیار میں جمع ہو جائیں جہاں لیڈروں کی طرف سے ایک اہم اعلان کیا جائے گا۔ چنانچہ خانیار کے اس جلسے میں غیر معمولی حاضری تھی اور اس میں موئے مبارک کی واپسی کے مطالبے کے علاوہ اس کے حصول کا ایجی ٹیشن چلانے کے لئے "جمعیت حصول موئے مقدس" نام کی کمیٹی کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تاہم عام طور پر اسے ایکشن کمیٹی ہی کہا جاتا رہا۔ اس کمیٹی کا سربراہ مولوی فاروق کو بنایا گیا جس پر عوامی حلقوں نے زبردست تعجب کا اظہار کیا کیونکہ مولوی فاروق کمیٹی میں شامل دوسرے سرکردہ ممبروں میں سب سے کم عمر تھے۔ ۳ جنوری کی صبح کو میں پھر بخشی غلام محمد کی قیام گاہ پر اُن سے ملنے گیا۔ انہوں نے بات چیت کے دوران ایکشن کمیٹی کی تشکیل وغیرہ کے بارے میں اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "یہ کمیٹی مجھ سے صلاح مشورہ کر کے بنائی گئی ہے" بخشی صاحب نے گفتگو کے دوران خواجہ عبدالرحیم بانڈے کے بارے میں کہا کہ "یہ شخص ہمیشہ میرا سیاسی مخالف رہا ہے اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ میری والدہ کی وفات سے ایک دن پہلے خواجہ عبدالرحیم بانڈے موئے مبارک درگاہ حضرت بل سے مسکین باغ لائے تھے اور رحلت سے قبل میری والدہ کو دیدار کروایا تھا"۔ (بخشی صاحب کی والدہ کا انتقال مسکین باغ کے اس بنگلے میں ہوا تھا جس میں بخشی عبدالمجید رہائش پذیر تھا)۔

۴ جنوری کو ساڑھے چھ بجے شام اچانک اور ڈرامائی انداز میں سرینگر ریڈیو سے یہ اعلان کیا گیا کہ موئے مبارک واپس مل گئے ہیں۔ اس پُراسرار اعلان پر لوگ یکسر دم بخود اور ششدر ہو کر رہ گیے کیونکہ یہ اعلان بغیر کسی تفصیل کے ان مختصر الفاظ پر مشتمل تھا ۔۔۔ ۴ جنوری بعد دوپہر موئے مبارک

درگاہِ حضرت بل رکھے ہوئے پائے گئے۔ جہاں سے انہیں اٹھا کر متعلقہ اور واقف کار اصحاب کو دکھایا گیا اور انہوں نے ان کے اصل ہونے کی تصدیق بھی کر دی۔ اس بارے میں مزید چھان بین جاری ہے۔

یہ اعلان اگرچہ بڑے زور شور سے اور بار بار آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتا رہا لیکن کشمیری عوام نے اسے تسلیم نہیں کیا اور ہڑتال، ماتم، ایجی ٹیشن اور جلوسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ۵ جنوری ۱۹۶۴ء بروز اتوار شام کو مرکزی وزارت داخلہ کے سیکرٹری مسٹر وشواناتھن نے اخباری نامہ نگاروں کو گیسٹ ہاؤس میں بلایا اور انہیں بتایا کہ محکمہ سراغرسانی درگاہ حضرت بل کے واقعہ کی مزید تفتیش کر رہا ہے اور توقع ہے کہ دو یا تین دن کے اندر اندر ساری تفصیلات کا اعلان کر دیا جائے گا۔ جن اخباری نمائندوں کو گیسٹ ہاؤس بلایا گیا تھا ان میں کوئی مقامی اخباری نمائندہ شامل نہیں تھا اور بیرون ریاست سے شائع ہونے والے اخبارات کے سارے نامہ نگار غیر مسلم تھے۔ مسٹر وشواناتھن نے ان کو یہ بھی بتایا کہ ضروری کارروائی کے بعد یہ معاملہ عدالت میں پیش کر دیا جائے گا اور موئے مبارک کو دوبارہ درگاہ حضرت بل میں پہنچا دیا جائے گا۔ ان کے اس اعلان کے باوجود ایجی ٹیشن جاری تھا اور عوام نے اس اعلان پر بالکل کوئی یقین نہیں کیا چنانچہ ۶ جنوری کو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ شہر اور تمام قصبوں میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے اور حکومت نے ایجی ٹیشن کرنے والوں کو نہایت سختی سے دبانے کا فیصلہ کیا ہے۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنا کاروبار پھر سے شروع کریں ورنہ حکومت سخت کارروائی کرے گی۔ یہ سرکاری اعلان دراصل ۵ جنوری کو لال چوک میں جمعیت حصول موئے مقدس کے جلسہ عام میں پیش کئے گئے پانچ مطالبات کا جواب تھا۔ یہ پانچ مطالبات مندرجہ ذیل تھے۔

۱ ـــــ موئے مبارک کو دوبارہ حضرت بل میں رکھا جائے اور حکام انہیں اپنی تحویل میں نہ رکھیں۔

۲ ـــــ موئے مبارک کی باقاعدہ شناخت اور تصدیق کرنے کے لئے عوامی نمائندوں اور حکومت کی ایک مشترکہ کمیٹی بنائی جائے۔

۳ ـــــ اس واقعہ کی مزید تحقیقات مرکزی محکمہ سراغرسانی ہی کرے

۴ ـــــ اس واقعہ سے متعلق مقدمہ کی سماعت بیرون ریاست کا کوئی باوقار جج یا ہائیکورٹ

کے درجے کا جج کرے۔

۵ ـــــ تمام گرفتار کئے گئے لوگوں کو رہا کیا جائے۔

یہ پانچ مطالبات پیش کرنے کے ساتھ ہی اگرچہ کمیٹی نے عوام سے یہ اپیل کی کہ وہ ہڑتال ختم کریں اور کمیٹی کے اعلان کے بغیر کوئی جلسہ یا جلوس نہ ہو لیکن اس اپیل کے باوجود صورت حال غیر معمولی طور پر بے اعتمادی اور بے قراری کا شکار رہی۔ ۸ جنوری شام کو وزارت داخلہ کے سیکرٹری مسٹر وشواناتھن نے گیسٹ ہاؤس میں پھر اخباری نمائندوں کو طلب کیا۔ ان میں مقامی اخبارات کے نمائندے بھی مدعو تھے۔ اس پریس کانفرنس میں مسٹر وشواناتھن نے کہا کہ حکومت امن و قانون بنائے رکھنے کا عزم کر چکی ہے اور اگر ایجی ٹیشن ختم نہ کیا گیا تو حکومت طاقت استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔

جب میں نے مسٹر وشواناتھن کی توجہ اس طرف مبذول کروائی کہ لوگ موئے مبارک کی شناخت کا مطالبہ کر رہے ہیں! تو مسٹر وشواناتھن اس سوال پر کچھ بدحواس سے ہو گئے اور انہوں نے بپھرے ہوئے انداز میں میری طرف رخ کرتے ہوئے کہا — "جو شخص موئے مبارک کی شناخت کا مطالبہ کرتا ہے وہ پاکستان کی بولی بولتا ہے۔ حکومت اس قسم کی کسی کارروائی کی اجازت نہیں دے گی۔" مسٹر وشواناتھن موئے مبارک کی بازیابی یا یہ کہ انہیں کون لے گیا تھا اور کس طرح واپس مل گئے ہیں، کے بارے میں اخباری نمائندوں کے کسی ایک سوال کا بھی جواب نہیں دے سکے۔ البتہ ہر سوال کے جواب میں دھمکیاں دیتے رہے کہ لوگ ایجی ٹیشن کیوں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اخباری نمائندوں کے سوالات کے جواب میں مسٹر وشواناتھن نے کہا کہ اب ایجی ٹیشن یا احتجاجی مظاہروں کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے مرکزی وزارت داخلہ کے طرف سے جاری کئے گئے اس پریس نوٹ کی طرف توجہ مبذول کروائی جس میں صرف یہ کہا گیا تھا — "موئے مبارک لے جانے والوں نے خوفزدہ ہو کر خود انہیں اپنی جگہ پر رکھ دیا ہے۔"

اس کے تین دن بعد یعنی ۱۱ جنوری ۱۹۶۴ء کو مسٹر وشواناتھن نے دوبارہ اخباری نمائندوں کو گیسٹ

ہاؤس طلب کیا جہاں انہوں نے بتایا کہ موئے مبارک گزشتہ شب رات کے نو بجے درگاہ حضرت بل میں واپس اپنی جگہ رکھ دیئے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اعلان کیا کہ "اس خوشی میں ریاست میں تعطیل رہے گی اور میں نے ہدایات جاری کی ہیں کہ تمام سرکاری عمارتوں پر شام کو چراغاں کیا جائے۔" انہوں نے یہ بھی بتایا کہ موئے مبارک کو اب ایک آہنی صندوق میں رکھا گیا ہے اور اس صندوق کی چابیاں فی الحال انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر لچھمن داس ٹھاکر کے پاس رہیں گی۔ انہوں نے بتایا کہ سرکاری طور پر موئے مبارک واپس مل جانے کے اعلان پر لوگ جس بد اعتمادی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس اعلان کے خلاف جو تشدد آمیز مظاہرے ہو رہے ہیں انہیں نہایت سختی سے کچل دینے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ اس سارے معاملے میں "جمعیتِ حصولِ موئے مقدس" جس کے سربراہ مولوی فاروق اور سرکردہ لیڈر مولانا مسعودی تھے، کا رول بڑا پُراسرار اور مشتبہ رہا۔ وہ نجی مجلسوں میں اگرچہ سرکاری اعلان کو ناقابلِ قبول قرار دیتے تھے۔ لیکن پبلک جلسوں میں پُرامن رہنے اور ایجی ٹیشن ترک کرنے کی تلقین کرتے تاہم لوگ بار بار جلوس نکالتے اور تشدد آمیز مظاہرے کرتے رہے۔ ۱۳ جنوری کو مسٹر وشواناتھن نے پھر اخباری نمائندوں کو گیسٹ ہاؤس میں طلب کیا اور بتایا "میں کل نئی دہلی جا رہا ہوں تاکہ صورتِ حال پر حکومتِ ہند سے صلاح مشورہ کر سکوں تاہم میں نے یہاں امن و قانون بنائے رکھنے کا کڑا انتظام کر دیا ہے۔" جب اخباری نمائندوں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کروائی کہ عوام موئے مبارک کی شناخت اور تصدیق کا برابر مطالبہ کر رہے ہیں تو مسٹر وشواناتھن نے نادر شاہی انداز میں کہا ـــــ "میں اس معاملے کی کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا البتہ جو موئے مبارک بازیاب ہوئے ہیں وہ اصلی ہیں اور ان کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں کیا جانا چاہیئے۔ میں نے کچھ مرکزی افسروں کو صورتِ حال کی نگرانی کیلئے یہاں رکھا ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں جلدی ہی پھر لوٹ آؤں۔" انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ـــــ "ہو سکتا ہے کہ ۵ فروری کو موئے مبارک کا عام دیدار کروایا جائے۔ یہ تاریخ اس اوقاف کمیٹی نے مقرر کی ہے جس کے سربراہ بخشی غلام محمد ہیں۔"

ان کارروائیوں کے باوجود عوام میں غم و غصہ، تشویش اور ناراضگی برقرار تھی۔ چنانچہ ۱۸ جنوری کو مرکزی وزیر داخلہ مسٹر گلزاری لال نندہ نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں بتایا ـــــ "درگاہ حضرت بل سے موئے مبارک لیجانے والوں کے خلاف مقدمے کی کارروائی دو ہفتوں کے اندر اندر شروع ہو جائے گی۔ حکومتِ ہند کشمیر کی داخلی صورتِ حال

پر وادی کے سیاسی لیڈروں اور سرکاری افسروں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے اور میرا خیال ہے کہ مسٹر وشواناتھن کو دوبارہ کشمیر جانا پڑے گا۔" لیکن اس مرحلے پر بھی خود ہندوستان کے وزیر داخلہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ موئے مبارک کون لے گیا تھا۔ انہیں واپس اپنی جگہ کس نے رکھا اور اگر حکومت نے اس سلسلے میں کسی کو گرفتار کیا ہے تو وہ کون ہے اور مجرموں کی تعداد کیا ہے۔ اس پُراسرار خاموشی سے کشمیری عوام کو یقین ہو چکا تھا کہ اس معاملے میں ان کے ساتھ سراسر دھوکہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن وہ بے بس تھے کیونکہ تحریک کے راہنما بھی اس معاملے میں پُراسرار طرزِ عمل اختیار کئے ہوئے تھے۔

اسی دوران پاکستان کشمیر کا سوال سلامتی کونسل میں لے گیا اور ادھر کشمیری مسلمانوں کی طرف سے شروع کیا گیا ایجی ٹیشن حق بجانب قرار دیتے ہوئے کشمیر کے متعلق اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کرنے کا مطالبہ کیا جس سے حکومتِ ہند زیادہ پریشان ہو گئی چونکہ کشمیر میں ایجی ٹیشن جاری تھا۔ اس لئے مسٹر وشواناتھن ۲۵ جنوری کو دوبارہ سرینگر آگئے۔ یہاں آتے ہی انہوں نے کشمیری عوام کو یہ زبردست دھمکی دی کہ وہ ایجی ٹیشن سے اجتناب کریں ورنہ حکومت کو طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کے ایجنٹ عوام کو اکسا رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے زور و زبردستی کے باوجود وادی میں اگرچہ ہڑتال کھل گئی لیکن جو دکانیں صبح دس بجے کھلتی تھیں وہ چار بجے بطورِ احتجاج دوبارہ بند ہو جاتی تھیں اور اس طرح لوگ اپنی بد اعتمادی اور ناراضگی کا برابر اظہار کرتے رہے۔ مسٹر وشواناتھن نے نئی دہلی سے واپس آتے ہی مولوی فاروق اور مولانا مسعودی پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ سرینگر کی میونسپل حدود سے باہر نہیں جا سکتے۔ اس کے باوجود صورتِ حال ابتر ہی رہی چنانچہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو مجبوراً مسٹر لال بہادر شاستری جو اس وقت ان کی کابینہ میں وزیر بے محکمہ تھے، کو سرینگر بھیجنا پڑا۔ لال بہادر شاستری ۳۰ جنوری ۱۹۶۴ء کو سرینگر آئے اور یہاں انہوں نے مولانا مسعودی، ڈاکٹر فاروق عبداللہ، مولوی فاروق اور دوسرے علماء، بخشی غلام محمد، وزیر اعظم شمس الدین اور اعلیٰ سرکاری افسروں کے ساتھ الگ الگ ملاقاتیں کیں۔

مسٹر شاستری کی آمد کے دو دن بعد مولانا مسعودی نے مجھے بتایا ـــــ "حکومت کا یہ منصوبہ ہے کہ ۵ فروری

کو بربوست اور کٹے ہوئے ہیں اور مسلمہ روایات کے خلاف سرکاری اہتمام کے ساتھ موئے مبارک کا دیدار کروانے کا انتظام کیا جائے جس کے بہت بُرے نتائج نکل سکتے ہیں اور خون خرابہ ہو سکتا ہے"۔ چنانچہ میں اسی دن شام کو بخشی صاحب سے ملا میں نے انہیں بتایا کہ موئے مبارک کی باقاعدہ شناخت اور تصدیق کے بغیر دیدار کا اہتمام بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس معاملے پر خون خرابہ ہو لیکن بخشی صاحب موئے مبارک کی شناخت یا اس کی تصدیق کروانے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے اور انہوں نے کہا کہ — "ایسا کسی صورت میں نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہوا یعنی موئے مبارک کی شناخت اور تصدیق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو اس پر اس سے کہیں زیادہ خون خرابہ ہونے کا احتمال ہے جو شناخت اور تصدیق کے بغیر اس کے دیدار کے موقع پر ہو سکتا ہے۔ اس لئے آپ کو بھی چاہیئے کہ آپ شناخت اور تصدیق کی وکالت سے باز رہیں" —

میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ ان سے کہا کہ اگر اس معاملے کی باقاعدہ شناخت اور تصدیق نہ کروائی گئی تو یہ بہت بڑی بدقسمتی ہوگی کیونکہ اس طرح یہاں کے مسلمانوں میں نسل در نسل شک و شبہات اور اختلافات مدت تک رہیں گے۔ لیکن اس کے باوجود بخشی صاحب اپنے فیصلے پر قائم رہے اور کہا "موئے مبارک کی تصدیق اور شناخت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب لوگوں سے اس کی تصدیق یا شناخت کروائی جائے گی۔ وہ انہیں اصل تسلیم نہیں کریں گے۔ اور کوئی حکومت ایسا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں ہو سکتی"۔

اس کے اگلے دو روز کے اندر در پردہ اور خفیہ طور پر جو کچھ ہوتا رہا اس کے نتیجے میں ۳ فروری ۱۹۶۴ء کو نہایت پُراسرار اور ڈرامائی انداز میں اور بالکل اچانک طور پر مولانا محمد سعید مسعودی، مولوی محمد فاروق، شاہ کے سید میرک شاہ کاشانی اور ایکشن کمیٹی کے کچھ دوسرے ممبروں کو درگاہ حضرت بل پہنچایا گیا جہاں مسٹر لال بہادر شاستری ریاست کے وزیر اعلیٰ مسٹر شمس الدین، انسپکٹر جنرل پولیس اور بہت سے دوسرے اعلیٰ افسر بھی موجود تھے۔ چنانچہ درگاہ کے حجرۂ خاص کے باہر مسجد میں سب لوگ ادب و احترام کے ساتھ بیٹھ گئے اور ان سب کی موجودگی میں درگاہ کے ایک متولی خواجہ نور الدین بانڈے ایک صندوق اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے حجرۂ خاص سے باہر آئے جہاں سب لوگ موجود تھے۔ اُن کے آتے ہی مولانا مسعودی نے اُن کی طرف روئے سخن کرتے

انہوں نے کہا — "نور صاحب آپ اور ہم سب اس وقت خدا کے گھر میں ہیں اور قرآن کریم آپ کے سامنے کھلا رکھا ہوا ہے۔ اس لئے آپ جو کچھ کہیں گے، خدا کو حاضر و ناظر رکھ کر سچ کہیں گے" — اس پر نور الدین بانڈے نے کہا — "میں خدا اور رسولؐ کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ میری دانست میں یہ موئے مبارک رسول اللہؐ کے ہیں" — اس پر مسلمان حاضرین نے بلند آواز میں درود و سلام اور مولانا میرک شاہ صاحب کاشانی نے برجستہ طور پر یہ شعر پڑھا ؎

کیا شانِ احمدی کا چمن میں ظہور ہے
ہر گل میں ہر شجر میں محمدؐ کا نور ہے

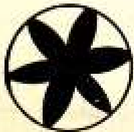
درگاہ حضرت بل میں تقریباً چالیس منٹ کی اس مختصر سی اور مخصوص تقریب کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ موئے مبارک کی شناخت اور تصدیق ہو گئی ہے اور اس کا دیدارِ عام ۵، اور ۶ فروری کو کروایا جا رہا ہے — اس اعلان کو لوگوں نے نہایت مجبوری، بے دلی، تذبذب، شک و شبہے اور محتاط طریقے پر سنا لوگوں کے دل اس اعلان کو سچ تسلیم نہیں کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خاموش رہے۔ اسی دن شام کو نئی دہلی میں اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے مسٹر لال بہادر شاستری کو امور خارجہ کا پورٹ فولیو عطا کیا ہے۔ تب تک مسٹر شاستری وزیر بے محکمہ تھے۔

سری نگر میں ۶ فروری کو عرس چہار یار کی تقریب سعید پر موئے مبارک کا دیدارِ عام کروایا جا رہا تھا اور ادھر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اسی دن کشمیر کے سوال اور موئے مبارک کی گمشدگی پر پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ہندوستان کے نمائندے مسٹر چھاگلہ کے درمیان بحث و تکرار ہو رہی تھی لیکن نہ تو کسی کو یہ بتایا گیا کہ موئے مبارک کون اٹھا کر لے گیا تھا اور نہ یہ بتایا گیا کہ انہیں واپس درگاہ حضرت بل میں کون چھوڑ گیا تھا۔ معاملہ بدستور پُراسرار بنا رہا اور جب کشمیر میں اضطراب بڑھ گیا تو ۱۲ فروری کو ہندوستان کے وزیر داخلہ مسٹر گلزاری لال نندا نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ درگاہ حضرت بل سے موئے مبارک کی چوری کے واقعہ کی تحقیقات مکمل کرنے میں ابھی ایک اور ہفتہ لگے گا اور اس کے فوراً بعد یہ معاملہ باقاعدہ کسی عدالت میں پیش

کر دیا جائے گا۔ ایوان میں ممبروں کے سوالات اور استفسار کے باوجود مسٹر نندہ اس واقعہ کی کوئی تفصیل نہیں بتا سکے البتہ انہوں نے صرف یہ بتایا کہ جن لوگوں نے یہ کام کیا تھا وہ پولیس کی تحویل میں آ گیا لیکن اُن کے نام نہیں بتائے جا سکتے۔ مسٹر گلزاری لال نندہ کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے بخشی غلام محمد نے سرینگر میں یہ کہا کہ شاید اب حکومتِ ہند اس معاملے سے کچھ سیاسی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی ہے کیونکہ وزیرِ داخلہ نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ اس معاملے میں جلد ہی پارلیمینٹ کے سامنے بعض ملزموں کا نام پیش کروں گا لیکن ہم اُن ملزموں کا نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ اُن کی گرفتاری ابھی عمل میں نہیں لائی گئی ہے۔ اس بیان سے معاملہ اور پیچیدہ اور پُراسرار بن گیا اور جب نئی دہلی کے سرینگر میں مقیم اہلکاروں نے کشمیری عوام میں بڑھتے ہوئے ہیجان اور شبہات کے بارے میں پھر حکومتِ ہند کو آگاہ کیا تو مسٹر گلزاری لال نندہ نے ۱۷ فروری کو پارلیمینٹ میں اعلان کیا کہ درگاہ حضرت بل سرینگر سے موئے مبارک لے جانے کے سلسلے میں اب تک تین اشخاص کو گرفتار کیا گیا ہے۔ ان میں ایک درگاہ حضرت بل کے بڑے متولی خواجہ عبدالرحیم بانڈے، دوسرا ترال کا عبدالرشید اور تیسرا قادر بٹ ہے۔ مسٹر نندہ نے ایوان کو بتایا کہ عبدالرشید کو اُس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ موئے مبارک اپنی جگہ پر واپس رکھنے کے لئے درگاہ حضرت بل آیا تھا اور قادر بٹ پاکستان آتا جاتا رہتا ہے۔ مسٹر نندہ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ قادر بٹ کہاں کا رہنے والا ہے اور اُسے کہاں پکڑا گیا تھا البتہ بعد میں کشمیر پولیس کے ایک متعلقہ افسر نے مجھے بتایا کہ درگاہ حضرت بل کے واقعہ میں قادر بٹ نام کا کوئی شخص گرفتار نہیں ہوا ہے البتہ خواجہ عبدالرحیم بانڈے اور ترال کا ایک سرکاری ملازم اسسٹنٹ ایگریکلچر افسر عبدالرشید جاری تحویل میں ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۳۰ جنوری کو کشمیر کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے دورانِ گفتگو یہ بھی مجھے بتایا تھا کہ یہ طے ہوا ہے کہ موئے مبارک کی بازیابی کا اعلان درگاہ حضرت بل کے متولی خواجہ عبدالرحیم بانڈے خود سرینگر ریڈیو سے نشر کریں گے۔ بانڈے صاحب اُس وقت پولیس کی تحویل میں تھے اور ترال کا عبدالرشید جو موئے مبارک کے ایجی ٹیشن سے پہلے اسسٹنٹ ایگریکلچر افسر تھا اور جسے موئے مبارک کی بازیابی کے کئی دن بعد حراست میں لیا گیا تھا۔ ایجی ٹیشن ختم ہونے کے کچھ ماہ بعد مبینہ طور پر دوبارہ ملازمت پر بحال کر دیا گیا۔

خواجہ عبدالرحیم بانڈے چند ماہ تک نظر بند رکھے گئے اور بعد میں انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور شاید وہ اب بھی ضمانت پر ہیں۔ خود وزیرِ داخلہ مسٹر گلزاری لال نندہ نے بھی موئے مبارک واپس مل جانے کے سرکاری طور پر اعلان کرنے کے پورے ڈیڑھ ماہ بعد یعنی ۱۷ فروری ۱۹۶۴ء کو پارلیمینٹ کے سامنے موئے مبارک کے واقعہ کے سلسلے میں تین ملزموں کے نام ظاہر کئے۔ یعنی خواجہ عبدالرحیم بانڈے، عبدالرشید اور قادر بٹ، اس کے صرف دو دن بعد یعنی ۱۹ فروری ۱۹۶۴ء کو انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ قادر بٹ جنگ بندی سرحد پار کر کے پاکستان چلا گیا ہے۔

اور پھر اس کے بعد نہ اس معاملے کی کوئی مزید تحقیقات ہوئی اور نہ کسی پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس طرح یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ موئے مبارک اپنی جگہ سے کون اُٹھا کر لے گیا تھا اور اسے واپس درگاہ حضرت بل میں کس نے پہنچایا۔ اگرچہ اس قدر اہم اور سنگین واردات میں ملوث ترال کے عبدالرشید کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ اُس نے خود خوفزدہ ہو کر موئے مبارک واپس درگاہ میں رکھے اور خواجہ عبدالرحیم بانڈے کو بھی ایک ملزم ظاہر کیا گیا تھا، پھر بھی یہ معاملہ نہ تو کسی عدالت میں پیش کیا گیا۔ نہ قانون کا منشا پورا کیا گیا اور نہ ہی کسی پر مقدمہ وغیرہ چلایا گیا۔ خواجہ عبدالرحیم بانڈے پر موئے مبارک کے دیدار کروانے کی پابندی عاید کی گئی، جسے بعد میں شیخ صاحب نے ہٹا دیا۔



۱۴



مسٹر لال بہادر شاستری جو سرینگر میں اپنا مشن پورا کر کے واپس نئی دہلی گئے تھے۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی ہدایت پر جموں کشمیر کی قیادت میں تبدیلی کی کوششوں کے لئے دوبارہ ۹ فروری کو جموں آئے۔ مسٹر شاستری نے جموں میں ریاستی اسمبلی کے ممبروں مسٹر شمس الدین اور غلام محمد صادق کے ساتھ طویل بات چیت کی۔ اس بات چیت میں مسٹر ڈی پی دھر، شاستری صاحب کے مشیر اعلیٰ تھے۔ اسی اثنا میں مولانا مسعودی اور مولوی فاروق کو بھی جموں بلایا گیا اور انہوں نے بھی مسٹر لال بہادر شاستری کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ اس گفت و شنید کے دوران مسٹر لال بہادر شاستری نے ریاستی اسمبلی کے ممبروں کو جواہر لال نہرو کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ مسٹر شمس الدین کی جگہ غلام محمد صادق کو لیڈر منتخب کریں۔ بات چیت کے بعد مسٹر شاستری دہلی گئے جہاں سے وہ ۲۹ فروری کی صبح کو پھر واپس جموں آئے اور اسی روز شام کو ریاست کی لیجسلیچر پارٹی نے شمس الدین کی جگہ غلام محمد صادق کو اپنا لیڈر منتخب کیا اور اس طرح نئی دہلی نے ریاستی قیادت کی باگ ڈور بخشی غلام محمد سے چھین کر غلام محمد صادق کے حوالے کر دی۔ اس کام میں سب سے اہم رول مسٹر درگا پرشاد دھر نے ادا کیا۔ چنانچہ لیڈر منتخب ہونے کے بعد غلام محمد صادق نے مسٹر ڈی پی دھر، سید میر قاسم اور گردھاری لال ڈوگرہ کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ لال بہادر شاستری کے مشورے پر غلام محمد صادق نے مسٹر ڈی پی دھر کو وزیر داخلہ بنایا۔ سید میر قاسم وزیر مال اور گردھاری لال ڈوگرہ وزیر خزانہ

مقرر ہوئے۔

ریاستی قیادت میں اس تبدیلی کے فوراً بعد پاکستان نے کشمیر کا سوال پھر سلامتی کونسل میں اٹھایا لیکن اقوام متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمائندے مسٹر چکرورتی نے سلامتی کونسل کے صدر کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں انہوں نے سلامتی کونسل میں کشمیر پر بحث میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے باوجود اور روس اور چیکوسلواکیہ کی مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے سلامتی کونسل نے کشمیر کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ۱۸ مارچ کی تاریخ مقرر کی۔ اس کے ساتھ ساتھ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی جو کشمیر سازش کیس کے سلسلے میں نظر بند تھے رہائی کی افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ اور جمعیت عمل موئے مقدس نے ۱۰ مارچ کو جامع مسجد میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں جمعیت نے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کا باقاعدہ مطالبہ پیش کر دیا۔ جلسے میں محاذ رائے شماری، پولیٹیکل کانفرنس، جماعت اسلامی، میر واعظ پارٹی اور دوسری جماعتوں نے مشترکہ طور پر ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔ اس قرارداد کی منظوری کے فوراً بعد وزیر اعظم غلام محمد صادق اور مسٹر ڈی پی دھر دہلی گئے اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے صلاح مشورہ کیا۔ مسٹر ڈی پی دھر دہلی سے سیدھے سری نگر آئے اور یہاں انہوں نے مولانا مسعودی اور کچھ دوسرے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ جمعیت عمل موئے مقدس کے بعض سرکردہ اراکین اور میر واعظ مولوی فاروق کے کچھ ساتھی بھی ڈی پی دھر سے ملے۔ ڈی پی صاحب چونکہ وزیر داخلہ تھے اس لئے انہوں نے بڑی چابک دستی کے ساتھ ایکشن کمیٹی کے بعض اہم اراکین کو گانٹھ لیا جس کا اظہار ۲۲ مارچ ۱۹۶۴ء کے اس جلسے میں ہوا جو جمعیت کے اہتمام سے زڈی بل سری نگر میں بلایا گیا تھا۔ اس جلسے میں میر واعظ پارٹی کے حامیوں نے شروع سے ہی نعرے بازی اور گڑبڑ شروع کر دی اور جب خواجہ غلام محی الدین قرہ اسٹیج پر آئے تو مولانا فاروق کے حامیوں نے جن کی راہنمائی مسٹر عبدالرحیم وازہ کر رہے تھے ان کی تقریر میں مداخلت کر کے جلسہ درہم برہم کر دیا۔ جلسہ گاہ پر لیڈروں کا کوئی قابو نہیں رہا اور جب افراتفری مچی تو کچھ لوگوں نے چند ایک لیڈروں کو سٹیج سے گھسیٹ کر نیچے پھینک دیا۔

زڈی بل کے اس واقعہ پر سب سے زیادہ مسرور ڈی پی دھر نظر آ رہے تھے اور وہ اگلے دن ہی یہاں سے

واپس جموں گئے اور اپنے رفقا کو تازہ ترین صورت حال سے باخبر کیا۔ ایک طرف تو پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز اسمبلی کے ممبر شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے لئے دستخطی مہم چلا رہے تھے اور عوام بھی شیخ صاحب کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن دوسری طرف "جمعیت عمل موئے مقدس" اس معاملے پر نہایت پراسرار طور پر خاموش تھی۔ اس کی اس پراسرار خاموشی اور اندر ہی اندر مختلف قسم کی سازشوں کے باوجود ۱۳ مارچ کو ریاست کے نئے وزیر اعظم غلام محمد صادق نے جموں میں ایک پریس کانفرنس میں یہ ڈرامائی اعلان کر دیا کہ انہوں نے کشمیر سازش کیس واپس لے لیا اور شیخ محمد عبداللہ کو غیر مشروط طور پر رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس اعلان سے نئی حکومت نے کشمیر میں ایک نئے اور تاریخی دور کا آغاز کیا۔ موئے مبارک ایجی ٹیشن کے نتیجے میں ۱۰ سال کی مسلسل اور کڑی پابندیوں کے قفل مسمار ہو گئے۔ عوام کی زبردست قوت نے اپنا لوہا منوا لیا۔ ہر قسم کی شہری آزادیاں بحال کر دی گئیں۔ سیاسی تقریروں اور اخبارات پر سے پابندیاں ختم کر دی گئیں اور اس نئی خوشگوار اور خوش آئند فضا میں ۸ اپریل کی صبح کو شیخ صاحب، مرزا افضل بیگ، صوفی محمد اکبر اور دوسرے سیاسی نظربند جیل سے رہا کر دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی سری نگر میں بنائی گئی تین ماہ پرانی "جمعیت عمل موئے مقدس" کی صفوں میں انتشار پھیلنا شروع ہو گیا۔ بظاہر یہ سب لوگ اتحاد اتحاد کی رٹ لگا رہے تھے لیکن اندر ہی اندر سر پھٹول ہو رہی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کو ۱۸ اپریل کو سری نگر آنا تھا لیکن پورے آٹھ دن تک استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل نہیں ہو سکی۔ مولوی فاروق کا مطالبہ تھا کہ استقبالیہ کمیٹی کا چیئرمین انہیں بنایا جائے۔ محاذ رائے شماری کے قائم مقام صدر مسٹر غلام رسول کوچک کا مطالبہ تھا کہ اس عہدے پر ان کا حق ہے اسی سر پھٹول کی بنا پر یہ تجویز پیش کی گئی کہ استقبالیہ کمیٹی کے دو چیئرمین ہوں لیکن اس پر بھی اتفاق نہیں ہو سکا۔ شیخ محمد عبداللہ ۱۸ اپریل کی بجائے ۱۷ اپریل کو سری نگر پہنچے جہاں لگ بھگ پانچ لاکھ لوگوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان کی رہائی اور سری نگر میں آمد کے صرف ایک ہفتہ بعد ۲۷ اپریل ۱۹۶۴ء کو وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے نئی دہلی میں کانگریس کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں یہ اعلان کیا کہ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کے سوال پر بات چیت کرنے کے لئے نئی دہلی آنے کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ وزیر اعظم ہند کی دعوت پر شیخ محمد عبداللہ ۲۹ اپریل کو نئی دہلی گئے۔ مرزا محمد افضل بیگ ان کے ہمراہ تھے جواہر لال نہرو اور شیخ محمد عبداللہ میں بات چیت جاری تھی کہ پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خان نے شیخ محمد عبداللہ کے نام ایک

مراسلہ بھیجا جس میں شیخ صاحب سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ پاکستان سے مشورہ کے بغیر کوئی اقدام نہ کریں اور اسی دوران میں شیخ محمد عبداللہ کو پاکستان آنے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔ چنانچہ ۶ مئی کو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ کشمیر کے مسئلے پر بات چیت کے لئے شیخ محمد عبداللہ پاکستان جا رہے ہیں۔ نئی دہلی میں مذاکرات کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۲۰ مئی کو واپس سری نگر آئے اور ہوائی اڈے پر نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ نئی دہلی میں مذاکرات کے دوران کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی بنیاد طے ہو گئی ہے۔

لیکن جواہر لال نہرو چل بسے

سری نگر میں ایک ہفتے تک قیام کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۲۰ مئی ۱۹۶۴ء کو پاکستان جانے کے لئے دہلی پہنچے جہاں سے وہ ۲۴ مئی کو ایک خاص طیارے میں راولپنڈی گئے۔ مرزا محمد افضل بیگ اور مولانا مسعودی اُن کے ہمراہ تھے۔

۲۵ مئی کو راولپنڈی کے ایوان صدر میں شیخ محمد عبداللہ اور صدر محمد ایوب خان کے درمیان بات چیت شروع ہو گئی۔ راولپنڈی میں بات چیت کے پہلے دور کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے اعلان کیا کہ کشمیر پر مذاکرات کے لئے صدر پاکستان محمد ایوب خان نئی دہلی جانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ بات چیت کے پہلے دور کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۲۶ مئی کو راولپنڈی سے مظفر آباد گئے جہاں وہ آزاد کشمیر کے لیڈروں سے بات چیت کرنا چاہتے تھے لیکن ۲۷ مئی کی صبح کو وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو چل بسے اور شیخ محمد عبداللہ اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر اسی روز واپس نئی دہلی آ گئے۔ جواہر لال نہرو کی موت کے بعد مسٹر لال بہادر شاستری ہندوستان کے وزیر اعظم بنائے گئے۔ اُن کے وزیر اعظم بننے کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے لال بہادر شاستری سے ایک طویل ملاقات کی لیکن یہ ملاقات بڑی مایوس کن رہی۔ چنانچہ شیخ محمد عبداللہ ۸ جون کو واپس سری نگر آ گئے۔ سری نگر واپس آنے کے بعد انہوں نے صورہ میں اپنی قیامگاہ پر مجھے بتایا —— "جواہر لال نہرو کی موت سے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی کوششوں کو زبردست ٹھیس لگی ہے اور نئی قیادت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ ان کوششوں کو جاری رکھ سکے"۔ اس کے بعد کشمیر کی سیاسی قیادت میں پھوٹ نمایاں ہونے لگی۔

چنانچہ ۲۰ جون کو مولوی فاروق نے اپنی الگ نئی سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کیا جس کا انہوں نے عوامی ایکشن کمیٹی نام رکھا اس پر جمعیت حصول موئے مقدس کے اراکین کو تعجب ہوا اور انہوں نے ۲۲ جون کو جمعیت کا ایک خصوصی اجلاس مجاہد منزل میں طلب کیا۔ اس اجلاس کی صدارت مولوی فاروق نے ہی کی اور اس میں اُن پر مسلمانوں کے اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کا الزام لگایا گیا اور انہیں جمعیت کی صدارت سے برطرف کر کے اس کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا اور اُن کی جگہ مولوی محمد عباس انصاری کو جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس واقعہ سے سری نگر میں شیخ محمد عبداللہ اور میرواعظ خاندان کے حامیوں کے درمیان پرانی "شیر بکرا" رقابت دوبارہ زندہ ہو گئی اور شہر میں مسلمانوں کے ان دو مکتب خیال کے لوگوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں اس جھگڑے میں ریاستی ایڈمنسٹریشن خاص طور پر مسٹر ڈی پی دھر اور سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد اور اُن کے حامی مولوی فاروق کے حامی تھے ——— مسٹر ڈی پی دھر امور داخلہ کے وزیر تھے اس لئے انہوں نے بڑی آسانی کے ساتھ میرواعظ منزل میں اپنا اثر و نفوذ بڑھا لیا تھا۔ کشمیر کی سیاسی قیادت میں اس پھوٹ کا پاکستان نے بڑا سنجیدہ نوٹس لیا۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے مسلم کانفرنس کے ایک سابق جنرل سیکرٹری آغا شوکت علی کو جو اُن دنوں حکومت پاکستان میں تعلقات عامہ کے افسر تھے اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے بہانے سرینگر بھیجا۔ آغا شوکت علی نے یہاں محاذ رائے شماری اور عوامی ایکشن کمیٹی کے لیڈروں سے کئی ملاقاتیں کیں اور انہیں صدر ایوب کا یہ پیغام پہنچایا کہ پاکستان کشمیر کی سیاسی قیادت کے انتشار سے ناخوش ہے۔ صورہ میں شیخ محمد عبداللہ سے طویل ملاقات کے بعد آغا شوکت علی نے مجھے اپنی قیامگاہ پر بتایا کہ مولوی فاروق سے اُن کی جو بات چیت ہوئی تھی انہوں نے اُس سے شیخ صاحب کو آگاہ کر دیا ہے۔ آغا شوکت علی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ "میں مولوی فاروق کے نام صدر ایوب کا یہ پیغام لایا ہوں کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ رہیں اور اُن کے ہاتھ مضبوط بنانے کی کوشش کریں اور مولوی فاروق نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ آئندہ اس ہدایت پر عمل پیرا رہیں گے"۔ چنانچہ اس کے ایک ہفتے بعد ہی مولوی محمد فاروق اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان صلح صفائی ہو گئی تاہم مولوی فاروق نے اپنی الگ پارٹی قائم رکھی۔

ہندوستان میں نئی قیادت نے جب تھوڑا سا اطمینان حاصل کر لیا۔ تو شیخ محمد عبداللہ پھر نئی دہلی گئے اور وزیر اعظم

مسٹر لال بہادر شاستری اور وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ اور کچھ دوسرے لیڈروں کے ساتھ ملاقاتیں کر کے یہ جاننا چاہا کہ کیا ہندوستان کشمیر کا تصفیہ کرنے کی کوششوں کو جاری رکھنے پر آمادہ ہے؟ لیکن انہیں یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ جواہر لال نہرو کی موت کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے ہیں اور اب ہندوستان کا کوئی بھی لیڈر کشمیر کے مسئلے کو چھونے تک کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے مایوس ہو کر بیرونی ممالک کا دورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بظاہر یہ اعلان کیا کہ وہ حج کا فریضہ ادا کرنے جا رہے ہیں۔ دلی میں ایک ہفتہ گزار کر وہ واپس سرینگر آگئے تب تک نئی دہلی اور اُن کے درمیان یا ریاستی حکومت اور اُن کے درمیان کوئی اعلانیہ ٹکراؤ نہیں تھا لیکن صورت حال اُس وقت اچانک بدل گئی جب ۱۵ جنوری ۱۹۶۵ء کو شیخ محمد عبداللہ نے درگاہ حضرت بل میں "ترک موالات" کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اس تحریک کا یہ مقصد تھا کہ جو لوگ کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کی مخالفت کرتے ہیں اُن کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے۔ اس تحریک کے شروع ہوتے ہی وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کی حکومت اور اُن کی کانگریس پارٹی کے حامیوں اور محاذ رائے شماری کے حامیوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں اور ایک محاذ آرائی کا سا ماحول پیدا ہو گیا۔ "ترک موالات" کی تحریک سری نگر کے علاوہ وادی کے سارے قصبوں یہاں تک کہ گاؤں گاؤں میں پھیل گئی اور کانگریسی لیڈروں کے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کوئی کانگریسی لیڈر انتقال کر جاتا تو لوگ اُس کی نماز جنازہ میں شامل نہ ہوتے۔ اُس کی تجہیز و تکفین میں حصہ نہ لیتے۔ لوگوں نے کانگریس کے ممبران اسمبلی، عہدیداروں اور ممبروں کے ساتھ رشتے ناطے کرنا ترک کر دیئے۔ بہت سے کانگریسی عہدیداروں نے یہ شکایت کی کہ حجام اُن کی حجامت تک نہیں بناتے۔ سوشل بائیکاٹ کی اس تحریک کا نئی دہلی نے بھی سخت نوٹس لیا اور ریاستی حکومت کو اس کے خلاف ہر ممکن کاروائی کرنے کی ہدایت دی۔ چنانچہ اس سلسلے میں سینکڑوں لوگوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ یہ گرفتاریاں زیادہ تر ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت عمل میں لائی گئیں۔ اسی دوران شیخ محمد عبداللہ ۵ فروری ۱۹۶۵ء کو مرزا محمد افضل بیگ اور بیگم عبداللہ کے ہمراہ زیارت بیت اللہ کے لئے روانہ ہو گئے اور صوفی محمد اکبر کو قائم مقام صدر محاذ رائے شماری بنایا گیا۔ لیکن اصل میں شیخ صاحب نے عوام کی قیادت کے لئے مولانا مسعودی اور مولوی محمد فاروق کو مشترکہ ذمہ داری سونپی اور جامع مسجد سری نگر میں عوام سے کہا کہ وہ اُن کی غیر حاضری میں ان کو

لیڈروں کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ کی روانگی کے بعد صورت حال کچھ بدل سی گئی اور ریاست کی کانگریسی حکومت نے محاذ رائے شماری کے لیڈروں کے خلاف ایک سیاسی مہم سی شروع کر دی۔ چنانچہ شیخ محمد عبداللہ لندن میں تھے کہ ۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو محاذ رائے شماری کے تمام لیڈروں اور اہم کارکنوں جن کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ صوفی اکبر کی گرفتاری کے بعد منشی محمد اسحاق کو محاذ کا قائم مقام صدر بنایا گیا۔

شیخ محمد عبداللہ انگلستان کے علاوہ مصر اور الجزائر بھی گئے۔ قاہرہ میں انہوں نے صدر ناصر کے علاوہ مصر کے نائب صدر حسین شافعی، مصری پارلیمنٹ کے سپیکر انور سادات اور الاہرام کے چیف ایڈیٹر حسنین ہیکل کے ساتھ کشمیر کے معاملے پر تبادلہ خیال کیا۔ قاہرہ سے وہ الجزیرہ گئے جہاں انہیں الجزائر کے اُس وقت کے صدر مسٹر احمد بن بلا نے اُس دعوت پر مدعو کیا جو الجزائر کے صدر نے چین کے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی کے اعزاز میں دی تھی۔ مسٹر چو این لائی ان دنوں الجزائر کے دورے پر تھے۔ اسی دعوت میں شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر چو این لائی کے درمیان کشمیر کے معاملے پر تبادلہ خیال ہوا۔ مسٹر چو این لائی کے ساتھ اس ملاقات کا نئی دہلی نے انتہائی سخت نوٹس لیا اور پارلیمنٹ میں وزیر اعظم لال بہادر شاستری سے اس بات کی وضاحت طلب کی گئی کہ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کو بیرونی ممالک کا دورہ کر کے ہندوستان کے دشمنوں سے ساز باز کرنے کا موقع کیوں فراہم کیا؟ اس معاملے پر نئی دہلی میں ایک ہنگامہ سا کھڑا کیا گیا۔

شیخ محمد عبداللہ الجزائر سے سیدھے مکہ معظمہ گئے۔ جہاں انہوں نے حج کرنے کے علاوہ شاہ فیصل سے کشمیر کے مسئلے پر دو بار گفت و شنید کی۔ چنانچہ نئی دہلی نے سعودی عرب میں اپنے سفیر کے ذریعے شیخ محمد عبداللہ کو یہ وارننگ دی کہ اگر وہ فوراً واپس نہ آگئے تو اُن کا پاسپورٹ منسوخ کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے سفیر نے شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کے سعودی عرب میں مزید قیام کی مدت میں توسیع کرنے سے انکار کر دیا۔ ساری صورت حال پر غور کرنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے واپس ہندوستان آنے کا فیصلہ کیا۔





مولوی محمد فاروق



کشمیر ایکارڈ کے خلاف سری نگر میں زبردست احتجاج



وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی اور صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو شملہ میں





اقتدار میں واپسی ___ گورنر مسٹر ایل کے جھا جموں میں شیخ محمد عبداللہ کو ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ کا حلف دلا رہے ہیں



کئی سال جیل میں بارہ برس کی نظر بندی کے بعد جنوری ۱۹۷۵ء میں رہائی۔ سرینگر پہنچنے
پر شیخ محمد عبداللہ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔



صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں



کشمیر ایکارڈ کے بعد پہلی غیر ملکی شخصیت انڈونیشیا کے وزیر خارجہ اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر ڈاکٹر آدم ملک صورت حال کا مشاہدہ کرنے کشمیر آئے۔



سبکدوش ہونے والے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم سرینگر میں نئے براڈوے ہوٹل کا افتتاح کر رہے
ہیں اور نئے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ تالی بجا کر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔



منشی محمد اسحاق



سید میر قاسم ۔ جون ۱۹۷۲ء سے فروری ۱۹۷۵ء تک وزیر اعلیٰ رہے



ڈی پی دھر



مولانا محمد سعید مسعودی



سردار محمد ابراہیم خان
جنہیں ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائم کی جانے والی
متوازی حکومت کا صدر بنایا گیا



مسٹر کے۔ ایچ۔ خورشید
یہ بھی آزاد کشمیر کی صدارت کے عہدے پر فائز رہے



یوراج ڈاکٹر کرن سنگھ۔ ڈوگرہ حکمران خاندان کی آخری شخصیت جنہیں موروثی
حکمرانی کے خاتمہ پر جموں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی نے پہلا صدر ریاست منتخب کیا۔



بریگیڈیر محمد حیات خاں، جنہیں جنرل ضیاء نے آزاد کشمیر کا صدر بنایا



جی۔ پارتھا سارتھی



وزیراعظم مسز اندرا گاندھی جن کی کامیاب سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے
۱۹۷۵ء کا کشمیر ایکارڈ طے پایا۔



مسٹر لال بہادر شاستری، جنھوں نے فروری ۱۹۶۴ء میں موئے مبارک کی
ایجی ٹیشن کو ختم کروانے اور کشمیر میں ایک نئے دور کا آغاز کرنے میں اہم رول ادا کیا۔



شملہ کا وہ بنگلہ، جہاں وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی اور صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو میں مذاکرات ہوئے



جناب ذوالفقار علی بھٹو، جنہوں نے پاکستان کا وزیر خارجہ بننے کے بعد
اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے پر آٹھ مرتبہ بحث کی۔

۱۳



شیخ محمد عبداللہ ۸ مئی ۱۹۶۵ء کو جب مرزا محمد افضل بیگ اور بیگم شیخ محمد عبداللہ کے ہمراہ پالم کے ہوائی اڈے پر اترے تو انہیں ہوائی اڈے سے باہر نہیں آنے دیا گیا اور ہوائی اڈے پر ہی گرفتاری اور نظربندی کے احکامات پہنچائے گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ حکومت کے احکامات کے تحت انہیں نئی دہلی سے جنوبی ہندوستان کے ایک چھوٹے سے قصبے اوٹاکمنڈ بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں انہیں نظربند رکھا جائے گا۔ چنانچہ شیخ صاحب اور مسٹر بیگ کو اوٹاکمنڈ پہنچایا گیا اور بیگم عبداللہ نئی دہلی میں ٹھہریں۔ حکومت کے اس اقدام کا کشمیر میں شدید ردعمل ہوا اور حسب روایت عوام کے احتجاج کو لاٹھیوں اور گولیوں سے دبا دیا گیا اور بے شمار لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی سرینگر سے شائع ہونے والے دو اخبارات جن میں محاذ رائے شماری اور عوامی ایکشن کمیٹی کے ترجمان اخبارات بھی شامل تھے، کی اشاعت پر ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت پابندی عاید کر دی گئی۔ ۹ مئی بعد دوپہر سرینگر کی جامع مسجد میں جب لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد احتجاج کے لئے مسجد میں جمع ہو گئی تو مشتعل

پولیس نے مسجد میں داخل ہو کر لاٹھیاں برسانا شروع کیں اور لوگوں کو منتشر کر دیا۔ اسی حملے میں مولانا مسعودی کے دانت توڑ دیئے گئے اور بعد میں انہیں بے ہوشی کی حالت میں جامع مسجد سے اٹھا کر سرینگر کے نرسنگ ہوم میں علاج کے لئے داخل کیا گیا۔ اس کے بعد پوری تحریک کی قیادت اُن کے ہاتھ میں آگئی۔ چنانچہ انہوں نے محاذ رائے شماری، پولیٹیکل کانفرنس اور ایکشن کمیٹی کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کر شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے لئے ۹ جون ۱۹۶۵ء سے سول نافرمانی کی ایک تحریک شروع کر دی۔ اسی دوران تحریک کا پہلا جتھہ پولیٹیکل کانفرنس کے خواجہ غلام احمد میر کی سرکردگی میں سفید کپڑوں میں ایک سفید پرچم اٹھائے ہوئے بعد دوپہر لال چوک میں نمودار ہوا اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ اس موقعے پر لال چوک میں ہزاروں لوگ جمع تھے جب کہ میر صاحب اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ پُر امن طور مارچ کرتے ہوئے لال چوک میں پہنچے تو پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ سول نافرمانی کی یہ تحریک بڑے شد ومد سے چلائی گئی اور بے شمار لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتار کروانے کے لئے اپنے نام مجاہد منزل میں درج کروائے۔ مجاہد منزل تحریک کا پھر صدر مقام بنایا گیا۔ سول نافرمانی کی یہ تحریک جاری تھی کہ اسی دوران مرزا محمد افضل بیگ کو خرابیٔ صحت کی بنا پر اوٹاکمنڈ سے نئی دہلی اور پھر وہاں سے سری نگر کارشاہ کے قریب ایک بنگلے میں نظر بند رکھا گیا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں سرینگر اور وادی کے دوسرے حصوں میں یہ افواہیں عام ہو گئیں کہ کشمیر میں مسلح پاکستانی داخل ہو چکے ہیں۔ حکومت کو اعلیٰ ترین سطح پر مسلح پاکستانیوں کی آمد کا علم ہو چکا تھا۔ جیسا کہ پہلے ہی سے سرینگر اور دہلی کے درمیان صلاح مشورہ ہو رہا تھا۔ وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق نے ۸ اگست کی صبح کو ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ مسلح پاکستانیوں کی آمد کی سب سے پہلے اطلاع انہیں ملی ہے۔ یہ اطلاع انہیں اپنے ایک خصوصی ذریعے سے ملی تھی لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ذریعہ کون تھا۔ سری نگر میں ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ تحریک کے قائدین کی ہدایت پر شہر اور دوسرے قصبوں میں ۹ اگست کو مکمل ہڑتال کی گئی۔ اس سے پہلے ۸ اگست کی شام کو تحریک کے قائدین کا ایک اجلاس ہوا جس میں جلسہ کرنے کا پروگرام اچانک تبدیل کیا گیا۔ پہلے ۹ اگست کے جلسے کے لئے خانیار کا مقام مقرر تھا لیکن اس اجلاس میں نہایت پُر اسرار طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ جلسہ مجاہد منزل میں ہی منعقد کیا جائے۔ مجاہد منزل میں جو جلسہ منعقد ہوا

اس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مسعودی نے لوگوں سے کہا — "آپ کو چاہئے کہ آپ ہر قیمت پر امن و قانون برقرار رکھیں۔ افواہوں پر بھروسہ نہ کریں۔ خود اپنی زبان سے کچھ نہ کہیں۔ آپ کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے اور آپ کے مشاہدے میں جو کچھ آ رہا ہے اُسے خاموشی کے ساتھ دیکھیں۔ وقت بڑا نازک ہے اور اس میں آپ کی کوئی معمولی سی غلطی آپ کے لئے مصیبتوں کا باعث بن سکتی ہے۔ ہم پُر امن لوگ ہیں اور اپنے معاملے امن و قانون کے اندر سلجھانا چاہتے ہیں" — مولانا کی اس تقریر کا عوام پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوا، اور لوگ خوف و تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ ۱۰ اگست کی رات کو شہر کے گرد و نواح میں وقفے وقفے سے فائرنگ ہوتی رہی۔ اور ۱۱ اگست کو سری نگر کے ایک نواحی علاقے بمنہ میں مسلح پاکستانیوں اور ہندوستان کی بارڈر سکیورٹی فورس کے درمیان باقاعدہ گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ گولیاں چلنے کی اس گونج سے سرینگر میں مزید افراتفری پھیلی۔ مسلح حفاظتی دستے سول سیکریٹریٹ، سرکردہ کانگریسی لیڈروں، وزیروں اور اعلیٰ افسروں کی قیام گاہوں پر متعین کر دیئے گئے۔ شہر میں جگہ جگہ سی۔ آر۔ پی کے مسلح سپاہی نظر آتے تھے۔ شہر کے تمام اہم ناکوں، سرینگر کے ریڈیو سٹیشن، ہوائی اڈے اور پولیس کنٹرول روم کے اندر اور باہر مسلح سپاہی ہی سپاہی نظر آ رہے تھے۔ تحریک کے قائدین نہایت پُر اسرار طور پر اپنے اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اسی دوران "صدائے کشمیر" نام کے ایک نئے ریڈیو سٹیشن سے یہ پیغام نشر ہوا کہ کشمیر میں لوگوں نے مسلح بغاوت کر دی ہے۔ ادھر "صدائے کشمیر" سے بار بار مسلح بغاوت کا اعلان نشر ہو رہا تھا اور ادھر وادی میں سرینگر کے علاوہ بٹہ مالو، بلگام، بیروہ، گاندربل، گلمرگ، بابوسرگ اور اسی طرح کے کچھ مقامات پر لڑائی ہو رہی تھی۔ ۱۲ اگست کی صبح کو ہندوستانی فوج کے اعلیٰ کمانڈروں اور ریاستی وزیر اعلیٰ اور اُن کے بعض رفقاء کے درمیان ایک ملاقات میں یہ ——— طے کیا گیا کہ چونکہ سری نگر کے ایک حصّے بٹہ مالو جہاں صادق صاحب کا آبائی گھر بھی تھا، پر مسلح پاکستانیوں کا قبضہ ہو چکا ہے اس لئے اس سارے علاقے کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ چنانچہ اُسی دن شام کو بٹہ مالو کا سارا علاقہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ساری وادی میں جگہ جگہ گولیاں چلنے اور مسلح جھڑپیں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پُر اسرار سیاسی دھماکہ بھی ہوا، وہ یہ کہ الحاج منشی محمد اسحاق نے ۱۳ اگست کو نہایت ڈرامائی انداز میں محاذ کی صدارت

سے استعفا دیدیا۔ میں نے صورتِ حال جاننے کے لئے منشی صاحب سے فوری طور پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن میں ۱۰ اگست سے پہلے ان تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ منشی محمد اسحاق تحریکِ آزادی کے ایک اہم رکن اور بڑے مضبوط ارادے کے شخص تھے اور انہیں مجھ پر کچھ اعتماد بھی تھا۔ میں ۱۰ اگست کی شام کو نوا پورہ سری نگر میں ان کی قیام گاہ پر ان سے ملا۔ وادی کی تازہ ترین صورتِ حال پر مختصر سی گفتگو کے بعد میں نے منشی صاحب سے پوچھا کہ وہ محاذ کی صدارت سے کیوں الگ ہونا چاہتے ہیں! ـــــ میرے اس سوال پر منشی محمد اسحاق کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے نہایت دل آزارانہ انداز میں کہا ـــــ "ہماری آزادی کا ایک بہترین موقع کھو دیا گیا ہے۔ کسی نے میری بات نہیں مانی اور ہر شخص نے محض اپنی اپنی ذات محفوظ رکھنے کے لئے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔"
میں نے بڑی انکساری کے ساتھ ان سے اس منصوبے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا ـــــ "یہ طے پایا تھا کہ ہم اس موقع پر لاتعلق نہیں رہیں گے۔ ہمارے ساتھ پاکستان والوں کی بات چیت ہوئی تھی اور میں نے ذاتی طور پر ان کے منصوبے کے ساتھ اتفاق بھی کیا تھا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اچانک کارروائی کر کے سری نگر کے ہوائی اڈے، ریڈیو اسٹیشن، پولیس تھانہ مہاراج گنج، پولیس تھانہ خانیار اور صدر پولیس اسٹیشن پر قبضہ کر لیں گے اور ہم پر یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ ہم اس کے لئے رائے عامہ کی حمایت حاصل کریں تاکہ ہندوستان کے لئے کشمیر کا کوئی با عزت تصفیہ کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ جائے اور یہ جو "صدائے کشمیر" ریڈیو سے مسلح بغاوت کا پیغام نشر ہو رہا ہے یہ حقیقی اور عملی شکل اختیار کر لے لیکن ہم نے گو مگو، تذبذب اور بزدلی کی وجہ سے تعاون نہیں کیا۔" ـــــ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن بھی تھا؟ تو انہوں نے بتایا کہ "وہ لوگ اس کا پورا انتظام کر چکے تھے۔ ہوائی اڈے پر قبضے کے لئے ساری نفری بڈگام پہنچ چکی تھی اور باقی مقامات کا انتظام سنبھالنے کے لئے بھی اچھی خاصی تعداد میں سامان اور نفری کاشہر میں لائے گئے تھے۔" ـــــ اس موقعے پر منشی محمد اسحاق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کھڑا ہوا، اور ان سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ صدارت سے مستعفی ہونے کا اٹل ارادہ رکھتے ہیں؟ تو انہوں نے بتایا "اگر میں نے محسوس کیا کہ میرے الگ ہونے سے عوام کو تکلیف پہنچے گی تو میں اپنا استعفا واپس

لینے سے نہیں ہچکچاؤں گا۔"

ایک اندازے کے مطابق جولائی کے آخری اور اگست کے پہلے ہفتے میں آزاد کشمیر سے مختلف دروں اور راستوں کے ذریعے تقریباً دس ہزار مسلح افراد وادی میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے پاس کافی تعداد میں ایمونیشن تھا۔ یہ مسلح افراد جن کی زیادہ تر تعداد آزاد کشمیر کے نوجوانوں پر مشتمل تھی اور جو ریاست جموں کشمیر ہی کے باشندے تھے، خود کار رائفلوں، سٹین گنوں، چھوٹی مشین گنوں اور دوسرے جدید قسم کے آتشیں اسلحے سے مسلح تھے۔ ان کے خلاف سیکورٹی فورس کی کارروائی کی نگرانی کے سلسلے میں نئی دہلی نے یکے بعد دیگرے وزیر داخلہ مسٹر نندہ، وزیر دفاع مسٹر وائی بی چوان، حکومت کی وزیر اطلاعات مسز اندرا گاندھی اور خود ہندوستان کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی کشمیر آئے۔ فوج کے سربراہ اس ساری صورتِ حال کے دوران کشمیر ہی میں رہے لیکن یکم ستمبر کو وہ اچانک یہاں سے ایک فوجی طیارے میں دہلی گئے۔
۲ ستمبر ۱۹۶۵ء بعد دوپہر نئی دہلی میں ایک سرکاری ترجمان نے بتایا کہ پاکستان کی باقاعدہ فوج کا ایک بریگیڈ جس کے ساتھ بکتر بند دستے اور ٹینک بھی ہیں، جموں میں چھمب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے صرف ایک گھنٹے بعد ہندوستان کے وزیر دفاع نے کانگریس پارلیمانی پارٹی کی مشاورتی کمیٹی میں اعلان کیا "پاکستان نے چھمب کے علاقے میں بہت بڑے پیمانے پر حملہ کر دیا ہے اور پانچ میل تک پیش قدمی کی ہے۔ ہم نے فضائی بیڑے کو حکم دیا ہے کہ وہ پیش قدمی کرنے والی فوج پر بمباری کرے۔" ۳ ستمبر کو جب کہ پاکستان کی پیدل فوج اکھنور کی طرف بڑھ رہی تھی، چھمب سیکٹر میں ایک زبردست فضائی جنگ ہوئی جس میں پاکستان نے امریکی ساخت کے بمبار اور ایف ۸۶ طیارے استعمال کئے۔ دوسری جانب ٹیٹوال اور اوڑی سیکٹر میں بھی پاکستان کی فوج نے بڑے پیمانے پر حملہ کر دیا۔ ۳ اور ۴ ستمبر تک جنگ جموں کشمیر تک محدود رہی لیکن ۵ ستمبر کو ہندوستان کی فوج لاہور سیکٹر میں پاکستان کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ ۶ ستمبر کی دوپہر کو پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خان نے اپنے ایک ریڈیائی نشریے میں اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ـــــ "ہم ہندوستان کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں اور ہندوستان نے لاہور کی جانب سے پاکستان پر بڑے پیمانے پر حملہ کر دیا ہے۔" ـــــ صدر ایوب خان نے اپنی اس نشری تقریر میں یہ بھی کہا کہ ہندوستان کے بمبار طیاروں نے پاکستان کے کئی فوجی

اور شہری ٹھکانوں پر بھی بمباری کی ہے۔ اس کے اگلے دن ہندوستان کی فوج راجستھان کی سرحد پر باڑمیر کے علاقے سے پاکستان میں داخل ہوگئی۔ دونوں جانب بڑے پیمانے پر بری اور فضائی جنگ چھڑنے کا اقوامِ متحدہ اور ساری دنیا میں بلا تاخیر ردِ عمل ہوا۔ ۹ ستمبر کو اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کی فوج سیالکوٹ میں بین الاقوامی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہوگئی ہے۔ جموں میں پاکستان کی فوج ہوائی حملوں اور زبردست مزاحمت کے باوجود ۱۸ میل تک پیش قدمی کر چکی تھی چھمب کا سارا علاقہ اس کے قبضے میں چلا گیا تھا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ اکھنور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پاکستان کے علاقوں میں ہندوستانی فوج کی پیش قدمی سے عرب اور اسلامی ممالک میں بڑا شدید ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ انڈونیشیا میں عوام کے ایک بہت بڑے ہجوم نے جن میں زیادہ تر طلبا شامل تھے، ہندوستان کے سفارت خانے پر حملہ کر دیا اور پاکستان کی حمایت میں مظاہرے کئے۔ وزیرِ اعظم ایران اچانک انقرہ جا پہنچے جہاں انہوں نے اس جنگ سے پیدا شدہ صورتِ حال پر ترکی کے وزیرِ اعظم کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔ طہران میں وزارتِ خارجہ کے ایک ترجمان نے اعلان کیا کہ ایران اس جنگ میں پاکستان کا ساتھ دے گا اور اس کی ہر ممکن امداد کرے گا۔ (۱)

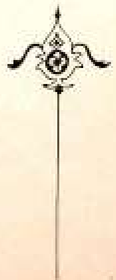
ادھر اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ نیویارک سے اچانک راولپنڈی پہنچے اور پھر وہاں سے نئی دہلی گئے۔ امریکہ اور برطانیہ اس جنگ میں مکمل طور پر غیر جانبدار رہے جب کہ روس ہندوستان کی ہر طرح مدد کر رہا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے پاکستان سے صلاح مشورہ کر لینے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ دونوں ممالک جنگ بند کر دیں اور کشمیر کی متنازعہ ریاست میں اقوامِ متحدہ کی فوج متعین کی جائے لیکن نئی دہلی نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ البتہ نئی دہلی نے جنگ بندی پر آمادگی کا اظہار کر دیا جبکہ پاکستان نے اوتھانٹ کی جنگ بندی کی تجویز کے جواب میں ایک تین نکاتی منصوبہ پیش کیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جنگ بندی سے قبل یہ تسلیم کیا جائے کہ جنگ بندی کے فوراً بعد جموں کشمیر سے ہندوستان اور پاکستان کی مسلح افواج نکل جائیں گی اور ان کی جگہ اقوامِ متحدہ کی مسلح فوج متعین کی جائے گی اور اس کے بعد تین ماہ کے اندر اندر ریاست میں رائے شماری کروائی جائے گی۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ راولپنڈی اور نئی دہلی میں گفت و شنید کے بعد

۱۹ ستمبر کو واپس نیویارک جا پہنچے جہاں انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ اور دوسرے متعلقہ معاملات پر غور کرنے کے لئے سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کے لئے کہا اور یہ تجویز پیش کی کہ سیکورٹی کونسل دونوں ملکوں کو جنگ بند کرنے کا حکم دے۔ ان کی تجویز کے مطابق ۱۷ ستمبر کی رات کو سیکورٹی کونسل کا ایک خصوصی اجلاس ہوا جس میں اوتھانٹ نے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے ساتھ اپنی بات چیت کے بارے میں ایک رپورٹ کونسل کو پیش کی۔ اوتھانٹ نے سیکورٹی کونسل میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ وہ دونوں ممالک سے یہ کہے کہ وہ جنگ بندی کے فوراً بعد ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشن بحال کر دیں۔ کونسل میں بعض ممبروں کی طرف سے اس تجویز کی حمایت کی گئی کہ کشمیر کا جھگڑا طے کرنے کے لئے دونوں ممالک وہاں سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں اور ان کی جگہ اقوامِ متحدہ کی فوج متعین کی جائے لیکن مسٹر محمد علی کریم چھاگلہ، جو کونسل میں ہندوستان کی نمائندگی کر رہے تھے، نے یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا، ادھر پیکنگ میں ایک سرکاری اعلان جاری کیا گیا جس میں چین نے یہ الٹی میٹم دیا کہ اگر ہندوستان نے پاکستان کے خلاف جنگ بند نہ کی تو وہ ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ اس کے فوراً بعد سلامتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے ۲۰ ستمبر کو ہندوستان اور پاکستان سے فوری جنگ بند کرنے کی اپیل کی۔ قرارداد میں جسے کونسل کے گیارہ میں سے دس ممبروں کی حمایت حاصل تھی یہ کہا گیا کہ ۲۲ ستمبر ساڑھے بارہ بجے دوپہر جنگ بند کر کے ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشن بحال کی جائے اور اس کے بعد کشمیر کے مسئلے کو دونوں ممالک بات چیت کے ذریعے حل کر لیں۔ اس قرارداد پر چین نے اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے اسے سرے سے ہی مسترد کر دیا لیکن ہندوستان اور پاکستان دونوں نے یہ قرارداد قبول کر لی اور دونوں ممالک نے اپنی اپنی مسلح افواج کو ۲۳ ستمبر کی صبح سے فائر بندی کا حکم دے دیا لیکن جنگ بندی کے باوجود صورتِ حال جوں کی توں رہی جس پر اقوامِ متحدہ نے تشویش کا اظہار کیا۔ چنانچہ سیکرٹری جنرل اوتھانٹ ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشن بحال کرنے اور کشمیر کے جھگڑے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتے رہے اور اس سلسلے میں وہ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، برطانیہ اور روس کے نمائندوں سے بھی صلاح مشورہ کرتے رہے۔ دوسری طرف کشمیر میں ابھی 'بے چینی' اور اضطراب

برابر قائم رہا۔ لوگوں کے غم و غصہ کو دیکھ کر تحریک کے قائدین مولانا مسعودی اور مولوی فاروق وغیرہ دوبارہ میدان میں آگئے اور انہوں نے گول مول سی باتیں کر کے لوگوں میں پھر اپنی جگہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی سری نگر میں ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد نے ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ ریاستی حکومت نے مسلح پولیس کی مدد سے ان ہنگاموں کو فرو کرنے کیلئے طاقت کا بے دریغ استعمال کیا اور کئی جگہ سنٹرل ریزرو پولیس نے پاکستان کی حمایت میں مظاہرہ کرنے والوں پر گولیاں برسائیں۔ ۴ اکتوبر کو جب کہ بہت سے طلبا کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بڈشاہ چوک میں جمع ہو گئے تو سنٹرل ریزرو پولیس نے انہیں تتر بتر کرنے کے لئے پہلے ٹیئر گیس کا استعمال کیا اور پھر گولی چلا دی۔ جس سے تین نوجوان طالب علم چوک کے قریب ہلاک ہو گئے اور کچھ زخمی ہو گئے۔ طاقت کے اس بے دریغ استعمال کے خلاف عوام میں غم و غصہ بڑھتا گیا۔ چنانچہ ۹ اور ۱۰ اکتوبر کی درمیانی شب کو تحریک کے تقریباً تمام لیڈر جن میں محاذِ رائے شماری کے منشی اسحاق اور مولوی محمد فاروق بھی شامل تھے، گرفتار کر کے نظر بند کر دیئے گئے۔ ساری وادی میں مسلح سی۔ آر۔ پی بٹھا دی گئی۔ اس پر عوامی جوش مزید ابھر آیا اور تشدد آمیز کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ۲۱ اکتوبر کو ریاستی حکومت نے مولانا مسعودی اور دوسرے ۲۰ سرکردہ اصحاب کو جن میں خواجہ غلام محی الدین قرہ اور سری نگر کے تمام سرکردہ علما بھی شامل تھے، گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔

دوسری طرف برصغیر کی سنگین صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے متعدد بار اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کا اجلاس ہوتا رہا۔ ۲۰ اکتوبر کو سیکورٹی کونسل نے دونوں ممالک کے درمیان تصفیہ کروانے کے لئے جو اجلاس منعقد کیا اس میں ہندوستان کی طرف سے وزیرِ خارجہ سردار سورن سنگھ اور پاکستان کے وزیرِ خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے اپنے ملک کا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔ سلامتی کونسل میں جب مسٹر بھٹو نے کشمیر کی صورتِ حال کے بارے میں بعض واقعات کا حوالہ دیا تو سردار سورن سنگھ نے اس پر اعتراض کیا چنانچہ

اجلاس ایک گھنٹے کے لئے ملتوی کر دیا گیا لیکن جب اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو اردن کے نمائندے نے کونسل سے احتجاج کیا کہ وہ مسٹر بھٹو کو اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنے سے کیوں روک رہی ہے۔ اس پر کونسل کے صدر نے مسٹر بھٹو کو دوبارہ تقریر کرنے کی اجازت دی۔ مسٹر بھٹو نے پھر کشمیر میں ایجی ٹیشن، ہنگاموں اور مسلح پولیس کی کارروائیوں کا تذکرہ شروع کیا تو سردار سورن سنگھ بطور احتجاج واک آؤٹ کر گئے۔



۱۴



سلامتی کونسل پھر ناکام ہوگئی اور برصغیر میں صورت حال جوں کی توں رہی۔ سلامتی کونسل کی ناکامی کے بعد امریکہ اور برطانیہ نے اپنے طور پر اور روس نے اپنے طور پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر پر تصفیہ کروانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ یہ کوششیں زیادہ تر سفارتی سطح پر ہوتی رہیں۔ اسی دوران روس کے وزیر اعظم مسٹر کوسیگن نے مسٹر لال بہادر شاستری اور پاکستان کے صدر محمد ایوب خان کو دو الگ الگ مراسلے بھیجے۔ اپنے ان مراسلوں میں روس نے ان دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر پر مصالحت کروانے کے لئے اپنی خدمات کی پیشکش کی۔ روس کی اس پیشکش کے فوراً بعد ہندوستان کے وزیر خزانہ مسٹر کرشنا چاری ۱۴ نومبر ۱۹۶۵ء کو ماسکو گئے اور وہاں چار دن تک روسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کی۔ مسٹر کرشنا چاری نے ۱۸ نومبر کو ماسکو سے واپس پر نئی دہلی میں اخباری نمائندوں سے بات چیت کے دوران انکشاف کیا کہ روسی لیڈر مسٹر شاستری اور جنرل محمد ایوب خان کے درمیان تاشقند میں ملاقات کروانے کے خواہاں ہیں اور اس کے چند دن بعد یعنی ۲۳ نومبر کو پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو روسی لیڈروں سے بات چیت کیلئے ماسکو گئے۔ روسی لیڈروں اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان بات چیت کے ایک

ہفتے بعد یعنی ۲۰ نومبر کو وزیر اعظم ہند مسٹر شاستری نے اعلان کر دیا کہ وہ پاکستان کے صدر کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے تاشقند جانے کے لئے تیار ہیں۔ روس کی ان مصالحانہ کوششوں پر ماسکو نئی دہلی اور راولپنڈی کے درمیان رابطہ بڑھتا گیا اور سفارتی سطح پر کوششیں تیز تر ہو گئیں۔ روس کی ان مصالحتی کوششوں پر چین کا رد عمل اور شدید ہو گیا اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر فوجوں کی نقل و حرکت بڑھنے لگی۔ روس کی طرف سے مصالحانہ کوششوں کا یہ ٹھوس نتیجہ برآمد ہوا کہ صدر پاکستان محمد ایوب خان اور مسٹر لال بہادر شاستری تاشقند میں ملاقات پر آمادہ ہو گئے۔ بعد میں ۱۳ دسمبر کو سردار سورن سنگھ بعض معاملات کی وضاحت حاصل کرنے اور یہ معلوم کرنے کہ کیا کشمیر کے بارے میں روس کی پالیسی تبدیل ہو گئی ہے؟ خود ماسکو گئے اور وہاں چار دن تک رہے۔ انہوں نے واپسی پر ۲۰ دسمبر کو نئی دہلی کے ہوائی اڈے پر اخباری نمائندوں کو بتایا کہ انہوں نے ماسکو میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چوٹی کانفرنس کے معاملات پر بات چیت کی ہے اور اس کانفرنس کے لئے تاریخوں کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ اس کے ایک ہفتے بعد یعنی ۲ جنوری کو ہندوستان کے وزیر اعظم ایک اعلیٰ سطح کا وفد لے کر تاشقند روانہ ہو گئے اور پاکستان کے صدر محمد ایوب خان بھی ایک اعلیٰ سطح کے وفد کے ہمراہ کابل سے ہوتے ہوئے تاشقند پہنچے جہاں ۴ جنوری ۱۹۶۶ء کو ہندوستان، پاکستان اور روس کے لیڈروں کا پہلا مشترکہ اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت روس کے وزیر اعظم مسٹر کوسی گن نے کی اور اس میں ان کے علاوہ صدر محمد ایوب خان اور مسٹر لال بہادر شاستری نے بھی تقریریں کیں۔ تاشقند میں مذاکرات چھ دن تک جاری رہے اور ان مذاکرات کے دوران صرف کشمیر زیر بحث آیا۔ کشمیر پر دونوں ممالک کے انتہائی متضاد اور الگ الگ موقف تاشقند کانفرنس کی ناکامی کا باعث بن رہے تھے لیکن روس نے بڑے تدبر کے ساتھ دونوں ممالک کو ایک سمجھوتے پر آمادہ کر لیا، جسے اعلان تاشقند کا نام دیا گیا۔ اعلان تاشقند ۹ نکات پر مشتمل تھا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان نے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ وہ پرامن مذاکرات کے ذریعے کشمیر کے مسئلے کا کوئی حل تلاش کریں گے۔ اس اعلان میں یہ اقرار بھی کیا گیا تھا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے جنگی قیدیوں کو واپس کر دیں گے اور

۵ اگست ۱۹۶۵ء سے پہلے کی سرحدوں پر لوٹ جائیں گے۔ اس اعلان پر دستخط کرنے کے صرف چند گھنٹے بعد ہندوستان کے وزیر اعظم مسٹر شاستری اپنی خواب گاہ میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے چل بسے تاہم بعد میں اعلان تاشقند پر عملدرآمد شروع ہوا اور یہ عملدرآمد ہندوستان کی نئی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی نگرانی میں ہوا جس کے نتیجے میں دونوں ممالک کے درمیان ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشن بحال ہو گئی لیکن اس سے آگے اعلان تاشقند محض ایک کاغذی دستاویز بن کر رہ گیا۔ ہندوستان نے ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشن بحال ہو جانے کے بعد کشمیر پر کسی قسم کے مذاکرات کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔ روس کی طرف سے کشمیر پر مذاکرات کروانے کی کچھ مزید کوششیں ہوئیں لیکن بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ روس نے کشمیر کے سوال پر دونوں ممالک کے درمیان ثالث بننے کی پیش کش بھی کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بعض آئینی ترمیموں کے ذریعے کشمیر میں صدر ریاست کا عہدہ بھی ختم ہو گیا تھا اور صدر ریاست کی جگہ گورنر کا تقرر عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر کے اسے وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا تھا۔ مسٹر غلام محمد صادق نے اس تبدیلی کو اس لئے قبول کر لیا، کیونکہ وہ نئی دہلی کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ ہندوستان کے وفادار نہیں ہیں۔ دراصل ان دونوں عہدوں کو تبدیل کرنے کی تحریک سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے اقتدار چھوڑنے سے چند ہفتے پہلے ریاستی مجلس قانون ساز میں پیش کی تھی۔ صدر ریاست کا عہدہ ختم ہونے کے بعد ریاست کے سابق مہاراجہ ہری سنگھ کے بیٹے ڈاکٹر کرن سنگھ کو گورنر رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور نئی دہلی نے ان کی جگہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر مسٹر بھگوان سہائے کو جموں کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔

اعلان تاشقند پر دستخط کرنے کے کوئی ڈیڑھ برس بعد ۳۰ جون ۱۹۶۷ء کو ہندوستان کی حکومت نے ملک میں ایک آرڈیننس نافذ کیا جس کی رو سے وہ علاقہ پرست تنظیموں یا اس قسم کی دوسری علیحدگی پسند سیاسی پارٹیوں کو خلاف قانون قرار دے سکتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ حکمران کانگریس پارٹی جس کی قیادت غلام محمد صادق کے ہاتھ

میں بھی یہ اختلافات بڑھنے لگے۔ ان اختلافات کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نئی دہلی کشمیری لیڈروں میں سب سے زیادہ بھروسہ مسٹر ڈی پی دھر پر کرتی تھی اور تمام اہم مسائل کے بارے میں اُن ہی سے صلاح مشورہ کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کہ صادق صاحب وزارتِ داخلہ کا محکمہ ڈی پی دھر سے چھین کر اپنی تحویل میں لے چکے تھے انہیں وزیرِ اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی بہت سی باتوں کا علم ڈی پی دھر کے ذریعے ہی ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ ریاست میں سرکاری ایڈمنسٹریشن کا بااختیار حصہ بھی ڈی پی دھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ اعلیٰ حکام کو یقین تھا کہ اصل طاقت کا سرچشمہ دہلی ہے اور چونکہ مسٹر ڈی پی دھر وزیرِ اعظم اور دوسرے ہندوستانی حکام کے قابلِ اعتماد شخص ہیں اس لئے وہ ہر معاملے میں ڈی پی صاحب کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ ڈی پی دھر نے حکمران کانگریس میں بھی اپنا ایک خاص حلقہ قائم کر لیا تھا۔ اُن کا یہ حلقہ ریاستی کانگریس کے صدر سید میر قاسم اور کابینہ کے بعض وزراء جن میں مسٹر غلام رسول کار اور مفتی محمد سعید وغیرہ بھی شامل تھے کے علاوہ ریاستی کانگریس کے بعض چھوٹی لیڈروں پر مشتمل تھا اور ان لوگوں کو ڈی پی دھر کی وساطت سے نئی دہلی میں خاصا اثر و رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ چونکہ کشمیر حکمران کانگریس میں اختلافات آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے اور اس طرح شیخ محمد عبداللہ کے مقابلے میں بخشی غلام محمد اس کے بعد بخشی غلام محمد کے مقابلے میں غلام محمد صادق اسی طرح غلام محمد صادق کے مقابلے میں سید میر قاسم کو کھڑا کرنے کی روایت دہرائی جانے لگی۔ سابقہ وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کے خلاف چونکہ بدعنوانیوں کے الزامات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن قائم کیا گیا تھا اس لئے وہ نئی دہلی سے بالکل بددل اور بیزار نظر آتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے فروری ۱۹۶۷ء میں ریاستی اسمبلی کے لئے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ انتخابات کروانے کے جو طریقے ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر میں رائج کئے گئے ہیں۔ اُن کی بناء پر اپوزیشن کے کسی ایک ممبر کے لئے بھی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ ۱۹۶۷ء کے انتخابات میں محاذِ رائے شماری کے ایک حلقے نے بھی حصہ لیا۔ لیکن محاذ کی قیادت نے اس اندازِ فکر کو سرے سے ہی مسترد کر دیا اور کہا کہ چونکہ محاذ کے بیشتر لیڈر جیلوں میں ہیں اور انتخابات آزادانہ فضا میں نہیں ہو رہے ہیں اس لئے محاذِ رائے شماری انتخابات کے بائیکاٹ کے اپنے فیصلے پر قائم رہے گا۔

۱۹۶۷ء کے انتخابات میں بھی وادی کی بیالیس نشستوں میں سے ۲۲ نشستیں حکمران کانگریس بلا مقابلہ لے گئی اور متعلقہ ریٹرننگ آفیسروں نے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان ۲۲ حلقوں میں مختلف اپوزیشن پارٹیوں کے تمام اُمیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر دیئے۔ وادی کی ۴۲ نشستوں کے لئے اپوزیشن کے جو ۱۰۵ اُمیدوار کھڑے ہوئے تھے اُن میں سے ۱۰۰ اُمیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی بغیر کسی معقول وجہ کے مسترد کر دیئے گئے۔ انتخابات میں حسبِ روایت حکمران کانگریس نے اکثریت حاصل کر لی اور غلام محمد صادق دوبارہ برسرِ اقتدار آ گئے۔ لیکن نئی حکومت بننے کے بعد ریاستی کانگریس پارٹی میں اختلافات بھی وسیع ہو گئے اور کانگریس پارٹی کو چونکہ اب یہ اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ وہ پانچ برس کے لئے برسرِ اقتدار آ گئی ہے۔ اس لئے شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ اور محاذ رائے شماری کے دوسرے لیڈروں کی رہائی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۶۷ء کو مرزا محمد افضل بیگ رہا کر دیئے گئے اس کے ساتھ ہی سرینگر اور دوسری جیلوں میں نظر بند دوسرے لیڈروں کو بھی یکے بعد دیگرے رہا کر دیا گیا۔ البتہ شیخ محمد عبداللہ کو اسی دوران اوٹاکمنڈ سے پہلے کوڈائی کنال اور پھر وہاں سے نئی دہلی لا کر کوٹلہ لین کے نمبر ۳ بنگلے میں نظر بند رکھا گیا۔



۱۵



اگست ۱۹۸۰ء کے پہلے ہفتے میں سرینگر میں ایک واقعہ منظرِ عام پر آیا جب کہ سرینگر کے ڈیپارٹمنٹل شعبہ
میں ملازم ایک کشمیری پنڈت لڑکی پرمیشوری ہنڈو نے اپنی مرضی سے اپنا مذہب تبدیل کر کے ایک مسلمان نوجوان غلام
رسول کنٹھ کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ لڑکی غلام رسول کنٹھ کے ہمراہ کشمیر کے مفتی اعظم کے دار الافتاء پر گئی جہاں اس نے
اپنی مرضی سے اسلام قبول کر کے غلام رسول کنٹھ کے ساتھ شادی کر لی۔ اس واقعہ پر بعض کشمیری پنڈتوں نے اس لڑکی کی
ماں کو اکسایا۔ چنانچہ وہ کشمیر کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ڈی این کول کے پاس فریاد لے کر گئی۔ مسٹر کول نے متعلقہ
پولیس تھانے کو اس بارے میں کیس رجسٹر کرنے اور تحقیقات کرنے کا حکم دیا۔ متعلقہ پولیس تھانے نے مقدمہ رجسٹر کرنے کے
بعد غلام رسول کنٹھ اور اس کی منکوحہ بیوی کو گرفتار کر لیا اور خانیار کے پولیس سٹیشن میں لا کر حوالات میں بند کر دیا۔ جہاں پولیس
کی امداد و اعانت سے لڑکی کی ماں اس کے دوسرے رشتہ داروں اور کشمیری پنڈت جاتی کے سرکردہ سماجی اور سیاسی
لیڈروں نے اس لڑکی سے ملاقات کی اور اسے واپس ہندو دھرم میں آجانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان

سب کی تمام کوششیں ناکام رہیں اور لڑکی اپنے فیصلے پر اٹل رہی۔ اس واقعہ کا چرچا عام ہو گیا اور مسلمانوں کے ایک حلقے میں اس زور زبردستی کے خلاف غم و غصہ پھیلنا شروع ہوا۔ اسی اثنا میں بعض ہندو وکلاء نے لڑکی کی ماں کو مشورہ دیا کہ وہ یہ معاملہ عدالت میں پیش کرے۔ چنانچہ لڑکی کی ماں نے سرینگر کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں یہ درخواست پیش کی کہ چونکہ اُس کی لڑکی نابالغ ہے۔ اس لئے وہ اپنی مرضی سے اپنی شادی کرنے کا قانوناً کوئی اختیار نہیں رکھتی۔ اس بنا پر عدالت سے درخواست کی گئی کہ وہ لڑکی کو پولیس حوالات سے نکلوا کر اُس کی ماں کے سپرد کر دے۔ لڑکی کی طرف سے سرینگر کے مشہور سرکردہ کشمیری پنڈت وکلاء پیروی کے لئے عدالت میں آ گئے۔ دوسری طرف اس معاملے پر کشمیری پنڈتوں نے ایک ہندو ایکشن کمیٹی کا قیام عمل میں لا کر ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ جب اس ایجی ٹیشن کا معاملہ ریاستی اسمبلی میں جس کا اُن دنوں سرینگر میں اجلاس ہو رہا تھا، اُٹھایا گیا تو حکومت نے اپنی پوزیشن بیان کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ لڑکی کی ماں یہ معاملہ باقاعدہ طور پر ایک عدالت میں لے گئی ہے۔ اسلئے سب کو عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ایوان اسمبلی میں وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق، جو وزارت داخلہ کے انچارج تھے، نے یہ انکشاف کیا کہ کشمیر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا کرنے کی ایک گہری سازش کا پتہ لگا لیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سازش میں قومی یکجہتی اور سیکولرازم کا دعویٰ کرنے والے بہت سے ایسے افراد بھی ملوث ہیں جن کا تعلق حکمران کانگریس پارٹی سے ہے۔ وزیر اعلیٰ نے ایوان کو یہ بھی بتایا کہ اس سازش کے سلسلے میں بعض دستاویزوں، ڈائریوں اور دوسرے کاغذات کے علاوہ بہت سا اسلحہ بھی ضبط کر لیا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے اس بیان سے کشمیر میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور دوسری طرف کشمیری پنڈتوں کا ایجی ٹیشن بھی زور پکڑ گیا اور حکومت کے لئے امن و قانون بنائے رکھنا مشکل ہو گیا۔ کشمیری پنڈتوں نے جو ہندو ایکشن کمیٹی بنائی تھی، اُس نے اس واقعہ میں ملوث لڑکی کی والدہ شریمتی دھن وتی کو مجبور کر دیا کہ وہ عدالت سے اپنی درخواست واپس لے لے کیونکہ ہندو ایکشن کمیٹی اس معاملے کا فیصلہ سیاسی میدان میں کرنا چاہتی تھی۔ اس ایجی ٹیشن سے نئی دہلی کو کچھ غیر معمولی تشویش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ بعض اعلیٰ سرکاری افسران اور مرکزی وزارت داخلہ کے سیکرٹری کو سرینگر بھیجا گیا۔ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے بعض چوٹی کے لیڈر بھی جن میں پروفیسر بلراج مدھوک بھی شامل تھا اچانک سرینگر پہنچ گئے۔ ان لیڈروں نے ہندو ایکشن کمیٹی کے اراکین کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور انہیں مزید

اُکسایا۔ وزارت داخلہ کے سیکرٹری مسٹر ایل پی سنگھو تین دن تک سرینگر میں رہے۔ اُنہوں نے ریاستی حکام کے علاوہ ہندو ایکشن کمیٹی کے ممبروں سے ملاقاتیں کیں۔ اور واپس نئی دہلی پہنچ کر صورتِ حال کے بارے میں حکومت ہند کو آگاہ کیا۔ مسٹر ایل پی سنگھو نے اپنی رپورٹ میں ہندو ایکشن کمیٹی کی حمایت اور صادق حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا۔ سرینگر میں چپقلش سطح پر اگرچہ تب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی تصادم وغیرہ نہیں ہوا تھا لیکن کشیدگی عروج پر پہنچ چکی تھی اور جب مسلمانوں کو یہ محسوس ہوا کہ نئی دہلی ریاستی حکومت پر دباؤ ڈال کر مسلمانوں سے ناانصافی کروانا چاہتی ہے تو انہوں نے جوابی ایجی ٹیشن کے طور پر ہڑتال کر دی اور حکام کے خلاف مظاہرے کئے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ہندو ایکشن کمیٹی نے اپنی تقریروں اور اپنی کارکردگی سے کشمیر کے صدیوں پرانے فرقہ وارانہ بھائی چارے اور میل ملاپ کی روایات کو خاکستر کر کے رکھ دیا۔ سرینگر کے عین وسط میں شیتل ناتھ کے مقام پر ہر روز جلسہ ہوا کرتا تھا، جہاں پر ایک فرد واحد جس نے کہ ڈیپارٹمنٹل سٹور میں ملازم لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی کے خلاف تقریریں کرنے کی بجائے سارے مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی کی انتہا کی جاتی رہی لیکن حکومت اس ساری اشتعال انگیزی کے مقابلے میں بے بس اور لاچار تھی۔ شہر میں امن و انتظام درہم برہم ہو چکا تھا اور دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود ہندو ایکشن کمیٹی جلسے جلوسوں کے ذریعے کشمیری مسلمانوں اور صادق حکومت کو ہدفِ ملامت بنا رہی تھی۔ لیکن مسلمانوں اور خود وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق نے بڑے صبر و استقلال کا ثبوت دیا۔ اسی دوران مسٹر ڈی پی دھر نے وزیر اعلیٰ کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا لیکن بعد میں انہوں نے اپنے کشمیری رفقاء کے دباؤ میں آ کر استعفیٰ واپس لے لیا۔

سرینگر میں صورتِ حال ابتر ہو رہی تھی کہ ۱۵ اگست کی صبح کو ہندو ایکشن کمیٹی کے مطالبات کی حمایت میں جموں میں تشدد آمیز مظاہرے شروع ہو گئے۔ خود ریاست کے چیف سیکرٹری مسٹر پیارے کشن دھاون کے بیان کے مطابق جموں شہر میں تین مسلمانوں کے ہوٹل لوٹ لئے گئے۔ اُن کے فرنیچر کو نذر آتش کیا گیا اور چند ایک مسلمانوں کی دکانوں پر پتھراؤ کے علاوہ ایک مسلمان کے چھاپہ خانے پر حملہ بول دیا گیا۔ جس پر فوراً فوج طلب کر لی گئی۔ سرینگر میں صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے پہلے پندرہ گھنٹے کا اور یہ مدت پوری ہونے پر پورے ساٹھ گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ کرفیو کے نفاذ سے پہلے تمام سرکاری دفاتر جن میں مرکزی حکومت کے دفاتر بھی شامل تھے کا ہندوؤں نے بائیکاٹ کر دیا تھا۔

ان تمام واقعات نے جو اس ایک ماہ کے دوران رونما ہوئے غلام محمد صادق کے سیاسی خیالات اور عقائد کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ ہر چند غلام محمد صادق کو کٹر قوم پرست قرار دیا جاتا تھا اور غلام محمد صادق کے لئے معروف درگا پرشاد دھر اور کانگریس کے ہندو اراکین کا عمل ایک تازیانۂ عبرت تھا۔ بلکہ نئی دہلی کی اس معاملے میں بار بار مداخلت اور ہندوستان کے پریس کے رویے نے غلام محمد صادق کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرا دیا اور جیسا کہ انہوں نے خود کہا۔ "مسلمان اس ملک میں اقتدار میں ہو یا اقتدار سے باہر مظلوم ہے۔ اگر اس ریاست میں ہزاروں مسلمانوں کو ڈیفنس آف انڈیا رولز اور دوسرے کالے قوانین کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے۔ درجنوں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جائے تو اس اتنے بڑے ملک میں ان پر کئے گئے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں۔ لیکن اگر کوئی مسلمان حاکم کسی غیر مسلم شہری کو معمولی طور پر ناراض کرے تو مجموعی ہندوستان کی ساری ہندو آبادی اس سے بیزار ہو جاتی ہے۔" حالات نے غلام محمد صادق کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر دی اور انہوں نے محاذ رائے شماری، پولیٹیکل کانفرنس اور عوامی ایکشن کمیٹی کے تمام کے تمام نظربند لیڈروں کو یکے بعد دیگرے رہا کر دیا جو اب تک رہا نہیں کئے گئے تھے۔ ہندو ایکشن کمیٹی کے جو سیکڑوں ورکر گرفتار کئے گئے تھے۔ ان سب کو بھی غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا اور بعد میں یہ ہوا کہ ڈیپارٹمنٹل سٹور کی ملازم لڑکی پرمیشوری ہندو سے پروین اختر بن کر ہمیشہ کے لئے غلام رسول کانٹھ کی ہو گئی۔ البتہ نئی دہلی نے کشمیری ہندو ایکشن کمیٹی کے مطالبے پر ان کی سیاسی اور ملازمتوں وغیرہ کے بارے میں شکایات کا جائزہ لینے اور ان کا ازالہ کرنے کی سفارشات پیش کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس مسٹر گجندر گڈکر کی صدارت میں تین اشخاص پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ اس کمیشن کے دوسرے دو ممبر مسٹر شنکر پرشاد اور بدرالدین طیب جی تھے۔ اس کمیشن نے سرینگر اور جموں میں مختلف طبقوں کے بیانات سننے کے بعد اپنی سفارشات پیش کر دیں۔

واقعات نے جو کروٹ لی اس سے جہاں حکمران کانگریس پارٹی میں اکثر مسلمان بددل اور بیزار سے نظر آتے تھے وہاں کشمیری مسلمانوں کے نوجوان طبقے میں بے چینی اور اضطراب شدت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ مختلف کالجوں کے مسلمان طلباء اور نوجوانوں نے منظم ہو کر دوبارہ حق خود ارادیت کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ حکومت نے اس جدوجہد کو بڑی سختی کے ساتھ دبانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ۳ اکتوبر کو بادشاہ چوک اور لال چوک میں طلباء کے ایک بہت بڑے اجتماع پر سنٹرل ریزرو پولیس کی فائرنگ نے حالات کو اور بگاڑ دیا۔ اس فائرنگ میں ایک نوجوان طالب علم محمد اشرف بیگ جو ٹیکنیکل

اور کوئی بھی ہندو سرکاری ملازم دفتر نہیں جاتا تھا۔ کرفیو کے نفاذ کے ساتھ ساتھ اخبارات پر سنسر بٹھا دیا گیا۔ ہر جگہ میں کشمیر پولیس کی بجائے سنٹرل ریزرو پولیس کے مسلح دستے متعین کر دیئے گئے۔ جن کی دراز دستیوں سے مسلم آبادی کا تو گویا حیات تنگ ہو گیا۔ جن لوگوں کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے کرفیو کے اوقات میں سرکاری دفاتر میں آنے اور ضروری سروس چلانے رکھنے کے لئے کرفیو پاس دیئے گئے تھے۔ وہ ناکارہ ثابت ہوئے کیونکہ سنٹرل ریزرو پولیس کرفیو پاس دکھلانے والے سے اس کا نام بھی پوچھ لیتی تھی۔ اور جب وہ اپنا نام بتاتا اور پولیس والوں کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ مسلمان ہے تو اسے وہیں پر پیٹا جاتا اور اس کا کرفیو پاس چھین لیا جاتا تھا۔ ۲۰ اگست بعد دوپہر حبہ کدل سے ایک ارتھی جلوس نکالا گیا۔ اس شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بوڑھا ہونے کی وجہ سے ایک مشتعل ہجوم پر لاٹھی چارج کے دوران بھاگ نہیں سکا اور پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہو کر چل بسا تھا۔ اس کی ارتھی کا جلوس جب کرن نگر پہنچا تو شہر کے اس علاقے میں مسلمانوں کی پانچ دکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا اور آس پاس کے مکانوں پر پتھراؤ کیا گیا۔ اس کے بعد شہر میں صورت حال زیادہ سنگین ہو گئی چنانچہ تمام عدالتیں اور سرکاری دفاتر بھی بند کر دیئے گئے۔ اس پر نئی دہلی کو مزید تشویش لاحق ہو گئی چنانچہ مرکزی وزیر داخلہ مسٹر وائی بی چوان صورت حال کا جائزہ لینے اور مداخلت بے جا کرنے خود سرینگر آئے۔ مسٹر چوان ۱۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو آئے اور انہوں نے وزیر اعلیٰ، دوسرے ریاستی حکام اور ہندو ایکشن کمیٹی کے لیڈروں کے ساتھ صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ مرکزی وزیر داخلہ نے یہ تجویز پیش کی کہ عدالت کے فیصلے تک لڑکی کو اس کی والدہ کی تحویل میں رکھا جائے۔ یہ تجویز اس سے پہلے مسٹر ڈی پی دھر نے بھی پیش کی تھی اور ان کے بعض قریبی رفقاء نے بھی اس کی حمایت کی تھی لیکن غلام محمد صادق نے اس پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ انہوں نے مرکزی وزیر داخلہ کو بتایا کہ "میں قانون کا بہت احترام کرتا ہوں اور قانون میں مداخلت سے زیادہ بہتر یہی سمجھوں گا کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔ قانون کی رو سے کسی ایک مذہب کی بالغ لڑکی کا کسی دوسرے مذہب کے بالغ لڑکے سے شادی کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں اور جہاں تک متعلقہ لڑکی کے برتھ سرٹیفکیٹ، سکول اور شہری ریکارڈ کا تعلق ہے اس کی بنا پر وہ بالکل بالغ ہے اور میں یہ تسلیم کرنے کے لئے کسی بھی طرح تیار نہیں کہ وہ بالغ نہیں ہے۔" اس پر مسٹر ڈی پی دھر میٹنگ سے اٹھ کر چلے گئے بعد میں مسٹر چوان نے ہندو ایکشن کمیٹی کے لیڈروں کو سمجھایا اور ان کے دوسرے تمام مطالبات پر ہمدردانہ غور کی یقین دہانی کرا کر انہیں اپنا ایجی ٹیشن اس وقت تک کے لئے معطل کرنے پر آمادہ کر لیا جب تک کہ عدالت اس بارے میں اپنا فیصلہ صادر نہ کرے۔

کا رہنے والا تھا اور شہر کی تاریخی مسجد کا امام شبیر احمد میر موقع پر ہی ہلاک کیے گئے ۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی گولیوں سے زخمی ہو گئے ۔ اس پر شہر میں دوبارہ کرفیو نافذ کر دیا گیا ۔ ۸ اکتوبر کو جب کشمیر میں صورت حال معمول پر آنے لگی تھی ، بریگیڈیئر سلیم کے باہر فوجداری اور بغیر کسی اشتعال کے سنٹرل ریزرو پولیس کے سپاہیوں نے لال چوک میں عوام پر اندھا دھند فائرنگ کی جس سے متعدد اشخاص ہلاک اور بہت سے زخمی ہو گئے ۔ ہلاک ہونے والوں میں درگاہ کا ایک اسسٹنٹ انجینئر غلام محمد بھی شامل تھا جو کسی کام کے سلسلے میں شہر آیا تھا ۔ اس پر عوامی احتجاج نے ایک ایجی ٹیشن کا روپ دھار لیا ۔ اس واقعہ نے خود وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کو اس قدر بدل کر دیا کہ انہوں نے کشمیر سے سنٹرل ریزرو پولیس کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا اور اُس وقت وادی کی حفاظت کیلئے مقامی پولیس متعین کر دی ۔ سنٹرل ریزرو پولیس کو واپس تو نہیں بلایا گیا البتہ اسے مختلف مقامات سے ہٹا کر بارکوں میں رکھا گیا ، تاکہ ضرورت پڑنے پر عوام کو دبانے کیلئے اُسے پھر استعمال کیا جا سکے ۔ اسی دوران نئی دہلی میں شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کی تجویز بھی زیرِ غور تھی اور اس کے لئے ممبران پارلیمنٹ کی ایک خاصی تعداد نے بھی مطالبہ کیا تھا ۔ نئی دہلی میں اس معاملے پر سوچ بچار ہو رہا تھا کہ ریاستی حکومت نے ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء کو مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ اور ۱۰ دسمبر کو مولوی محمد فاروق کو رہا کر دیا ۔ یہ سب لوگ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں طلباء اور نوجوانوں کی زبردست ایجی ٹیشن کے بعد گرفتار کیے گئے تھے ۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں نئی دہلی نے شیخ محمد عبداللہ پر عائد کی گئی پابندیوں کو کچھ نرم کر دیا اور انہیں اپنے خویش و اقارب کے ساتھ ملاقات کرنے اور نئی دہلی میں گھومنے پھرنے کی آزادی دے دی گئی ۔ شیخ صاحب کوٹلہ لین کے نمبر ۳ بنگلے میں رکھے گئے تھے ۔

اسی دوران رُوس کے وزیر اعظم مسٹر کوسی گن کے دورۂ ہندوستان کے پروگرام کا اعلان کیا گیا اور نئی دہلی سے شائع ہونے والے بعض اخبارات میں اس قسم کی اطلاعات شائع ہوئیں کہ شیخ محمد عبداللہ اور روسی وزیر اعظم کے درمیان ملاقات ہو رہی ہے ۔ شیخ محمد عبداللہ کو ۲ جنوری ۱۹۶۸ء بعین عید کے روز نئی دہلی میں رہا کر دیا گیا اور اُن پر ساری پابندیاں ہٹا دی گئیں ۔ اپنی رہائی کے بعد شیخ صاحب نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کیلئے پھر کوششیں شروع کر رہے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ طویل ملاقات کی اور بعد میں انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ شیخ صاحب کو پاکستان کے صدر محمد ایوب کی طرف سے پاکستان جانے کیلئے دعوت نامہ موصول ہوا ہے ۔ شیخ صاحب نے یہ اعلان بھی کیا کہ وہ برابر اپنے اس موقف پر قائم رہیں گے کہ کشمیر کا تصفیہ ہوئے بغیر اس برصغیر میں

امن قائم نہیں رہ سکتا اور یہ تنازعہ ہندوستان ، پاکستان اور کشمیری عوام تینوں فریقوں کی رضامندی سے ہی حل ہو سکتا ہے ۔ اپنی رہائی کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے اس تقریب میں بھی شرکت کی جو اعلانِ تاشقند کی دوسری سالگرہ کے موقع پر نئی دہلی میں منعقد کی گئی تھی ، حالانکہ اعلانِ تاشقند محض ایک کاغذی اعلان بن کر رہ گیا تھا ۔ اس تقریب پر نئی دہلی میں متعین روسی سفیر کا شیخ محمد عبداللہ سے تعارف کروایا گیا ۔ اس سے پہلے اسی روز صبح شیخ محمد عبداللہ نے اپنے داماد خواجہ غلام محمد شاہ کو اپنا ایک خط اور پھولوں کا گلدستہ دے کر روسی سفارت خانہ میں بھیجا تھا ۔ جس کے چند دن بعد روسی سفیر اُن سے ملنے اُن کی قیامگاہ پر گئے ۔ روسی سفیر سے اُن کی ملاقات اڑھائی گھنٹے تک جاری رہی اور اس ملاقات میں کچھ وقت کیلئے مرزا محمد افضل بیگ بھی شامل رہے ۔ اس ملاقات میں یہ بھی طے پایا کہ شیخ محمد عبداللہ روس کے وزیر اعظم مسٹر کوسی گن جو عنقریب جلد ہندوستان آنے والے تھے کے ساتھ بات چیت کریں گے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکا تو شیخ صاحب ماسکو جا کر روسی لیڈروں سے بات چیت کریں گے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں شیخ محمد عبداللہ نے روسی سفیر کی وساطت سے روسی وزیر اعظم کو ایک مراسلہ بھی بھیجا ۔ جس میں انہوں نے اُن سے ملاقات کرنے اور ماسکو جانے کی خواہش ظاہر کی ۔ شیخ محمد عبداللہ نے وزیر اعظم ہند سے بھی درخواست کی کہ وہ انہیں روس کا دورہ کرنے کی اجازت دیں ۔ اسی دوران میں صورت حال کی اطلاع ملنے پر پاکستان کے صدر محمد ایوب خان نے شیخ محمد عبداللہ کو ایک مراسلہ بھیجا ۔ جس میں صدر موصوف نے شیخ صاحب سے استدعا کی تھی کہ وہ کشمیر پر مذاکرات کے سلسلے میں پاکستان کو نظرانداز کرنے کی کوشش نہ کریں ۔ صدر پاکستان کا یہ مراسلہ پاکستان کے ہائی کمشنر برائے ہندوستان مسٹر ارشد حسین اپنے ساتھ لائے تھے ۔ مسٹر ارشد حسین نئی دہلی میں کشمیر کے بارے میں سفارتی اور سیاسی سرگرمیوں سے اپنی حکومت کو آگاہ کرنے کی غرض سے دو دن پہلے اچانک پاکستان گئے تھے ۔

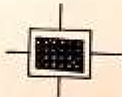
اسی دوران ہندوستان کے کچھ با اثر اور چوٹی کے لیڈر جن میں سابق گورنر جنرل راجگوپال آچاریہ ، مسٹر جے پرکاش نارائن اور آچاریہ ونوبا بھاوے بھی شامل تھے ، شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت کرتے رہے ۔ اس بات چیت کے دوران جو ممتاز سیاسی لیڈروں اور برسرِ اقتدار کانگریس کے سرکردہ لیڈروں اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان ہو رہی تھی ، نئی دہلی اور کشمیر کے لیڈروں کے درمیان مصالحت و صفائی کی کوششیں بھی ہوتی رہیں ۔ چنانچہ اس سلسلے میں سارے کشمیری لیڈروں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی ۔ اور اس کے ساتھ ہی ریاست کے سابق مہاراجہ ہری سنگھ کے بیٹے جو ان دنوں حکومت ہند کے وزیر تھے کے ذریعے ڈوگری علاقوں کو کشمیر سے الگ کر کے ریاست کی لسانی بنیادوں پر تقسیم کی تجویز بھی پیش کی گئی جسے شیخ محمد عبداللہ نے

ناقابلِ قبول قرار دیا۔ خود وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے بھی ایک اخباری کانفرنس میں یہ کہا کہ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کشمیر میں بعض داخلی تبدیلیوں کے بارے میں بات چیت کی ہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۶۶ء کو روس کے وزیرِ اعظم ایک اعلیٰ سطح کا وفد لیکر نئی دہلی پہنچے۔ انہوں نے کشمیر کے مسئلے پر ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ مسٹر کوسی گن ایک ہفتے تک نئی دہلی میں رہے۔ لیکن مذاکرات ناکام ہو گئے۔ اِدھر نئی دہلی نے شیخ محمد عبداللہ کو مسٹر کوسی گن سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان مذاکرات کی ناکامی کے بعد پاکستان کے وزیرِ تجارت نوابزادہ عبدالغفور خان اور پاکستان کے ہائی کمشنر مسٹر ارشد حسین نے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ نئی دہلی میں ملاقات کی۔ اس ملاقات کے وقت مرزا محمد افضل بیگ بھی موجود تھے چنانچہ شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر بیگ نے پاکستانی لیڈروں کو دوبارہ یقین دلایا کہ پاکستان کی عملی شرکت کے بغیر کشمیر کے تصفیے سے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا۔ پاکستان کی طرف سے شیخ محمد عبداللہ کو دوبارہ پاکستان آنے اور بات چیت کرنے کی دعوت دی گئی لیکن حکومتِ ہند نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔ نئی دہلی اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں جا کر شیخ محمد عبداللہ نے جو بات چیت کی وہ بالکل بے نتیجہ رہی اور وہ مایوس ہو کر ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو نئی دہلی سے سرینگر آ گئے۔ سرینگر پہنچنے پر انہوں نے کشمیری عوام کو پھر ایک بار یقین دلایا کہ وہ کشمیری عوام کے جس بنیادی حق کے لئے لڑ رہے ہیں اس پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں ہوگا۔ شیخ صاحب نے کشمیر میں آنے کے بعد ساری وادی کا دورہ کیا۔ جگہ جگہ جلسے منعقد کئے اور لوگوں کو یقین دلایا کہ جب تک کشمیر کے تنازعہ کا کوئی ایسا حل نہیں نکل آتا جو ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام کو بھی قبول ہو۔ وہ جد و جہد جاری رکھیں گے۔

دوسری طرف ۱۵ اپریل کو روسی وزیرِ اعظم مسٹر کوسی گن ماسکو سے اچانک راولپنڈی پہنچے۔ ماسکو سے روانگی سے قبل انہوں نے ہندوستان کے سفیر مسٹر کیول سنگھ جو ایک ہفتے تک نئی دہلی میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ماسکو لوٹے تھے کے ساتھ کشمیر پر طویل بات چیت کی۔ روسی وزیرِ اعظم راولپنڈی میں چار دن تک رہے جہاں ان کے اور صدر محمد ایوب خان کے درمیان طویل مذاکرات ہوئے۔ ان مذاکرات میں روسی وزیرِ اعظم نے پاکستان کو یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان متنازعہ مسائل مرحلہ وار طے کئے جا سکتے ہیں لیکن پاکستان نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ وہ سب سے پہلے کشمیر کا تصفیہ چاہتا ہے۔

چنانچہ کشمیر پر ایوب کوسی گن مذاکرات بھی ناکام ہو گئے۔ مسٹر کوسی گن راولپنڈی سے ماسکو جاتے ہوئے نئی دہلی آئے اور یہاں ہندوستانی لیڈروں کو اس بات چیت سے آگاہ کیا جو انہوں نے راولپنڈی میں کی تھی۔ روسی وزیرِ اعظم کے مشن کی ناکامی کے صرف ایک ہفتے بعد شیخ محمد عبداللہ کشمیر سے پھر نئی دہلی پہنچے جہاں انہوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ روسی وزیرِ اعظم کو اپنے مشن میں کہاں تک کامیابی حاصل ہو سکی ہے۔ ان کی نئی دہلی میں آمد کے دو دن بعد پاکستان کے ہائی کمشنر مسٹر ارشد حسین جنہیں صدر محمد ایوب خان نے اپنا نیا وزیرِ خارجہ مقرر کیا تھا نے شیخ صاحب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مسٹر ارشد حسین نے شیخ محمد عبداللہ کو صدر ایوب اور روسی وزیرِ اعظم کے ساتھ کشمیر پر بات چیت اور اس کے نتائج سے آگاہ کرنے کے علاوہ پاکستان کا یہ موقف بھی واضح کر دیا کہ وہ کشمیر کا کوئی بھی یکطرفہ اور غیر جمہوری فیصلہ قبول نہیں کرے گا۔ ارشد حسین نے ان اطلاعات سے شیخ محمد عبداللہ کو آگاہ کر دیا جو روس کی وساطت سے نئی دہلی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان مفاہمت کرائے جانے کے بارے میں پاکستان کو ملی تھیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے مسٹر ارشد حسین کو بات چیت کے دوران یقین دلایا کہ ایسا کوئی تصفیہ یا حل کشمیریوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جس میں پاکستان کو نظر انداز کیا جائے۔



۱۶



مختلف لیڈروں سے مذاکرات کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۸ مئی کو واپس کشمیر لوٹ آئے۔ سرینگر میں آمد کے بعد شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے ایک آل پارٹیز کنونشن طلب کرنے کا منصوبہ پیش کیا گیا جسے کشمیر پیوپلز کنونشن کا نام دیا گیا۔ اگرچہ شیخ محمد عبداللہ اپنے اس موقف پر بڑی سختی سے قائم نظر آتے تھے کہ کشمیر کا مسئلہ ہندوستان پاکستان اور کشمیری لیڈروں یعنی تینوں فریقوں کی رضامندی سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر ایک داخلی حل کی تلاش بھی جاری تھی اور پیوپلز کنونشن اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ پیوپلز کنونشن میں کون کون لیڈر شریک ہوں گے یہ سوال تقریباً دو ماہ تک اختلافات کا باعث بنا رہا اور اسی دوران ۱۸ جون ۶۸ء کو وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی کشمیر آئیں۔ یہاں انہوں نے ۲۰ جون کو قومی یکجہتی کونسل کے اجلاس کا افتتاح کیا جس میں ہندوستان کے تمام سرکردہ لیڈر شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقا کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ اس میں شامل نہیں ہوئے۔ جون کے آخری ہفتے جب پیوپلز کنونشن میں شرکت کے لئے

مدعو کئے جانے والے اصحاب کے ناموں پر اتفاق ہو گیا۔ شیخ صاحب کنونشن بلانے والی سٹیئرنگ کمیٹی کے صدر اور پنڈت پریم ناتھ بزاز اس کے کنوینر بنائے گئے اور اس میں تمام مختلف الخیال لیڈروں کو مدعو کیا گیا جو جموں اور وادی سے تعلق رکھتے تھے۔ جن لوگوں کو کنونشن میں شمولیت کی دعوت دی گئی اُن میں وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق، سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد، پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ، سید میر قاسم وغیرہ شامل تھے۔ غلام محمد صادق اور میر قاسم نے کنونشن میں شمولیت سے انکار کر دیا البتہ دوسرے تمام لیڈروں نے جن میں بخشی غلام محمد بھی شامل تھے، دعوت قبول کر لی۔ پیپلز کنونشن بلانے کے بارے میں عوام کا ردِ عمل کچھ اچھا نہیں تھا اور انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُن کی تحریک کے قائد اپنے اصل موقف سے ہٹ رہے ہیں۔ چنانچہ سرینگر اور وادی کے دوسرے حصوں میں اس کنونشن کے خلاف آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں اور طلبا اور نوجوانوں نے ایک قسم کا ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ ریاستی حکام نے یہ ایجی ٹیشن طاقت استعمال کر کے دبا دیا اور بہت سے لوگ گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے۔ اس کے کچھ وقت بعد ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو سرینگر کی تاریخی عمارت مجاہد منزل میں پیپلز کنونشن شروع ہو گیا۔ کنونشن کا افتتاح کرنے کے لئے مسٹر جے پرکاش نارائن ۹ اکتوبر کو سرینگر پہنچے تھے۔ پیپلز کنونشن شروع ہونے سے پہلے شیخ محمد عبداللہ نے اپنے ایک بیان میں وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے کنونشن میں شامل نہ ہونے کے فیصلے کو افسوسناک قرار دیا اور کہا کہ یہ کنونشن ریاست میں مفاہمت کا ایک نیا دور شروع کرنے کا ایک نیا تجربہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کنونشن میں اڑھائی سو ڈیلیگیٹوں نے شرکت کی اور اپنی افتتاحی تقریر میں مسٹر جے پرکاش نارائن نے نہایت معنی خیز طور پر جہاں اس بات کا اعتراف کیا کہ کشمیر کا تنازعہ موجود ہے وہاں یہ تجویز بھی پیش کی کہ چونکہ حالات یکسر بدل چکے ہیں اس لئے کشمیری لیڈروں کو چاہیئے کہ وہ اپنے خیالات اور اپروچ میں بھی تبدیلی پیدا کر لیں۔ اس کے اگلے روز جب مسٹر نارائن نے حضوری باغ کے ایک جلسے میں یہ اعلان کیا کہ رائے شماری کا مطالبہ اب فرسودہ ہو چکا ہے اس لئے کشمیری لیڈروں کو نئی راہ تلاش کرنی چاہیئے تو جلسہ گاہ میں اُن کے خلاف مظاہرہ شروع ہو گیا جس پر شیخ محمد عبداللہ کو جو مسٹر نارائن کے ساتھ جلسہ گاہ میں آئے تھے، مداخلت کرنا پڑی اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت کشمیریوں کو اُن کے جائز اور بنیادی حق سے محروم نہیں کر سکتی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آزادی خیرات میں نہیں ملتی اسے چھین لیا جاتا ہے اور ہم

اپنا یہ حق حاصل کر کے رہیں گے۔ اس پر جلسے میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا۔ اس کے اگلے دن مسٹر جے پرکاش نارائن نے کشمیر پریس کلب میں اخباری نمائندوں کو بتایا "رائے شماری یا ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کرنا اب خارج از امکان ہے البتہ میں کشمیری لیڈروں اور حکومت ہند کے درمیان بات چیت شروع کروانے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ اس مسئلے کا ہندوستان کے آئینی ڈھانچے کے اندر کوئی مناسب حل نکل آئے اور پیپلز کنونشن اس کام میں ٹھوس مددگار ثابت ہو سکتا ہے"۔

پیپلز کنونشن میں رائے شماری کے حامی عناصر نے بڑا سخت رویہ اختیار کیا۔ اس کنونشن میں آزاد کشمیر کے جن مندوبین کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی وہ تو نہیں آسکے البتہ لندن سے میرپور کے دو تین اصحاب نے خود ساختہ نمائندوں کی حیثیت میں شرکت کی۔

اس کنونشن میں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے تجاویز، متبادل تجاویز اور جوابی تجاویز پیش ہوتی رہیں۔ اٹھارہ تجاویز ہندوستان کے حق میں، سولہ کشمیر کی خود مختاری کے حق میں، چھ کشمیر کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں دینے کے حق میں اور گیارہ کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنے کے حق میں پیش کی گئیں۔ ہندوستان کے حق میں جو تجاویز پیش کی گئیں۔ اُن میں ایک بخشی غلام محمد کی تھی اور چار وادی کے اُن مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی تھیں جن کا تعلق حکمران کانگریس سے تھا۔ ۱۲ دوسری تجاویز جو ہندوستان کے حق میں پیش کی گئیں وہ جموں کے ڈوگروں کی تھیں۔ اگرچہ کنونشن بلانے والوں نے ابھی تک کوئی باقاعدہ اعلان نہیں کیا لیکن اس کا کوئی ٹھوس نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوا۔ کنونشن کے اختتام پر بتایا گیا کہ شیخ محمد عبداللہ ہندوستانی حکام اور پاکستان کے صدر محمد ایوب خان کے ساتھ اس کنونشن کی روئیداد کی روشنی میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد دوسرا اجلاس بلانے کی تاریخ مقرر کریں گے۔ جب میں نے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق سے دریافت کیا کہ وہ اس کنونشن میں کیوں شامل نہیں ہوئے تو انہوں نے یہ عجیب انکشاف کیا کہ "یہ نئی دہلی والے بھی بڑی عجیب مخلوق ہیں۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران اس کنونشن کی مخالفت کرتے ہیں لیکن دوسری طرف کنونشن بلانے والے لیڈروں کے ساتھ سیاسی سطح پر ساز باز بھی کی جا رہی ہے۔ اگر شیخ محمد عبداللہ اس بات پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ وہ اقتدار واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میں رضاکارانہ طور پر اقتدار چھوڑنے کے لئے تیار ہوں لیکن سارے معاملے صاف

اور واضح ہونے چاہئیں۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ لوگوں کو ایک بات کہی جائے اور اندر ہی اندر اس کے برعکس معاملے طے کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب ملک کے قومی دھارے میں آجائیں اور اگر وہ ایسا کریں تو مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوگی۔"

اس کنونشن کے انعقاد اور اس میں کی گئی بحث سے کشمیری مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوئی اور انہیں قیادت کی حیثیت پر شبہ ہونے لگا۔ خود کنونشن میں شامل سرکردہ لیڈروں کے درمیان بھی کشمیر کے سوال پر زبردست اختلافات سامنے آئے اور کنونشن کے اختتام پر جو مشترکہ بیان جاری ہونا تھا اس پر دو دن تک سٹیرنگ کمیٹی کے ممبروں کے درمیان جھگڑا رہا۔ اس لئے کوئی بیان جاری نہیں کیا جا سکا۔ البتہ آخری دن دو قراردادیں منظور کی گئیں جن میں سے ایک مولوی محمد فاروق نے پیش کی تھی اور جس میں کشمیر کا کوئی ایسا حل تلاش کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جو ریاستی عوام کیلئے قابل قبول ہو اور دوسری قرارداد موتی لال مصری ایڈووکیٹ نے پیش کی۔ جس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہتر تعلقات کے لئے کوشش کی جائے۔

اسی دوران جب مسٹر جے پرکاش نارائن سرینگر سے واپس نئی دہلی گئے تو انہوں نے نئی دہلی کو مشورہ دیا کہ پلیبسائٹ کنونشن کے سلسلے میں شیخ محمد عبداللہ کو پاکستان جا کر صدر محمد ایوب خان سے بات چیت کرنے کی اجازت دی جائے۔ نئی دہلی نے مسٹر نارائن کا مشورہ مسترد کر دیا البتہ کسی دائمی التصفیہ کے لئے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی۔ مسٹر نارائن نے اس معاملے سے شیخ محمد عبداللہ کو باخبر کر دیا اور اسکے بعد بعض مرکزی وزیر اور مسز اندرا گاندھی کا خصوصی نمائندہ محمد یونس سلیم سرینگر آئے اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جس کی بنا پر ۵۔ نومبر ۱۹۶۸ء کو شیخ محمد عبداللہ نے اپنے دست راست مرزا محمد افضل بیگ کو دہلی بھیجا۔ مسٹر بیگ نئی دہلی پہنچے جہاں مسٹر جے پرکاش نارائن بھی موجود تھے اور انہوں نے مسٹر نارائن اور حکومت ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ طویل بات چیت کی جس میں بعض امور طے بھی پا گئے۔ مرزا محمد افضل بیگ نے اپنی بات چیت کے بعد سرینگر واپس آکر ساری صورت حال سے شیخ محمد عبداللہ کو آگاہ کر دیا۔

چنانچہ ریاست کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کو دہلی طلب کیا گیا اور ان سے بھی صلاح مشورہ کیا گیا۔

مسٹر صادق نے نئی دہلی سے واپسی پر مجھے بتایا — "شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں اور نئی دہلی کے درمیان اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی ہے اور اگر فریقین کے درمیان سب کچھ طے ہو گیا تو محاذ رائے شماری کی قیادت کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کو تسلیم کرلے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس "قربانی" کے معاوضے میں انہیں اقتدار مل جائے"

کشمیر میں یہ گفتگو "تذبذب اور شک و شبہ" کی فضا عوام کی مایوسی کا باعث بن رہی تھی چنانچہ اس مایوسی کا ازالہ کرنے کے لئے ۱۰ نومبر کو محاذ رائے شماری کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں کشمیر کا مسئلہ رائے شماری کے ذریعے حل کرنے کے سلسلے میں ایک قرارداد پاس کر دی گئی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۶۸ء کو کشمیر پیپلز کنونشن کی سٹیرنگ کمیٹی کا اجلاس سرینگر میں طلب کیا گیا جو صرف ۲ گھنٹے تک جاری رہ سکا۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں برطانیہ کے وزیر خارجہ دہلی آئے اور انہوں نے بھی کشمیر کے مسئلہ پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مصالحت کی پیش کش کی لیکن نئی دہلی نے اسے ناقابل قبول قرار دے دیا۔ برطانوی وزیر خارجہ راولپنڈی بھی گئے۔ راولپنڈی جانے سے پہلے انہوں نے مدارس میں مسٹر راج گوپال آچاریہ کے ساتھ ملاقات کی۔ اور مسٹر راج گوپال آچاریہ نے اس بات چیت کے بعد اپنے ہفتہ وار اخبار "سوراجیہ" میں یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر کو دس برس تک جیوں کا توں اقوام کی کنٹرول میں دے دیا جائے اور دس برس کے بعد اس کا منصفانہ حل نکالا جائے۔ اس کے بعد ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء کو شہنشاہ ایران نئی دہلی آئے۔ وہ اس ملک میں دس روز تک رہے اور انہوں نے کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بیچ بچاؤ کروانے کی بات چیت کی لیکن انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

ادھر کشمیر کے سیاسی محاذ پر مکمل سکوت طاری ہو گیا اور شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سرگرمیاں اوقاف اسلامیہ کے انتظام اور کبھی کبھار محاذ رائے شماری کے کسی جلسے میں تنظیمی معاملات پر تقریر کرنے تک محدود کر لیں۔ دوسری طرف پاکستان میں صدر محمد ایوب خان کے خلاف عوام اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں پاکستان میں صورت حال غیر یقینی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع آئی کہ کشمیر کی شمالی سرحدوں پر روسی اور چینی فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر محمد ایوب خان پاکستان کی صدارت سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے ملک کی باگ ڈور

بری فوج کے سربراہ جنرل محمد یحییٰ خان کو سونپ دی۔ ان تبدیلیوں کا کشمیر میں یہ رد عمل ہوا کہ محاذ رائے شماری نے واپس ہوکر ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ جس کا نئی دہلی نے بظاہر خیر مقدم کیا۔ محاذ کے اس فیصلے کا کشمیری عوام میں کوئی موافق رد عمل نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود محاذ رائے شماری نے ہندوستان کے چیف الیکشن کمشنر سے یہ مطالبہ کیا کہ اسمبلی کی پانچ نشستوں کیلئے جو عنقریب ضمنی انتخابات ہو رہے ہیں ان میں حصہ لینے کیلئے تیاری کا موقع دیا جائے اور اس مقصد کیلئے ضمنی انتخابات تین ماہ کیلئے ملتوی کئے جائیں۔ چیف الیکشن کمشنر نے انتخابات ملتوی کرنے کیلئے یہ شرط پیش کی کہ محاذ رائے شماری پہلے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو تسلیم کرنے کا اعلان کرے۔ اس کے بعد ہی اُسکے انتخابات ملتوی کرنے کے مطالبے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ جس پر محاذ رائے شماری کو مجبوراً انتخابی میدان سے الگ رہنا پڑا۔ چیف الیکشن کمشنر کی طرف سے یہ جواب ملنے کے باوجود شیخ محمد عبداللہ نے مرزا محمد افضل بیگ اور خواجہ غلام محمد شاہ کو نئی دہلی بھیجا تاکہ اس مطالبے پر بات چیت کی جا سکے اور انتخابات میں شرکت کا کوئی راستہ نکالا جا سکے۔ ریاستی وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کو بھی نئی دہلی طلب کیا گیا۔ بات چیت اور اصرار کے باوجود محاذ رائے شماری کے لیڈر خالی ہاتھ واپس آ گئے اور محاذ رائے شماری کی شرکت کے بغیر ہی ضمنی انتخابات ہو گئے۔ ۵ مئی ۱۹۶۹ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند اچانک انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء نئی دہلی گئے اور وہاں ان کی آخری رسومات میں شرکت کی۔ اس موقع پر شیخ محمد عبداللہ نے پھر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور نائب وزیر اعظم مسٹر ڈیسائی سے ملاقات اور تبادلہ خیالات کے علاوہ پاکستان کے ایئر چیف نور خان کے ساتھ بھی کشمیر کے مسئلے پر بات چیت کی جو ڈاکٹر ذاکر حسین کی موت کے سلسلے میں نئی دہلی آئے تھے۔ لیکن اس بات چیت کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

نئی دہلی سے واپس آنے کے بعد محاذ رائے شماری کے لیڈروں نے پنچایتی انتخابات میں شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی ۱۵ مئی کو سرینگر میں کشمیر پیپلز کنونشن سٹیئرنگ کمیٹی کا اجلاس بھی ہوا جس میں ایک "نئی راہ" تلاش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے کے فوراً بعد ہندوستان کے وزیر داخلہ مسٹر چوہان ۲۷ مئی کو سرینگر آئے اور انہوں نے یہاں کشمیر کے گورنر اور وزیر اعلیٰ سے محاذ کے بدلتے ہوئے رجحان پر صلاح مشورہ کیا۔ دوسری طرف امریکہ نے نئے سرے سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا تنازعہ طے کروانے کی

کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ اُس وقت کے امریکی وزیر خارجہ مسٹر راجرس پہلے نئی دہلی آئے اور پھر راولپنڈی گئے لیکن نئی دہلی نے امریکی تجویزیں مسترد کر دیں اور مسٹر راجرس ناکام واپس چلے گئے۔ اسی اثنا میں محاذ رائے شماری کی جنرل کونسل کا اجلاس سرینگر میں بلایا گیا اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ محاذ جمہوری اداروں کے انتخابات میں حصہ لے گا۔ داخلی طور پر یہ ہو رہا تھا اور بین الاقوامی سطح پر امریکی وزیر خارجہ کی ناکامی کے بعد روس نے کشمیر کا مسئلہ حل کروانے کی نئے سرے سے کوشش شروع کی۔ چنانچہ ۳۰ مئی ۱۹۶۹ء کو روسی وزیر اعظم مسٹر کوسیگن راولپنڈی گئے جہاں انہوں نے کشمیر کے مسئلے پر ایک نیا فارمولا پاکستان کے لیڈروں کو پیش کیا۔ اس فارمولے کی بنیاد ہندوستان پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدوں کو نرم کرنے کی ایک ایسی تجویز تھی جسے پاکستان قبول نہیں کر سکا اور روسی وزیر اعظم کا مشن ناکام ہو گیا۔ روس کی اس ناکامی کے بعد امریکہ نے پھر سے کشمیر کا سوال طے کرنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کی۔ ان کوششوں کے سلسلے میں خود امریکی صدر مسٹر نکسن بھی ۳۱ جولائی ۱۹۶۹ء کو ایک نیا فارمولا لیکر نئی دہلی آئے اور ہندوستان کی وزیر اعظم اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ اس پر تفصیل کے ساتھ بات چیت کی لیکن نئی دہلی نے امریکی تجویزیں پھر مسترد کر دیں۔ صدر نکسن نئی دہلی کے بعد پاکستان گئے اور وہاں بھی ان تجویزوں پر پاکستان کے لیڈروں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ لیکن چونکہ ہندوستان ان تجویزوں کو پہلے ہی مسترد کر چکا تھا۔ اس لئے پاکستان کی طرف سے انہیں قبول کرنے یا نہ کرنے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ صدر نکسن کی ناکامی کے بعد محاذ رائے شماری نے اپنی نئی راہ کی تحریک چلانے کی کوشش تیز کر دی اور جب پارٹی کے سرکردہ اراکین کو اس کا علم ہوا تو ان میں سے اکثر نے اس کی مخالفت شروع کر دی اور کچھ لوگ مخالفت کے لئے کھلم کھلا میدان میں آگئے جن کی سربراہی منشی محمد اسحاق کر رہے تھے جو پارٹی کے اہم رکن ہونے کے علاوہ دو بار اسکے قائم مقام صدر بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے سرینگر میں ۱۰ اگست ۱۹۶۹ء کو ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے اس میں دو ٹوک اعلان کر دیا کہ محاذ رائے شماری کی قیادت بنیادی موقف سے انحراف کر رہی ہے اور وہ ہندوستان کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہتی ہے اس پر شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ نے منشی محمد اسحاق اور ان کے ساتھیوں کو غدار اور بے ایمان قرار دے دیا اور انہیں پارٹی سے نکال دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چونکہ نئی دہلی ابھی تک دراصل القضیہ پر پوری طرح سے

آمادہ نہیں۔ اس لیے محاذ رائے شماری کے لیڈر اعلانیہ طور پر اپنے بنیادی موقف سے ہٹنے کا واضح طور پر اعلان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حاجی محمد اسحاق کے اس اعلان کے بعد کہ محاذ کی قیادت اپنے موقف سے انحراف کر رہی ہے، سرینگر اور وادی کے دوسرے حصوں میں طلبا اور نوجوانوں نے مظاہرے شروع کر دیے۔ سرینگر میں زبردست مظاہرے ہوئے جن میں پتھروں، لاٹھیوں اور ٹیئر گیس کا بے دریغ استعمال ہوا۔ ان مظاہروں پر قابو پانے کے لیے صادق گورنمنٹ نے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لائیں اور طاقت کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ سری نگر میں اکتیس طلبا گرفتار کیے گئے اور وادی کے دوسرے حصوں میں گرفتاریوں کی تعداد اس سے بھی بہت زیادہ تھی۔ طلبا کا ایجی ٹیشن ساری وادی میں پھیل گیا اور حکومت کو سرینگر کے علاوہ سوپور اور بارہمولہ میں ۴۸ گھنٹے کا کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ عوامی غم و غصہ کا اظہار ایک زبردست ہڑتال کے ذریعے کیا گیا۔ عوام اس احتجاج میں شریک ہوگئے اور سری نگر کے علاوہ اسلام آباد، سوپور، بانڈی پورہ، بارہمولہ اور دیہات میں بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکالے گئے۔

۲۳ اگست ۱۹۶۹ء کو سری نگر میں جو زبردست مظاہرہ ہوا، مسلح پولیس نے اس پر قابو پانے کے لیے طاقت کا بھرپور استعمال کیا، جب کہ لاٹھی، گولی چلائی گئی، جس سے ایک شخص موقع پر ہلاک اور درجنوں زخمی ہوگئے۔ سری نگر کے اندرونی علاقوں میں ۴۸ گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ لوگ تشدد پر اتر آئے تھے۔ زینہ کدل بازار کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی، لیکن صادق حکومت نے اس ایجی ٹیشن کو محاذ رائے شماری اور دوسرے لیڈروں کے تعاون سے دبا دیا۔ سوپور میں ۹۶ گھنٹے تک کرفیو نافذ رہا جب کہ سرینگر میں ایک ہفتے تک کرفیو نافذ رہا۔ صورت حال اس قدر بگڑ گئی کہ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو خود سری نگر آنا پڑا۔ انھوں نے سرینگر میں ۴ دن تک قیام کیا اور اپنی پارٹی کے ریاستی لیڈروں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جس کی ریاستی کانگریس کے صدر سید میر قاسم نے بھرپور حمایت کی۔ لیکن وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق اس پر آمادہ نہیں ہو سکے۔ ان ایام میں شیخ محمد عبداللہ نے اپنے آپ کو غیر سیاسی کاموں میں مصروف رکھنے کے لیے درگاہ حضرت بل کی تعمیر نو کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے فنڈ جمع کرنے کی ایک مہم شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ نئی دہلی سے بھی رابطہ قائم کیے رہے۔ چنانچہ یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء کو خان عبدالغفار خان جب نئی دہلی آئے تو شیخ محمد عبداللہ

بھی نئی دہلی گئے اور ان سے کشمیر کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ انھیں کشمیر آنے کی دعوت بھی دی گئی لیکن جب بادشاہ خان کو یہ معلوم ہوا کہ کشمیری عوام ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور یہاں ان کا خیر مقدم نہیں کیا جائے گا تو وہ کشمیر نہیں آئے۔ البتہ خان صاحب نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو نئی دہلی میں اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے کہا: "میں کشمیریوں کے لیے ہندوستان کے اندر اسی قسم کے حق میں ہوں جس قسم کا حق میں پٹھانوں کے لیے پاکستان کے اندر چاہتا ہوں۔ تاہم اس بارے میں کشمیری عوام سے بھی پوچھا جانا چاہیے۔" اس موقع پر خان عبدالغفار خان اور مسٹر جے پرکاش نارائن کی مشترکہ کوششوں سے شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی کے درمیان مفاہمت کا ایک نیا پلان پیش کیا گیا۔ اس نئے پلان پر شیخ محمد عبداللہ نے بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور نئی دہلی نے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ پلان بھی نئی دہلی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان مفاہمت کی تجویزوں پر مبنی تھا اور اس کے لیے کشمیر کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کی رضامندی بھی حاصل کر لی گئی تھی۔

تاہم وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم کے درمیان اس مسئلے پر اختلافات تھے۔ سید میر قاسم کو نئی دہلی کے ایک وسیع حلقے کی حمایت بھی حاصل تھی اور یہ حلقہ غلام محمد صادق کی ——— جگہ مسٹر قاسم کو وزیر اعلیٰ بنانا چاہتا تھا لیکن وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی انتہائی اقدام کرنے میں پس و پیش کر رہی تھیں اور اس کی اصل اور حقیقی وجہ یہ تھی کہ وہ شیخ محمد عبداللہ سے خائف تھیں۔ انھیں یہ خدشہ تھا کہ اگر شیخ محمد عبداللہ سے مفاہمت ہو بھی گئی تو وہ دیرپا ثابت نہ ہو سکے گی۔ مسز اندرا گاندھی خود اپنی پارٹی کے اندر بڑے پیمانے پر مخالفت کا سامنا کر رہی تھیں۔ اسی مخالفت کی بنا پر آل انڈیا کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ مسز گاندھی کی قیادت میں چلا گیا اور دوسرے حصے پر مسٹر مرارجی ڈیسائی اور ان کے ساتھیوں کی سربراہی قائم ہوگئی۔ کشمیر کی داخلی صورت حال اور برسر اقتدار کانگریس میں شکست نے محاذ رائے شماری کے لیڈروں کو بڑی حد تک اطمینان سے رہنے دیا لیکن لوگ اس پر خوش نہیں تھے اور ریاست کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کا موقف بھی نئی دہلی کے بارے میں سخت ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان کے اور سید میر قاسم کے درمیان اختلافات وسیع ہوتے جا رہے تھے اور ہندوستان کی وزارت داخلہ سید میر قاسم کی اس سلسلہ میں پشت پناہی کر رہی تھی

کہ جب ہندوستان کے وزیرِ داخلہ مسٹر چوان، صادق قاسم جھگڑے کو طے کرنے کے لئے سرینگر آئے تو وزیرِ اعلیٰ غلام محمد صادق اور مسٹر چوان کے درمیان گیسٹ ہاؤس میں بات چیت کے دوران سخت تکرار ہوئی۔ مسٹر چوان نے غلام محمد صادق سے کہا۔ "آپ کے اور سید میر قاسم کے درمیان اختلافات نئی دہلی کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ یہ اختلافات قومی مفاد میں نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کو میر قاسم کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کر لینا چاہیئے۔" غلام محمد صادق پہلے ہی خفا تھے۔ مسٹر چوان کی اس ہدایت جو احکامات کے مترادف تھی پر وہ بے قابو ہو گئے اور انہوں نے مسٹر چوان سے کہا۔ "آپ ہوم منسٹر ہیں امن و قانون کے مسئلے پر مجھ سے بات کرنا چاہیں تو میں تیار ہوں۔ پارٹی کے معاملات پر میں آپ سے کوئی بات نہیں کر سکتا"۔ اس پر چوان بھی غصے میں آ گئے اور انہوں نے غلام محمد صادق سے کہا۔ "آپ ہماری بات مانیں ورنہ آپ کو مستعفی ہو جانا چاہیئے"۔ اس پر غلام محمد صادق کمرے سے چلے گئے اور جب وہ سیڑھیوں سے نیچے آ رہے تھے تو ان کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے وہ انتہائی غصے میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی کار کی طرف بڑھے اور اس میں بیٹھ کر اپنی قیام گاہ کو چلے گئے۔ مسٹر چوان نے اس کے بعد میر قاسم کے ساتھ قریباً اڑھائی گھنٹے تک بات چیت کی۔ اس کے اگلے دن وہ نئی دہلی روانہ ہو گئے۔ ان دنوں کشمیر میں بڑے پیمانے پر تشدد کی وارداتیں بھی ہو رہی تھیں اور شہر اور دیہات میں کوئی شخص خود کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ تشدد کی یہ وارداتیں ایک منصوبے کے تحت ہو رہی تھیں۔ لیکن حکومت اس کی بڑی سختی کے ساتھ پردہ پوشی کر رہی تھی۔ ادھر جب آل انڈیا کانگریس کے دو حصوں میں بٹ جانے کے بعد مسز اندرا گاندھی اقتدار پر چھا گئیں اور ان کی حمایت سے مسٹر وی وی گری ہندوستان کے نئے صدر منتخب ہو گئے تو شیخ محمد عبداللہ نے ۱۲ جنوری کو نئی دہلی جا کر نئے صدر کے ساتھ کشمیر کے معاملے پر مذاکرات شروع کئے۔ شیخ صاحب نے نئی دہلی میں اپنے قیام کے دوران مسز اندرا گاندھی اور مسٹر وائی بی چوان سے بھی متعدد ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کے بارے میں مرزا محمد افضل بیگ نے یہ کہا۔ "ہم آنے والے انتخابات کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں"۔ اور ان کی یہ خواہش ہے کہ انہیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ اس سلسلے میں محاذ رائے شماری کے صدر نے ہندوستان کے چیف الیکشن کمشنر مسٹر ورما کے ساتھ بھی طویل بات چیت کی۔ محاذ

رائے شماری بیک وقت دو مختلف قسم کے موقف اپنا رہا تھا۔ تاہم لوگوں میں جو یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ محاذ اپنے موقف سے ہٹ رہا ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے محاذ کے جنرل سیکریٹری خواجہ غلام محمد شاہ نے ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ "محاذ رائے شماری انتخابات میں اس لئے حصہ لینا چاہتا ہے تاکہ کشمیر کا مسئلہ کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق حل ہو سکے"۔ ادھر پاکستان اس ساری صورت حال پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ چنانچہ ۲۹ جنوری ۱۹۷۰ کو پاکستان کے صدر جنرل محمد یحییٰ خان نے ہندوستان کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کو ایک مراسلہ بھیجا۔ جس میں انہوں نے ہندوستان سے یہ کہا کہ کشمیر کا تنازعہ اعلانِ تاشقند کی بنیاد پر ہی طے ہو سکتا ہے اور اس کے سوا جو بھی کوشش کی جائے گی، پاکستان اسے قبول نہیں کرے گا۔ کشمیر میں محاذ رائے شماری نے انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ تو عام لوگوں نے اس کی کوئی خاص حمایت نہیں کی۔ جب شیخ محمد عبداللہ نے یہ محسوس کیا تو انہوں نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں انہوں نے یہ اعلان کیا۔ "میں کشمیری عوام کے لئے حق خود اختیاری کے معاملے سے کسی بھی طرح دستبردار نہیں ہو سکتا۔ کشمیری عوام نے اپنا یہ مطالبہ منوانے کے لئے جو قربانیاں دی ہیں ان کے پیشِ نظر میں ان کے جائز مطالبے کو ترک نہیں کر سکتا"۔ کشمیر میں محاذ کی طرف سے انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا جنگ بندی سرحد کی دوسری طرف شدید ردِ عمل ہو رہا تھا۔ اور وہاں برابر یہ قیاس آرائیاں زور پکڑتی جا رہی تھیں کہ محاذ رائے شماری اپنے موقف سے ہٹ رہا ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۷۰ میں جنگ بندی سرحد پر فوجی نقل و حرکت میں اضافہ ہو گیا۔ اور مسلح جھڑپیں ہونا شروع ہو گئیں۔ اسی دوران آزاد کشمیر کے دو ایجنٹ خفیہ طور پر سرینگر آئے اور یہاں میر واعظ منزل میں مولوی محمد فاروق کے ساتھ بات چیت کی اور انہیں ہدایت دی کہ وہ کشمیری عوام کو انتخابی میدان سے الگ رکھنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ مولوی فاروق نے ۲۰ فروری ۱۹۷۰ کو جامع مسجد سرینگر میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا۔ مولوی محمد فاروق کے اس اعلان سے محاذ رائے شماری کی سیاسی پوزیشن کو مزید دھکا لگا۔ مولوی فاروق کے اس اعلان کے صرف ایک دن بعد مسز اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں شیخ محمد عبداللہ جو اس وقت نئی دہلی میں تھے، کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس

موقع پر شیخ محمد عبداللہ اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان اڑھائی گھنٹے تک بات چیت ہوئی اور دونوں کے درمیان اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ پیپلز کونشن کو کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچانے کے لیے ہر ممکن اقدام کیے جائیں۔ چنانچہ ہندوستان کی حکومت نے اس تجویز سے بھی اتفاق کر لیا کہ کونشن کے دوسرے سیشن میں پاکستان میں مقیم کشمیری مندوبین کو سرینگر آنے کی اجازت دی جائے تاکہ کشمیر پیپلز کونشن کے فیصلے کو ایک خاص سیاسی اہمیت بن سکے۔ اس کے ساتھ ہی محاذ رائے شماری کے جو عہدیدار نظر بند تھے انہیں آہستہ آہستہ رہا کیا جانے لگا۔ مسز اندرا گاندھی بیک وقت اور ایک ہی تیر سے دو شکار کھیلنا چاہتی تھیں۔ ایک طرف شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مذاکرات میں انہیں ان کے بنیادی مطالبے سے دستبردار ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش ہو رہی تھی اور دوسری طرف جموں کشمیر اسمبلی میں وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ غلام محمد صادق ساری صورت حال سے باخبر تھے۔ انہوں نے اپنے حقوق کا استعمال کرتے ہوئے اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ عرصے تک کیلئے ملتوی کر دیا۔ جب اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہو گیا تو اسی شام وزیر اعلیٰ نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا۔ "اب نئی دہلی کے لئے صرف دو راستے رہ گئے ہیں۔ ایک یہ کہ مجھے بالکل اسی طرح برطرف کیا جائے جس طرح شیخ محمد عبداللہ کو ۱۹۵۳ء میں کیا گیا تھا اور دوسرا یہ کہ موجودہ اسمبلی توڑ کر گورنر راج نافذ کیا جائے۔" اسکے اگلے دن مسز اندرا گاندھی نے غلام محمد صادق اور سید میر قاسم کو نئی دہلی طلب کیا۔ جہاں شیخ محمد عبداللہ پہلے سے ہی موجود تھے۔ محاذ رائے شماری نے بھی موقعہ غنیمت سمجھ کر اسمبلی توڑنے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اس مطالبے سے اسمبلی کے ممبران گھبرا گئے کیونکہ انہیں عوام نے منتخب نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہیں اس بات کی قطعی کوئی امید تھی کہ وہ دوبارہ منتخب ہو سکیں گے۔ ۳۲ ممبران نے ۶ مارچ کو نئی دہلی میں وزیر اعظم مسز گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔ ان ممبران اسمبلی کی قیادت سید میر قاسم کر رہے تھے۔ ان سب لوگوں نے مسز گاندھی کے سامنے جب یہ تجویز پیش کی کہ انہیں وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کی جگہ نیا پارٹی لیڈر منتخب کرنے کی اجازت دی جائے تو مسز گاندھی نے بھرے اجلاس میں ان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ کانگریس کے ممبر عبدالغنی لون جو ان دنوں سید میر قاسم کے حامی اور ان ۳۲ ممبران اسمبلی میں شامل تھے، نے دہلی سے واپس آ کر مجھے بتایا کہ وزیر اعظم مسز گاندھی نے ان کے اس مطالبے پر کہ انہیں پارٹی کا نیا لیڈر منتخب کرنے کی اجازت دی جائے۔ ان سب کو سخت بے عزت کیا اور مسز گاندھی کے

کہ یہ کہنے پر کہ "میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم سب لوگ کس طرح منتخب ہو کر اسمبلی کے ممبر بنے ہو" مجلس میں سناٹا چھا گیا اور سب شرم سے پانی پانی ہو کر رہ گئے۔" لون صاحب نے مجھے بتایا کہ مسز اندرا گاندھی نے ان سب کو زبردست جھاڑ پلائی اور کہا کہ "آپ لوگ کس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ میں سے کون ممبر ایسا ہے۔ جو لوگوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر اسمبلی کا رکن بنا ہو؟ آپ لوگ تو ہماری مدد سے ممبر اسمبلی بنے ہیں۔ اس لئے یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ کشمیر میں کون وزیر اعلیٰ رہتا ہے۔ آپ لوگ جس طرح سے آئے ہیں اسی طرح واپس چلے جائیں۔" چنانچہ یہ ۳۲ ممبران اسمبلی مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے۔ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم نے الگ الگ بھی مسز گاندھی کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ ان کی واپسی پر جموں میں ۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو جب دوبارہ ریاستی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا تو اس میں غلام محمد صادق کی قیادت پر اظہار اعتماد اور نئے مالی سال کا بجٹ پاس ہو گیا۔ ان واقعات کے بعد محاذ رائے شماری نے وادی میں بھرپور انتخابی سرگرمیاں شروع کر دیں اور لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ انتخابات میں حصہ لینا کشمیر کا مسئلہ حل کروانے کی ہی ایک کوشش بھی ہو جائے۔ محاذ کے لیڈروں نے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ بلدیاتی انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان بھی کیا گیا۔ محاذ رائے شماری کے اس اعلان پر سرینگر میں طلباء اور نوجوانوں نے ایک قسم کا ایجی ٹیشن شروع کیا اور توڑ پھوڑ کے واقعات شروع ہو گئے۔ توڑ پھوڑ کے ان واقعات کے بارے میں ایک سرکاری ترجمان نے سرینگر میں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ حکومت کو توڑ پھوڑ کی وسیع پیمانے پر کارروائیاں شروع ہونے کی اطلاعات ملی ہیں۔ ترجمان نے انکشاف کیا کہ وادی کے مختلف حصوں میں آتشزنی کی جو وارداتیں ہوئی ہیں ان میں ڈیڑھ سو مکان جلائے گئے ہیں اور کئی گاؤں بالکل خاکستر ہو چکے ہیں۔ اسی اثنا میں شیخ محمد عبداللہ جو صرف دس دن قبل نئی دہلی سے سرینگر آئے تھے، ۱۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو پھر نئی دہلی گئے جہاں انہوں نے وزیر اعظم مسز گاندھی اور دوسرے لیڈروں سے پھر مذاکرات شروع کئے۔ ان مذاکرات کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ ہندوستان کی حکومت اپنے اس وعدے سے پھر گئی ہے کہ وہ پاکستان یا آزاد کشمیر سے کسی شخص کو پیپلز کونشن کے اگلے اجلاس میں شرکت کیلئے سرینگر آنے کی اجازت دے گی۔ تاہم شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی سے واپس آ کر ضلع ڈوڈہ میں انتخابات کے لئے محاذ رائے شماری کی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہوئے یہ اعلان

کیا کہ محاذ رائے شماری کی انتخابات میں شرکت کشمیر کے بنیادی مسئلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہ مسئلہ حق خود اختیاری کی بنیاد ہی پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ۱۳ مئی کو سرینگر میں کشمیر پیپلز کنونشن کی سٹیرنگ کمیٹی کا شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں پھر اجلاس ہوا جس میں کہا گیا کہ کشمیر کی سیاسی صورتحال بگڑ چکی ہے۔ اس لئے موجودہ حکومت کو برخاست کیا جانا چاہئیے۔ اسی دوران ۲۱ مئی ۱۹۷۰ کو شیخ محمد عبداللہ نے جموں میں ایک آل پارٹیز کانفرنس بھی طلب کی جس میں کشمیر کی دگرگوں صورتحال پر اصلاح مشورہ کیا گیا۔ اس کانفرنس کے بعد بتایا گیا کہ وادی میں آتشزنی کی جو وارداتیں ہوئی ہیں۔ ان میں اب تک ۳ ہزار سے زیادہ مکان خاکستر ہو چکے ہیں۔ اس کے ایک ہفتے بعد کشمیر پیپلز کنونشن کا دوسرا مکمل اجلاس بھی بلایا گیا۔ جس میں مختلف حلقوں کی طرف سے پیش کئے گئے کشمیر کے مسئلے کے مختلف اور متبادل حل زیر بحث لائے گئے۔ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے اعلان کیا کہ اس کنونشن کا مقصد کشمیر کے تنازعہ کا کوئی متفقہ حل تلاش کرنا اور اسے ہندوستان اور پاکستان کے سامنے پیش کرنا ہے۔ کنونشن میں آزاد کشمیر کے لیڈروں کی طرف سے بھیجی گئی ایک تحریر پڑھ کر سنائی گئی جس میں ریاست جموں کشمیر کو خودمختار ملک بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ کنونشن کی کاروائی سے عیاں ہو رہا تھا کہ کوئی متفقہ حل تلاش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں مختلف خیال کے لوگ شامل تھے۔ ایک خیال کے لوگ کشمیر کی پاکستان میں شمولیت، دوسرے خیال کے لوگ اسے ہندوستان کا اٹوٹ انگ اور تیسرے خیال کے لوگ اسے خودمختار رکھنے پر زور دیتے تھے۔ کنونشن کے آخری اجلاس میں سیکولرازم کی تشریح پر اختلافات شدید ہو گئے اور اس میں نظریاتی تضاد کی بنیاد پر پھوٹ پڑ گئی اور اس طرح مختلف خیال کے لوگوں کے اتفاق رائے سے کشمیر کا کوئی سیاسی حل تلاش کرنے کی یہ کوشش جسے کشمیر پیپلز کنونشن کا نام دیا گیا تھا ناکام ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۳ جولائی کو وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی سرینگر آئیں اور یہاں انہوں نے سرکاری لیڈروں کے ساتھ کشمیر کے داخلی مسائل پر بات چیت کی۔ مسز اندرا گاندھی کی آمد کے دوسرے دن سرینگر میں طلبا اور نوجوانوں کا بہت بڑا جلوس نکلا اور انہوں نے کشمیر میں شہری آزادی سلب کرنے اور کشمیر کا مسئلہ حل کرنے میں تاخیر کے خلاف تشدد آمیز مظاہرے کئے۔ پولیس نے بڑی بے دردی کے ساتھ لاٹھی چارج کیا اور بہت سے طلبا کی مار پیٹ کرنے کے علاوہ درجنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مسز گاندھی

نے نئی دہلی واپس جا کر وزیر اعلیٰ اور بعض بڑے سرکاری افسروں کو دہلی طلب کیا اور وہاں کشمیر کی داخلی صورت حال کے بارے میں ایک نئی حکمت عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ادھر وادی میں طلبا اور نوجوانوں کا ایجی ٹیشن پھیل گیا اور ساری وادی میں امن و قانون درہم برہم ہو گیا۔ اسی دوران ایک سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے اپنی پارٹی نیشنل کانفرنس کو توڑ کر کانگریس میں شامل ہو جانے کی پیش کش بھی کر دی۔ ہندوستان کی پالیسیوں میں کچھ نئی تبدیلیاں محسوس کرنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۱۵ اگست ۱۹۷۰ کو پھر دہلی گئے۔ جہاں انہوں نے انسانی بیداری نام کے کنونشن میں شمولیت کی۔ اس کنونشن کا اہتمام مسٹر جے پرکاش نارائن نے کیا تھا اور اس میں تقریر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کنونشن میں مسٹر جے پرکاش نارائن کو صدر اور شیخ صاحب کو نائب صدر بنایا گیا۔ اس کنونشن کا مقصد سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنانا تھا۔ دوسری طرف کشمیر میں محاذ رائے شماری نے انتخابات کے لئے تیاریاں شروع کر دیں اور شیخ محمد عبداللہ نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ کو بانڈی پور میں جو پہلا انتخابی جلسہ کیا، اس میں انہوں نے عوام سے باقاعدہ اپیل کی کہ وہ آئندہ انتخابات میں محاذ رائے شماری کو ووٹ دیں۔ اس کے ساتھ ہی مولوی محمد فاروق نے انتخابات کے بائیکاٹ کی ایک مہم سی شروع کر دی۔ بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کی وزیر اعظم مسز گاندھی نے ماسکو میں روسی لیڈروں کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر مشورہ کیا اور پاکستان کے صدر یحییٰ خان نے واشنگٹن جا کر صدر نکسن کے ساتھ اس مسئلے پر بات چیت کی۔ وادی میں محاذ رائے شماری کے ساتھ ساتھ کانگریس نے بھی انتخابی سرگرمیاں شروع کر دیں اور دونوں پارٹیوں کے لیڈروں نے اپنے سیاسی جلسوں میں ایک دوسرے پر زوردار حملے شروع کر دیئے۔ کانگریس کے لیڈر عوام سے یہ کہہ رہے تھے کہ محاذ رائے شماری نے اپنا موقف بدل لیا ہے اور اسکے لیڈر حق خود ارادیت کے حصول کی بجائے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں اور محاذ رائے شماری کے جلسوں میں محاذی لیڈر بار بار عوام کو یہ یقین دلا رہے تھے کہ ان کی جدوجہد کا مقصد رائے شماری کروانا ہے اقتدار حاصل کرنا نہیں! جب عوام میں بے چینی بڑھنے لگی تو ۱۲ نومبر ۱۹۷۰ کو شیخ محمد عبداللہ پلوامہ گئے جہاں انہوں نے ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "میں اگرچہ عمر رسیدہ ہو چکا ہوں۔ لیکن

آپ کو ایک بات ہمیشہ کے لئے یاد رکھنی چاہیئے کہ جب تک میں زندہ ہوں میں حق اور انصاف اور کشمیری عوام کے پیدائشی حق حقِ خود ارادیت کے لئے لڑتا رہوں گا۔" اسی جلسے میں انہوں نے اعلان کیا۔ "میں درگاہ حضرت بل کی تعمیر کا کام کر رہا ہوں۔ جس کے لئے مجھے ۵۰ لاکھ روپے چاہئیں اور مجھے یہ امید ہے کہ لوگ یہ روپیہ فراہم کر دیں گے۔" آنے والے انتخابات کے سلسلے میں نئی دہلی متفکر تھی چنانچہ اس نے غلام محمد صادق ایک سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد اور سید میر قاسم کے علاوہ تمام ہندوستان نواز لیڈروں کا ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ دوسری طرف پاکستان میں جنرل یحییٰ خان نے عام انتخابات کروائے جس کے نتیجے میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی جیت گئی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کامیاب ہو گئی۔ ان انتخابی نتائج کا کشمیر میں کچھ اچھا ردِ عمل نہیں ہوا اور لوگوں میں یہ تشویش پیدا ہو گئی کہ انتخابی نتائج پاکستان کی تقسیم کا موجب بن جائیں گے۔

صورتِ حال بڑی تیزی سے بدل رہی تھی اور سارے برصغیر میں کشیدگی، تذبذب اور بے چینی پھیل رہی تھی۔ اندر ہی اندر کیا ہو رہا تھا یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اچانک وزیرِ اعظم ہند کے کشمیر آنے کا اعلان کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی انڈین پارلیمنٹ توڑنے اور درمیانی مدت کے چناؤ کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ وزیرِ اعظم ہند ۲۲ دسمبر کو ایک فوجی طیارے میں نئی دہلی سے لداخ گئیں۔ جہاں ایک دن قیام کے بعد وہ اگلے روز جموں پہنچیں۔ جہاں انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ "جب تک محاذِ رائے شماری اپنا موقف تبدیل نہیں کرتا اسے انتخابات لڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔" اس اعلان کا محاذ رائے شماری کے لیڈروں میں بڑا مایوس کن ردِ عمل ہوا اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ "ہم حقِ خود ارادیت کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہو سکتے اور ہم نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ بھی کیا ہے جس پر ہم قائم ہیں۔" ۲۳ دسمبر کو مسز گاندھی سرینگر آئیں اور یہاں اعلان کیا۔ "میں ہندوستان کی وزیرِ اعظم کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں اور یہ سارے ہندوستان کی رائے ہے کہ ہم اپنی علاقائی سالمیت کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کریں گے۔ کشمیر میں کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ آئین کی وفاداری کا حلف اٹھا کر اسمبلی میں جائیں گے اور اسمبلی میں آئین کو توڑنے کی باتیں کریں گے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔" انہوں نے یہ بھی کہا کہ محاذ رائے شماری کو انتخابات لڑنے سے روکنے کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے گا، کیا جائے گا۔ مسز گاندھی

کی نئی دہلی میں واپسی پر اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کی لوک سبھا توڑ دی گئی ہے اور اس کے لئے یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو انتخابات کروائے جائیں گے۔ محاذ رائے شماری نے پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا کہ محاذ کے صدر مرزا محمد افضل بیگ ضلع اسلام آباد کی نشست سے، خواجہ مبارک شاہ بارہ مولہ کی اور خواجہ غلام محمد شاہ سرینگر کی نشست سے انتخاب لڑیں گے۔ شیخ محمد عبداللہ نئی صورتِ حال پر بات چیت کرنے کے لئے دہلی گئے۔ وزیرِ اعلیٰ غلام محمد صادق بیمار تھے اور بمبئی کے ایک ہسپتال میں زیرِ علاج تھے کہ اسی اثنا میں ۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو ٹھیک بارہ بجے دوپہر جموں کشمیر بینک کی کشمیر یونیورسٹی شاخ میں ایک ڈرامائی واردات ہوئی۔ جب کہ ۴ وردی پوش مسلح نوجوان بینک میں داخل ہو گئے اور انہوں نے بینک کا سارا روپیہ اپنی تحویل میں لے لیا۔ وردی پوش بظاہر پولیس افسر لگتے تھے۔ بینک کے منیجر سے پستول کی نوک پر ایک لاکھ روپیہ حاصل کیا اور منیجر اور خزانچی کو بھی اغوا کر لیا۔ ان دونوں کو بعد میں ڈیڑھ میل سفر کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا اور بینک لوٹنے والے ۴ وردی پوش جس گاڑی میں آئے تھے اسی میں سوار ہو کر فرار ہو گئے۔ بینک کا خزانچی ان وردی پوش نوجوانوں میں سے ایک کو پہچان چکا تھا۔ کیونکہ وہ اس کا کالج میں کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ جو نئی دہلی میں تھے نے ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کا جب کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو وہ ۸ جنوری کو واپس سرینگر آنے کے لئے پالم ہوائی اڈے پر جہاز میں سوار ہوئے۔ ان کے جہاز میں بیٹھنے کے دس منٹ بعد جہاز کی سرینگر کے لئے پرواز روک دی گئی اور بظاہر اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جہاز میں ایک بم رکھا گیا ہے۔ بعد میں پُراسرار اور مضحکہ خیز طور پر طیارہ کی اڑان منسوخ کر دی گئی اور مسافروں سے کہا گیا کہ وہ اب کل جا سکتے ہیں۔



مرزا محمد افضل بیگ جموں میں تھے اور شیخ صاحب کے داماد خواجہ غلام محمد شاہ نئی دہلی میں تھے۔ ۸ جنوری ۱۹۷۱ء صبح پانچ بجے شیخ محمد عبداللہ اور غلام محمد شاہ کو ان کی رہائش گاہ ۳ ۔ ۵ کوٹلہ لین پر یہ تحریری حکم پیش کیا گیا کہ ریاستی حکومت نے پبلک سیکورٹی ایکٹ کے تحت ان کے جموں کشمیر کی حدود کے اندر داخلے پر پابندی لگا دی ہے۔ اسی روز دوپہر کو ریاست کے چیف سیکرٹری ایم۔ ایس۔ واتے نے سرینگر میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں انہوں نے ان فیصلوں کا اعلان کیا اور بتایا کہ سیکورٹی ایکٹ کے تحت محاذ رائے شماری کے تین سو سے زیادہ اراکین کو گرفتار کر لیا گیا ہے حالانکہ حقیقت میں گرفتاریوں کی تعداد اس سے تین گنا زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ۱۲ جنوری کو نئی دہلی میں وزارت داخلہ کی طرف سے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا گیا جس میں محاذ رائے شماری کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو کشمیر کے انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر سریندر ناتھ سیٹھی نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ پولیس نے کشمیر میں "الفتح" نام کی ایک خفیہ تنظیم کا سراغ لگا لیا ہے اور اس تنظیم کے ۲۲ سرکردہ ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے بتایا۔ "الفتح نے یکم اپریل ۱۹۷۰ء کو [illegible]

۱۷



میں تحصیل ایجوکیشن آفس پر حملہ کیا تھا اور وہاں سے ۲۰ ہزار روپیہ حاصل کئے تھے۔ پلوامہ سے حاصل کئے گئے ۱۰ ہزار روپے الفتح تنظیم کے پھیلاؤ اور دوسرے مقاصد پر صرف کئے گئے۔ ان لوگوں نے سرینگر سے چودہ میل کے فاصلہ پر بارسُو میں ایک خفیہ جگہ اپنا ہیڈ کوارٹر بھی قائم کیا اور وہاں سے آزادی کی تحریک چلانے کے لئے مسلح کارروائیوں کا آغاز کیا گیا۔ الفتح کا ہیڈ کوارٹر بارسُو میں آبادی سے دور ایک مکان میں رکھا گیا۔ اس مکان کی تعمیر پر پچاس ہزار روپے صرف کئے گئے اور اس کے قریب ہی دس ہزار روپے کا ایک فارم خریدا گیا۔ جسے الفتح کی سرگرمیوں کے لئے وقف رکھا گیا۔ الفتح والوں نے مختلف مقامات پر فوجیوں سے ہتھیار چھین لینے اور سرینگر میں سٹیٹ بینک آف انڈیا کو لوٹنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو بعد دوپہر جموں کشمیر بینک کی یونیورسٹی شاخ پر حملہ کیا اور وہاں سے ایک لاکھ روپے لے گئے۔ اس حملے میں مسلح افراد کا لیڈر ڈی ایس پی کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ جسے بینک کے خزانچی نے کالج میں کلاس فیلو ہونے کی بنا پر شناخت کر لیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے اخباری نمائندوں کو اس شخص کا نام فاروق احمد بٹ بتایا جو سرینگر کے ایک سابق کانگریسی ممبر اسمبلی خواجہ عبدالخالق بٹ کا بیٹا ہے۔ "اور اس نے پوچھ گچھ کے دوران الفتح تنظیم کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ پولیس اس تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کی تلاشی کرنے کے لئے بارسُو گئی۔ جہاں ہیڈ کوارٹر میں قیام پذیر الفتح کے نوجوانوں اور مسلح پولیس کے درمیان مختصر سی جنگ ہوئی لیکن گولہ بارود ختم ہو جانے کی وجہ سے الفتح والوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور پولیس نے ان کے ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر لیا۔" اس کے بعد اس تنظیم کے باقی ماندہ افراد کو بھی مختلف مقامات سے گرفتار کر لیا گیا۔ جن کی تعداد اطلاعاً سو سے زیادہ تھی۔ اس کے پانچ دن بعد ۲۳ جنوری کو کشمیر کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پیر غلام حسن شاہ نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ——— "الفتح تنظیم کا مقصد کشمیر میں آزادی کے لئے گوریلا طرز کی جنگ شروع کرنا تھا۔ گوریلا جنگ کی تربیت کے لئے ایک جنگل میں ایک خفیہ مرکز قائم کیا گیا تھا جہاں پاکستان کا ایک بریگیڈیئر اصغر خان دو کرنل بشیر احمد اور مسٹر علوی اور ایک میجر لطف احمد کشمیری نوجوانوں اور طلبا کو گوریلا جنگ کی تربیت دے رہے تھے۔" انہوں نے بتایا کہ پولیس نے اب تک بہت سی دستاویزات اور قومی اہمیت کے نقشے ضبط کئے ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی رائفلیں، دستی بم اور ایک ٹائپ مشین پر قبضہ کر لیا ہے۔" ڈی آئی جی نے بتایا کہ ——— "اس خفیہ تنظیم کے ساتھ کشمیر سٹوڈنٹس

فیڈریشن، کشمیر ینگ مینز لیگ اور طلبا کی کچھ دوسری تنظیمیں بھی وابستہ تھیں اور اس کا ہیڈ کوارٹر اور تربیتی مرکز جو ایک جنگل میں تھا، آپس میں زیر زمین دور راستے سے ملائے گئے تھے۔ بارسُو کے ہیڈ کوارٹر سے دریائے جہلم تک ایک سرنگ بھی کھودی جا رہی تھی تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ الفتح تنظیم میں دو مجسٹریٹ، تین ڈاکٹر اور چھ پروفیسر بھی شامل تھے اور پولیس نے ان سب کو گرفتار کر لیا ہے۔" الفتح تنظیم کے ممبران کی گرفتاری کے بعد طلباء اور نوجوانوں کے حوصلے بڑی حد تک پست ہو گئے۔ ایک اندازے کے مطابق محاذ رائے شماری کے علاوہ طلبا اور نوجوانوں کی تنظیموں کے جن ممبران کو گرفتار کیا گیا تھا ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہو گئی تھی۔ ان واقعات کے صرف ایک ہفتے بعد ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو انڈین ایئر لائنز کا ایک فوکر فرینڈشپ طیارہ "گنگا" جو سرینگر سے جموں جا رہا تھا، نہایت پُراسرار اور معنی خیز طریقے پر لاہور ہائی جیک کیا گیا۔ بظاہر یہ بتایا گیا کہ یہ طیارہ الفتح والوں نے اغوا کیا ہے لیکن ریاست کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق نے اس ہائی جیکنگ پر ایک ڈرامائی بیان دیا۔ انہوں نے اپنے اس بیان میں کہا کہ یہ طیارہ آزادی کا کوئی مجاہد اغوا کر کے نہیں لے گیا ہے بلکہ اسے ہندوستان کے بارڈر سکیورٹی فورس کے ایک تنخواہ دار ملازم ہاشم قریشی نے اغوا کیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے بتایا کہ حکومت کشمیر نے سکیورٹی فورس والوں سے کئی بار یہ کہا تھا کہ وہ ہاشم قریشی کو ہمارے حوالے کر دیں کیونکہ اس کی سرگرمیوں کے بارے میں ریاستی حکومت کے پاس یہ اطلاعات ہیں کہ وہ پاکستان آتا جاتا ہے لیکن سکیورٹی فورس والوں نے یہ کہہ کر اسے ہمارے حوالے کرنے سے انکار کر دیا کہ ہاشم قریشی ایک خاص منصوبے کے تحت بارڈر سکیورٹی فورس کے لئے کام کر رہا ہے۔ طیارہ اغوا کرنے والوں نے حکومت پاکستان سے پوچھے بغیر اسے لاہور کے ہوائی اڈے پر نذر آتش کر دیا۔ البتہ لاہور ہوائی اڈے کے حکام نے اس کے ۲۶ مسافروں کو بچا لیا۔ اور انہیں بڑی حفاظت کے ساتھ واپس ہندوستان بھیج دیا۔ بعد میں طیارہ اغوا کرنے والے دونوں اشخاص ہاشم قریشی اور محمد اشرف کو پاکستان میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اور ان پر پاکستان کے خلاف ایک سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس واقعہ کے سلسلے میں جب اصل حقائق منظر عام پر آئے تو معلوم ہوا کہ حکومت ہندوستان، مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی تحریک کی جو پشت پناہی کر رہی تھی۔ اس طیارے کا اغوا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ چنانچہ سرینگر سے طیارہ اغوا کئے جانے کی بنا پر ہی ہندوستان نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہندوستان کے علاقے پر سے پاکستانی طیاروں

کی پرواز پر پابندی لگا دی۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جس دن یہ اغوا کیا جانے والا طیارہ سرینگر کے ہوائی اڈے سے روانہ ہوا تو ہوائی اڈے پر ہندوستان بارڈر سکیورٹی فورس کے دو اہلکار اور افسر موجود تھے اور جب کشمیر پولیس کے ایک افسر نے اُن سے اُن کی ہوائی اڈے پر موجودگی کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے اُسے بتایا ـــــ "الفتح والے جا رہے ہیں ہم انہیں رخصت کرنے آئے ہیں"۔ اور اُن کا یہ جملہ اگلے دن نئی دہلی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی روزنامے میں جوں کا توں چھپ گیا۔ اس کے بعد فروری میں ہندوستان کی لوک سبھا کے لئے انتخابات کا وقت آ گیا۔ ان انتخابات کے سلسلے میں وادی میں کانگریس کے جو تین اُمیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک سابق وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد تھے جو سرینگر سے لوک سبھا کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ بخشی صاحب کے مقابلے میں ایک آزاد اُمیدوار شمیم احمد شمیم کھڑا ہوا تھا جس نے کسی نہ کسی طرح شیخ محمد عبداللہ کی حمایت حاصل کر لی۔ چنانچہ شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی سے کشمیر کے ووٹروں سے براہِ راست اپیل کی کہ وہ شمیم صاحب کو کامیاب بنائیں اور اس کے علاوہ بیگم عبداللہ کو سرینگر بھیجا گیا۔ تاکہ وہ بخشی غلام محمد کے خلاف انتخابی مہم چلا سکیں۔ بیگم عبداللہ نے سرینگر آ کر مولانا مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کشمیری لوگوں نے انتخابات میں غیر معمولی دلچسپی لی اور کسی جمہوری ادارے کے لئے لوگوں کی مرضی سے کوئی نمائندہ منتخب ہوا۔ یہ الیکشن اس لحاظ سے تاریخی نوعیت کا تھا کہ پولنگ کے روز تقریباً ہر پولنگ بوتھ پر خواتین اور مردوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اور اُس دن اگرچہ برف گر رہی تھی لیکن اس کے باوجود ہزاروں لوگ ووٹ ڈالنے کے لئے پولنگ مرکزوں پر پہنچے۔ ان انتخابات میں عوام نے اپنی قوت کا لوہا منوایا اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کی طرف سے کھڑے کئے گئے اُمیدوار بخشی غلام محمد کو شکست ہو گئی۔ اور شیخ محمد عبداللہ کی حمایت سے شمیم احمد شمیم الیکشن جیت گئے۔

اُدھر لوک سبھا کے انتخابات میں مسز اندرا گاندھی کو زبردست اکثریت حاصل ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی پاکستان اور ہندوستان میں تناؤ اور جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان نے سخت رویہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ صدر جنرل محمد یحییٰ خان نے ایک ریڈیو براڈکاسٹ میں اعلان کیا کہ چونکہ مجیب الرحمن مشرقی پاکستان کو الگ کرنے پر بضد ہیں، اسلئے اُن کی جماعت عوامی لیگ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی پاکستان

کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ہندوستان نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر فوجی مداخلت شروع کر دی ہے۔ مشرقی پاکستان سے تقریباً ساٹھ لاکھ افراد ہجرت کر کے ہندوستان آ چکے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ کی سی کیفیت کا کشمیر میں نہایت ناخوشگوار ردِ عمل ہوا اور سرینگر میں طلبا اور نوجوانوں نے پھر ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ کشمیر میں اندرونی بے چینی اور مشرقی پاکستان میں مداخلت اور اُس کی علیحدگی کی تحریک کے خلاف کشمیری عوام میں غم و غصہ بڑھ گیا۔ چنانچہ وقفے وقفے کے بعد سرینگر اور وادی کے دوسرے حصوں میں مظاہرے اور توڑ پھوڑ کے واقعات رونما ہونے لگے جن کی بنا پر روزانہ درجنوں افراد کو گرفتار کیا جاتا۔ مختلف مقامات پر گھروں کی تلاشیاں لی جاتیں اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جاتا تھا لیکن صورتِ حال کسی بھی طرح قابو میں نہیں تھی۔ اور اس پر نئی دہلی کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران کشمیر کے گورنر اور وزیرِ اعلیٰ کو دو مرتبہ نئی دہلی طلب کیا گیا اور اُنہیں ہدایات دی گئیں کہ کشمیر میں امن و قانون برقرار رکھنے کے لئے ہر ممکن کارروائی کی جائے۔ صورتِ حال کا مشاہدہ کرنے کیلئے ہندوستان کی وزیرِ اعظم خود بھی ۱۰ جون ۱۹۷۱ء کو کشمیر آئیں اور یہاں ضلع اسلام آباد اور ضلع بارہمولہ کا بھی دورہ کیا۔ وہ سرحدوں پر بھی گئیں جہاں کئی مقامات پر فوجیوں سے بھی خطاب کیا۔ نئی دہلی کے لئے واپسی سے پہلے سرینگر کے گیسٹ ہاؤس میں ہندوستان کی وزیرِ اعظم نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی۔ اس پریس کانفرنس میں، میں نے مسز گاندھی سے یہ پوچھا کہ کیا وہ موجودہ جنگ کا تناؤ کو کم کرنے کیلئے جنرل یحییٰ خان سے ملاقات کی تجویز قبول کر لیں گی؟ تو مسز گاندھی نے اس خیال کو سرے سے ہی مسترد کر دیا۔ میں نے ہندوستان کی وزیرِ اعظم سے شیخ محمد عبداللہ کی ریاست میں داخلے پر پابندی ہٹانے اور محاذِ رائے شماری کو خلاف قانون قرار دینے کے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کے بارے میں جب اُن کی رائے دریافت کی تو مسز گاندھی نے اس خیال کو بھی بڑی سختی سے مسترد کر دیا۔





ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشرقی پاکستان کے سوال پر کشیدگی اس حد تک بڑھ گئی کہ دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات ٹوٹ گئے اور مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب میں بھی دونوں ملکوں کے درمیان پوری سرحد پر مسلح جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ برصغیر کی اس صورت حال پر دنیا کے بیشتر ممالک کو تشویش ہوئی اور اقوام متحدہ نے بھی کوشش کرنا چاہی لیکن کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ ۸ اگست سنہ ۱۹۷۱ء کو روس کے وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو اعلیٰ فوجی افسروں کا ایک وفد لیکر نئی دلی آئے۔ جہاں دونوں ممالک میں دوستی کا معاہدہ ہوا اور یہ طے پایا کہ روس ہندوستان کی ہر طرح مدد کرے گا۔ اس سمجھوتے کی تفصیلات ہندوستان اور روس کے درمیان بہت پہلے طے پا چکی تھیں اور مسٹر گرومیکو محض رسمی طور پر اس معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے دلی آئے تھے۔ کشمیر میں محاذ رائے شماری کے جو لیڈر جیل سے باہر تھے۔ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کے خلاف احتجاج کیا تو ان سب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان میں سوپور کے صوفی محمد اکبر بھی شامل تھے ان گرفتاریوں کے خلاف اور شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے مطالبے کے حق میں ۹ اگست سنہ ۱۹۷۱ء کو ساری وادی میں زبردست احتجاجی ہڑتال کی گئی اور وادی کے مختلف حصوں میں ہندوستان کی طرف سے مشرقی پاکستان میں مداخلت کی کارروائیوں اور

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی حمایت کرنے کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے۔ کشمیر پر بڑھتی ہوئی اس بے چینی کا نئی دہلی پر شدید ردعمل ہوا اور اس بات پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ جموں کشمیر میں جنگ بندی سرحد پر اقوام متحدہ کے مبصرین کی ٹیم کے سربراہ نے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ کو بھی اپنے ایک مراسلے میں کشمیر پر بڑھتی ہوئی بے چینی سے باخبر کیا ہے۔ چنانچہ حالات کا خود مشاہدہ کرنے کے لئے ہندوستان کی وزیر اعظم [illegible] ستمبر کو پھر کشمیر آئیں اور یہاں عسکری لیڈروں اور فوجی افسروں کے ساتھ طویل صلاح مشورہ کیا چنانچہ وزیر اعظم کی سرینگر سے واپسی کے بعد سرینگر اور وادی کے دوسرے علاقوں میں جگہ جگہ مسلح پولیس بٹھا دی گئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کو ٹالنے کے لئے شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی نے مصالحت کی کوشش کی لیکن انہیں اس میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ۱۰ ستمبر کو ہندوستان کے وزیر دفاع مسٹر جگجیون رام سرینگر آئے اور یہاں فوجی کمانڈروں کے ساتھ کشمیر کی داخلی صورت حال کے علاوہ فوجی مسائل پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کے خطرات کے پیش نظر عرب ممالک میں زبردست تشویش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ صدر سادات نے قاہرہ میں متعین ہندوستانی سفیر کو طلب کیا۔ اور انہیں ہندوستان کی وزیر اعظم کے نام ایک مراسلہ دیا۔ جس میں ان سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ پاکستان کو توڑنے کی حمایت نہ کریں۔

اسی دوران اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ نے نئی دہلی اور راولپنڈی آکر مصالحت کی کوشش کی۔ جو ناکام رہی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۱ء کو کشمیر میں مسلح افواج کو کارروائی کے لئے چوکنا کر دیا گیا۔ ۸ نومبر کو پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ خان نے کولمبیا براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ اگرچہ ہندوستان نے کسی باقاعدہ جنگ کا اعلان نہیں کیا ہے لیکن دونوں ممالک کے درمیان پوری سرحد پر جنگ ہو رہی ہے اور پاکستان کے علاقے پر حملے ہو رہے ہیں۔

۹ نومبر کو کشمیر کی جنگ بندی سرحد پر متعین اقوام متحدہ کے مبصرین کے سربراہ جنرل نسارا نے اوتھانٹ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں انہیں کشمیر کی اندرونی صورت حال اور جنگ بندی سرحد پر مسلح جھڑپوں سے باخبر کر دیا گیا۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ مشرقی پاکستان خالی کر دے اور وہاں سے اپنی مسلح افواج واپس بلالے۔ اسی دن شام کو اعلان کیا گیا کہ پاکستان کے بمبار طیاروں نے آگرہ کے ہوائی اڈے کو تباہ کرنے کی کوشش کی جسے ناکام بنا دیا گیا۔ اور اس کے اگلے دن دونوں ملکوں کے درمیان زمینی اور فضائی جنگ

شروع ہو گئی۔ مگر اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ نئی دہلی میں ایک سرکاری ترجمان نے اعلان کیا کہ ہندوستان نے جوابی کارروائی کے طور پر اسلام آباد، سرگودھا، میانوالی اور کراچی کے ہوائی اڈوں پر بمباری کی ہے۔ ترجمان نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کی ہوائی فوج نے ڈھاکہ، چاٹگام اور جیسور پر بھی بمباری کی ہے اور بری فوج ٹینکوں اور توپ خانے کی مدد سے مشرقی سیکٹر میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بحری بیڑے کو حکم دیا گیا کہ وہ مشرقی پاکستان کی بحری ناکہ بندی کرے اور مغربی پاکستان سے آنے والے ہر بحری جہاز کو یا تو تباہ کر دے یا اپنے قبضے میں کر لے۔ ۶ دسمبر کو ہندوستان کی حکومت نے بنگلہ دیش بننے سے پہلے ہی اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

اُدھر نیویارک میں جب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا تو اس میں دو قراردادیں پیش کی گئیں۔ جن میں عالمی ادارے نے ہندوستان اور پاکستان سے اپیل کی تھی کہ وہ جنگ بند کر دیں اور اپنی اپنی مسلح افواج کو بین الاقوامی سرحدوں پر واپس بلالیں۔ لیکن روس نے ان دونوں قراردادوں کو ویٹو کر دیا۔ جس پر امریکہ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ہنگامی اجلاس طلب کرنے کی درخواست پیش کی۔ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہندوستان کے نمائندے مسٹر سمر سین نے اعلان کیا کہ ہندوستان کوئی ایسی تجویز قبول نہیں کر سکتا جس میں بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ جنرل اسمبلی میں عرب اور دوسرے مسلم ممالک نے ساری صورت حال کے لئے ہندوستان کو ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ اوتھانٹ اور دوسرے ممالک نے مصالحت کی جس قدر کوششیں کیں وہ سب ہندوستان نے مسترد کر دیں۔ محاذوں پر جنگ جاری تھی کہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو انتقال کر گئے۔ کشمیری عوام صورت حال سے اس قدر بددل تھے کہ ان کی نماز جنازہ میں ان کے رشتہ داروں، سرکاری اہلکاروں، کانگریسی کارکنوں اور افسروں کے سوا کسی شہری نے شرکت نہیں کی۔ اور عین اسی وقت جب سرینگر کے گول باغ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی جا رہی تھی سرینگر میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جیٹ طیاروں کی فضائی جنگ بھی ہو رہی تھی۔ غلام محمد صادق کے انتقال پر نئی دہلی نے سید میر قاسم کو جموں کشمیر کا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو برصغیر کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے پھر سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں جنگ بندی اور فوجوں کی بین الاقوامی سرحد پر واپسی کی ایک قرارداد پھر پیش کی گئی۔ اس قرارداد کو بھی روس نے ویٹو کر دیا اور اس کے اگلے دن ڈھاکہ پر یلغار کے ساتھ ساتھ ساتویں امریکی بحری بیڑے کی خلیج بنگال کی طرف پیش قدمی اور شمالی سرحدوں پر پہنچنے

فوجوں کے اجتماع کی اطلاعات آئیں۔ سرینگر کی فضا میں ہر روز ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فضائی جنگ ہوتی رہی اور جنگ بندی سرحد پر بھی لڑائی جاری تھی کہ ۱۶ دسمبر کو نئی دہلی میں سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اسی شام ہندوستان کی وزیر اعظم نے ریڈیو براڈکاسٹ میں ہندوستانی فوج کو مبارکباد دیتے ہوئے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ مشرقی پاکستان چونکہ بنگلہ دیش بن چکا ہے اس لئے ہم نے لڑائی بند کر دی ہے۔ جنگ بندی کے اس اعلان کے ۲۰ گھنٹے بعد پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ خان نے مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھی جنگ بندی قبول کرنے کا اعلان کیا۔

اس کے اگلے دن سرینگر میں کشمیر کے گورنر مسٹر بھگوان سہائے کی صدارت میں شہریوں کا ایک اجلاس ہوا جس میں مولانا مسعودی نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ——— "۱۹۶۵ء میں اور آج ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو جنگ ہوئی ہے اس کا اصل سبب ان دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر کا تنازعہ ہے اور جب تک یہ تنازعہ طے نہیں کیا جاتا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن قائم نہیں ہو سکتا۔"

ادھر ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کی جگہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو صدر بنائے گئے۔ مسٹر بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر دیا اور انہیں لندن کے راستے ڈھاکہ بھیجا گیا جہاں وہ بنگلہ دیش کے پہلے وزیر اعظم بن گئے۔ ان تمام واقعات کا کشمیر میں بڑا شدید ردعمل ہوا چنانچہ ہندوستان کے حامی لیڈروں اور سرکاری ایڈمنسٹریشن کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ۲۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پھر کشمیر آئیں اور یہاں سرکاری ایڈمنسٹریشن کے لیڈروں سے سیاسی اور انتظامی مسائل پر طویل بات چیت کی۔

۱۹۷۲ء کشمیر کے لئے نئے مصائب لیکر آیا۔ امن و قانون کی برقراری کے نام پر شہری آزادیوں پر سنگین پہرے بٹھائے گئے اور کشمیری عوام کو شیخ محمد عبداللہ کی رہائی اور اپنے حقوق کی بحالی کا مطالبہ کر رہے تھے کا منہ بند کرنے کے لئے نئے حربے استعمال کئے جانے لگے۔ سید میر قاسم جو کشمیر کے وزیر اعلیٰ بن گئے تھے نے سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو اپنے ساتھ ملا لیا تاکہ ریاستی اسمبلی کے آنے والے انتخابات کے لئے حکمران کانگریس کی یکطرفہ کامیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔ بنگلہ دیش کے قیام کی کوششوں میں اہم رول ادا کرنے پر مسٹر درگا پرشاد در کو جو ماسکو میں ہندوستان کے سفیر تھے اور بعد میں حکومت ہند کی وزارت

خارجہ میں پالیسی پلاننگ کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے تھے مرکزی کابینہ میں منصوبہ بندی کا وزیر بنایا گیا۔ سید میر قاسم کو درگا پرشاد در کی مکمل حمایت حاصل تھی چنانچہ مسٹر در نے کشمیر میں اپنے حامیوں کو اہم عہدوں پر بحال کر دیا اور ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو یہ مشورہ دیا کہ کشمیر اسمبلی کے انتخابات مکمل ہونے تک شیخ محمد عبداللہ کو نئی دہلی میں رکھا جائے اور ان پر کشمیر میں داخلے کی پابندی جاری رکھی جائے۔ انتخابات کے سلسلے میں خود محاذ رائے شماری دو حصوں میں بٹ گیا اور اس کا اظہار ۲۰ جنوری کو عید کے دن سرینگر عیدگاہ میں ہوا جبکہ محاذ رائے شماری کے بعض جیالوں نے مولانا مسعودی اور ان کے بعض رفقاء کو منبر سے گھسیٹ کر نیچے پھینک دیا۔ ان انتخابات کے سوال پر گفتگو کرنے کے لئے خواجہ غلام محی الدین قرہ اور مسٹر مبارک شاہ نئی دہلی گئے اور وہاں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت کی لیکن یہ بات چیت بے نتیجہ رہی۔ جب مسٹر قرہ واپس آگئے تو حکومت کشمیر نے انہیں اور مولانا مسعودی کو گرفتار کر لیا اور بیگم عبداللہ جو اپنے خاوند کے پاس نئی دہلی میں تھیں پر ریاست میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی گئی اور اس طرح کانگریس پارٹی نے انتخابی میدان کے ان تمام خطروں کو ٹال دیا جو اسے لاحق تھے۔

برسر اقتدار پارٹی کے طاقتور مخالفوں کے گرفتار اور پابند سلاسل ہو جانے کے بعد مولوی فاروق اور جماعت اسلامی نے اس موقعہ غنیمت جان کر الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا لیکن وہ کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسمبلی کی ۷۵ سیٹوں میں سے جماعت اسلامی صرف پانچ اور مولوی فاروق صرف دو نشستیں حاصل کر سکے۔ ادھر نئی دہلی میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مذاکرات کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا۔ پہلے حکومت ہند کے کچھ اعلیٰ آفیسروں نے ان سے ملاقاتیں کیں اور انہیں ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق تسلیم کر لینے کی ترغیب دی۔ ان افسروں کے بعد مسٹر ڈی پی در نے بھی شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ دو بار ملاقات کی۔ اور اس کے بعد ہندوستان میں روس کے سفیر نے بھی شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ملاقات کی۔ دریں اثنا ان مذاکرات میں جس نوعیت کی بات چیت ہو رہی تھی اس کا اظہار ۲۰ فروری ۱۹۷۲ء کو محاذ رائے شماری کے صدر مرزا محمد افضل بیگ نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں کر دیا۔ اس پریس کانفرنس میں بیگ صاحب نے اعلان کیا کہ "ہم جموں کشمیر کی اندرونی خود مختاری کی بنیاد پر حکومت ہند سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کشمیر کا ہند سے تعلق آئین کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ ریاست کے الحاق کا مسئلہ ہمارے لئے اب بے تعلق ہو چکا ہے۔ یہ مسئلہ ختم کر دیا جا چکا ہے کیونکہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں دستاویز الحاق اور اس کے تمام پہلوؤں کی بھرپور حمایت کی ہے۔ اب ہم اس الحاق کو یقینی اور مستقل

بنانے کیلئے کسی بھی وقت بات چیت کیلئے تیار ہیں۔ مبیگ صاحب نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ بھی کہا کہ "اب کیلئے حکومت ہند اور شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں کشمیری عوام کے درمیان مذاکرات سے ایک پلان مرتب کیا جا سکتا ہے جس میں ریاست کے لئے اندرونی خود مختاری کا سوال بنیاد ہو۔ یہ بات چیت آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ بیگ صاحب نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ پاکستان کو اس کے اندرونی مسائل حل کرنے کیلئے الگ چھوڑ دینا چاہیے۔ ہم رائے شماری کروانے کے مطالبے پر بضد نہیں ہیں۔" انہوں نے یہ بھی بتایا کہ "میں بہت پہلے خود ہی اپنی پارٹی محاذ رائے شماری کا نام تبدیل کرنے پر غور کر رہا تھا لیکن اب اس معاملے پر دوسرے ممبروں سے بھی صلاح مشورہ کرنا ہوگا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اس سوال پر میری پارٹی خود مجھ کو ہی جماعت سے خارج کر دے۔" مرزا افضل بیگ کے اس بیان کا نئی دہلی میں ملا جلا رد عمل ہوا۔ سرکاری حلقوں نے اگرچہ اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا لیکن سیاسی حلقوں نے مسٹر بیگ کے اس بیان کو ان کی نئی حکمت عملی سے تعبیر کیا۔ اور کہا کہ یہ لوگ اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے وزیر اطلاعات مسٹر آئی۔ کے گجرال نے نئی دہلی میں اپنی قیام گاہ پر اس مسئلے پر گفتگو کے دوران مجھے بتایا کہ "شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر بیگ جو چیز لڑائی سے حاصل نہیں کر سکے ہیں، وہ صلح صفائی اور محبت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں مان سکتے کہ انہوں نے اپنا موقف تبدیل کر لیا ہے البتہ انہوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی ہے لیکن ہمیں بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔" ۲۰ فروری ۱۹۷۲ء کو امریکی صدر نکسن اور چینی لیڈروں کے درمیان پیکنگ میں بات چیت کے بعد ایک مشترکہ اعلان جاری ہوا جس میں کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے پر زور دیا گیا۔ دو بڑی طاقتوں کے اس مشترکہ اعلان کا نئی دہلی میں شدید رد عمل ہوا اور ہندوستانی حکام نے شیخ محمد عبداللہ کو قریب لانے کی کوشش تیز کر دیں۔ پیکنگ میں جاری کئے گئے اس مشترکہ اعلان کے فوراً بعد مسٹر ڈی۔ پی۔ دھر کو اچانک ماسکو بھیجا گیا تاکہ وہاں روسی لیڈروں سے اس معاملے پر بات چیت کریں۔ اسی دوران شیخ محمد عبداللہ نے ۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو لندن ٹائمز کو ایک انٹرویو دیا۔ جو کئی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ انہوں نے انٹرویو میں پہلی مرتبہ کہا تھا "ہندوستان کی حکومت کے ساتھ ہمارا جھگڑا الحاق کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اندرونی خود مختاری کے ڈھانچے کے بارے میں ہے۔ کسی کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ ہم ہی تھے جو کشمیر کو ہندوستان میں لے آئے۔ ورنہ کشمیر کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہ ہوتا۔" ماسکو میں کشمیر کے سوال پر مسٹر ڈی۔ پی۔ دھر اور روسی لیڈروں کی بات چیت کے بعد روسی لیڈروں نے پاکستان کے صدر

مسٹر بھٹو کو ماسکو آنے کی دعوت دی تاکہ روس ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مصالحت کرا سکے۔ مسٹر بھٹو تین دن تک ماسکو میں رہے اور وہاں ہندوستان کے ساتھ مذاکرات کا پروگرام طے پایا۔ ادھر کشمیر اسمبلی کے یکطرفہ انتخابات میں کانگریس پارٹی کی کامیابی کے بعد سید میر قاسم دوبارہ وزیر اعلیٰ بنائے گئے اور روس کی طرف سے مصالحت کی کوششیں بھی تیز ہو رہی تھیں ایک طرف روس ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کیلئے مذاکرات کروا رہا تھا اور دوسری طرف شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی میں بھی مصالحت کی کوشش ہو رہی تھی۔ مسٹر ڈی۔ پی۔ دھر کی ماسکو سے واپسی کے بعد نئی دہلی میں انہوں نے روسی سفیر کے ساتھ دو بار ملاقات کی اور ان کی روسی سفیر کے ساتھ دوسری ملاقات کے دو دن بعد یعنی ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء کو روسی سفارت خانے کا فرسٹ سیکرٹری شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ملاقات کرنے ان کی قیام گاہ کوٹھی لین گیا۔ یہ ملاقات تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی۔ اسی شام روسی سفیر نے مسز گاندھی کے ساتھ نصف گھنٹے تک ملاقات کی۔ اس کے اگلے دن ۲۹ مارچ ۱۹۷۲ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ "ہم محاذ رائے شماری کے لیڈروں کے نظریات میں تبدیلی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اب ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔" مسز گاندھی کی روسی سفیر سے ملاقات کے بعد ۳۰ مارچ ۱۹۷۲ء کو ہندوستان کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کو ماسکو بھیجا گیا جہاں انہوں نے کشمیر اور برصغیر کے معاملات پر روسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کی۔ سردار سورن سنگھ کی روس سے واپسی کے ساتھ ہی نئی دہلی نے سید میر قاسم کو ہدایت دی کہ وہ کشمیر میں سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیں۔ چنانچہ ریاستی حکومت نے یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو اعلان کیا کہ اس نے بیگم عبداللہ پر عائد کی گئی پابندی ہٹا لی ہے اور اس کے ساتھ ہی مولانا مسعودی، مسٹر قرہ اور بعض دوسرے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ سید میر قاسم کو یہ بھی ہدایت دی گئی کہ کشمیر میں کسی نئی سیاسی صورت حال سے نمٹنے کیلئے وہ ایک سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے ساتھ اتحاد کر لیں۔ چنانچہ سید میر قاسم اور بخشی غلام محمد کے درمیان ایک طویل ملاقات کے بعد ۲ اپریل ۱۹۷۲ء کو بخشی غلام محمد نے اپنی پارٹی نیشنل کانفرنس کو ختم کرنے اور کانگریس میں باقاعدہ شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔

۱۹

بیگ پارتھا سارتھی مذاکرات اور شملہ سمجھوتہ

سردار سورن سنگھ کی ماسکو سے واپسی کے اگلے دن ۱۹ اپریل ۱۹۷۲ء کو مسز گاندھی نے رسمی طور پر مسٹر بھٹو کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں ہندوستان نے دونوں ملکوں کے درمیان اعلیٰ سطح پر بات چیت کی تجویز پیش کی جسے مسٹر بھٹو نے قبول کر لیا۔ بات چیت کا ایجنڈا اور دوسرے امور طے کرنے کے لئے مسز گاندھی نے مسٹر ڈی پی دھر کی قیادت میں ۱۹ افسروں کا ایک وفد اسلام آباد بھیجا جس نے مری میں دو دن تک پاکستانی افسروں کے ساتھ بات چیت کے بعد ایجنڈا اور دوسرے امور طے کر لئے۔ ایک طرف پاکستان کے ساتھ مذاکرات کرنے کا اہتمام کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بھی بات چیت ہو رہی تھی۔ چنانچہ مرزا محمد افضل بیگ پر ریاست میں داخلے کی پابندی اٹھا لی گئی اور وہ جموں آ گئے۔ جہاں انہوں نے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کے ساتھ ڈھائی گھنٹے تک ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد مسٹر بیگ نے یو این آئی کو بتایا کہ ــــ

"اب ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کا مسئلہ کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں رہا۔ اب صرف یہ سوال طے کرنا ہے کہ کشمیر کو کس حد تک داخلی خود مختاری دی جائے گی؟"

مسٹر ڈی پی دھر ایجنڈا اور دوسرے امور طے کرنے کے بعد ۲ مئی ۱۹۷۲ء کو واپس نئی دہلی آ گئے

مسٹر ڈی پی دھر نے پاکستان سے نئی دہلی واپس آنے پر بتایا کہ انہوں نے دونوں ملکوں کی چوٹی کانفرنس کے لئے سری نگر کا مقام تجویز کیا تھا، لیکن پاکستان نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ "پاکستان کشمیر پر بات چیت کے لئے اصرار کر رہا ہے اور ہم نے اس پر بات چیت کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کر دی ہے"۔ اسلام آباد سے واپسی کے بعد مسٹر ڈی پی دھر اچانک سری نگر آئے اور یہاں سید میر قاسم کے ساتھ طویل بات چیت کی۔ مسٹر دھر سے بات چیت کرنے کے بعد سید میر قاسم نے مجھے ایک ملاقات کے دوران بتایا۔ "کشمیر میں تاریخ کا ایک نیا دَور شروع ہو رہا ہے۔ جس میں انہیں یعنی سید میر قاسم کو سب سے زیادہ اہم رول ادا کرنا ہوگا۔" انہوں نے یہ بھی بتایا کہ "میں نے نئے حالات سے اپنے ساتھیوں کو بھی آگاہ کر دیا ہے"۔ ۵ مئی کو مرزا محمد افضل بیگ سری نگر آئے اور یہاں انہوں نے عوام کے تیور دیکھ کر خانیار کے ایک عوامی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں سے کہا "کشمیری بھیڑ بکریوں کا ریوڑ نہیں ہیں کہ انہیں بانٹ لیا جائے۔ ہم ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چوٹی کانفرنس کی کامیابی چاہتے ہیں۔ تاکہ سری نگر راولپنڈی شاہراہ کھول دی جائے"۔ ۵ جون ۱۹۷۲ء کو شیخ محمد عبداللہ پر کشمیر میں داخلے کی پابندی اُٹھالی گئی۔ تاہم وہ فوراً سری نگر نہیں آئے بلکہ نئی دہلی میں ہی ٹھہرے رہے۔ پابندی اٹھائے جانے کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی میں یو این آئی کو ایک انٹرویو دیا۔ جس میں انہوں نے دو متضاد باتیں بیان کیں۔ ایک طرف انہوں نے یہ کہا کہ "ہندوستان اور کشمیر کے درمیان تعلقات کی بنیاد آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ ہے۔ ہمارا ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے بارے میں اصل جھگڑا الحاق پر نہیں"۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "اگر ہندوستان اور پاکستان امن سے رہنا چاہتے ہیں تو انہیں کشمیر کا مسئلہ طے کر لینا چاہیئے۔ اس برصغیر میں پائیدار امن کی یہ واحد صورت ہے"۔ ۱۷ جون ۱۹۷۲ء کو شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی میں ہندوستان کی وزیر اعظم مسز گاندھی کے ساتھ ایک گھنٹے تک ملاقات کی اور اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ۱۹ جون کو سری نگر آئیں گے۔ مرزا محمد افضل بیگ بھی دہلی پہنچ چکے تھے اور شیخ صاحب کی مسز گاندھی سے ملاقات کے بعد یہ انکشاف کیا گیا کہ دونوں لیڈر اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ وہ کشمیر اور نئی دہلی کے درمیان تصفیہ کرانے

کے لئے آئینی مسئلوں پر بات چیت شروع کریں گے۔ اور اس بات چیت کے لئے مسز گاندھی نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے وائس چانسلر مسٹر جی پارتھا سارتھی کو نامزد کیا اور شیخ محمد عبداللہ نے مسٹر بیگ کو بات چیت کا اختیار دیا۔ چنانچہ بیگ پارتھا سارتھی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان واقعات کا کشمیری عوام میں بڑا شدید اور مایوس کُن ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ اس بددلی کو دُور کرنے کے لئے محاذ رائے شماری کے لیڈروں کی طرف سے متضاد قسم کے بیانات دیئے جانے لگے۔ جب کشمیری عوام میں تشویش پھیلنے لگی تو مسٹر بیگ کو فوراً سری نگر بھیجا گیا اور انہوں نے ۸ جون کو درگاہ حضرت بل میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ لوگ مفاد پرست عناصر کے گمراہ کُن پروپیگنڈے میں نہ آئیں اور یہ یقین رکھیں کہ سرداری عوام کا حق ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی ہوگا۔ کشمیری عوام کی رائے ہی کے مطابق ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر پارتھا سارتھی بھی سری نگر آئے اور یہاں صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور مرزا محمد افضل بیگ سے ایک گھنٹے تک ملاقات کی۔ ۱۹ جون ۱۹۷۲ء کو شیخ محمد عبداللہ سری نگر آئے اور انہوں نے ہوائی اڈے پر عوام میں پھیلی ہوئی تشویش کا ازالہ کرنے کے لئے اخباری نمائندوں کو یہ بیان دیا کہ "کشمیر کے بارے میں فیصلہ یا کوئی تصفیہ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق ہی ہوگا اور کوئی بات لوگوں پر نہیں ٹھونسی جائے گی۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے میری جو ملاقات ہوئی ہے اس میں ہم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ہم کشمیر اور ہندوستان کے تعلقات میں ماضی کی تلخیوں کو بھول کر ایک نیا باب شروع کریں گے اور یہ کوشش کی جائے گی کہ جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کو دور کرنے کے لئے ایک باعزت راستہ تلاش کیا جائے"۔ یاد رہے کہ نئی دہلی اور کشمیر کے درمیان تعلقات میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا جملہ شیخ صاحب نے پہلی بار استعمال کیا جبکہ اس سے پہلے ۲۰ برس تک ان کا موقف بالکل واضح رہا کہ کشمیر پر ہندوستان زبردستی قابض ہے۔ ہوائی اڈے پر انہوں نے دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ سوالات کے جواب میں یہ بھی کہا کہ "اگر مستقبل میں پاکستان کا وجود قائم نہ بھی رہے تب بھی ہمارا مسئلہ باقی رہے گا۔ البتہ ہندوستان اور پاکستان کشمیر کے بارے میں اپنا اپنا موقف رکھتے ہیں۔ اس پر بات چیت کرنا ان کا کام ہے"۔ اس کے اگلے دن انہوں نے حضوری باغ میں ایک پبلک جلسے میں یہ اعلان

کیا "کشمیری عوام کی عزت و آبرو اور ان کے جائز حقوق کے لئے میں آخری دم تک لڑوں گا اور ہم بنیادی مسئلے پر کوئی سودے بازی نہیں کریں گے۔ ہم نے یہ عہد کر لیا ہے کہ ہم اپنی تقدیر بدل دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ میں ایک مسلمان ہوں اور میں نے یہ سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر رکھا ہے۔ حکومت ہند کو اگر کچھ کرنا ہے تو اسے ۱۹۵۳ء کی بنیاد پر واپس جانا ہوگا۔ پھر بھی معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوگا۔ ہمارا ایک حصہ ہم سے الگ ہے۔ ہماری تجارت کا حقیقی راستہ بند ہے۔ مسز گاندھی برصغیر میں پائیدار امن چاہتی ہیں۔ اس لئے انہیں اور مجھے پاکستان سے بھی بات کرنا ہوگی تاکہ سب کچھ پائیدار بنیادوں پر طے ہو سکے۔ یہاں کچھ لوگ یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ پاکستان اس مسئلے کا ایک فریق ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ پاکستان نے اپنے فریق ہونے کا وکالت نامہ یہاں کس کو دیا ہے۔ اگر پاکستان میں طاقت ہے تو وہ اپنی یہ پوزیشن منوا سکتا ہے۔ میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی آزادی کے لئے پاکستان اور چین کی طرف مت دیکھو۔ یہ ملک ہمارا ہے اور اس کے فیصلے صرف ہم کر سکتے ہیں۔"

شملہ مذاکرات

۲۸ جون ۱۹۷۲ء کو شملہ میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سربراہ کانفرنس شروع ہو گئی جس میں مسز اندرا گاندھی اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات کے بعد شملہ سمجھوتہ طے پایا اور شملہ سمجھوتے میں پاکستان نے کشمیر کے تنازعے میں اپنے فریق ہونے کی پوزیشن منوا لی اور دونوں ملکوں کے درمیان چھ نکاتی سمجھوتہ ہوا اس میں یہ طے پایا کہ ہندوستان اور پاکستان جموں کشمیر کے تنازعے کا دائمی حل تلاش کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کرنے کی بجائے بات چیت کے ذریعے کسی تصفیہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح ہندوستان نے پھر ایک بار ایک بین الاقوامی اقرار نامے کے ذریعے کشمیر کو ایک متنازعہ مسئلہ تسلیم کر لیا اور اس

پر ہندوستان میں انتہا پسند طبقے نے اظہار ناراضگی کے طور پر مسز اندرا گاندھی کی شملہ سے نئی دہلی واپسی پر ان کے خلاف سیاہ جھنڈیوں سے مظاہرے کئے۔ شملہ سمجھوتے پر کشمیری عوام کا ردعمل ملا جلا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ نے شملہ سمجھوتے کے خلاف اپنا ردعمل ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو سوپور عیدگاہ میں اپنی تقریر میں ظاہر کیا اور کہا "مسز گاندھی اور مسٹر بھٹو کو کوئی اخلاقی یا قانونی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کشمیر کے حل طلب مسئلے کا تصفیہ کشمیری عوام کی مرضی کے بغیر ہی کر لیں۔ یہاں کے لوگ ۲۰ برس سے حق خود ارادیت کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" شیخ محمد عبداللہ نے کہا "مجھے خیال ہے کہ جب ہندوستانی لیڈروں نے مجھ سے یہ پوچھا کہ کشمیری مسلمان ہندوستان کے کیوں خلاف ہیں؟ تو میں نے ان کو بتا دیا کہ آپ لوگ کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کی حمایت سے منحرف ہو گئے ہیں اور یکطرفہ طور پر اٹوٹ الحاق کی رٹ لگا کر لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا چکے ہیں۔ جبکہ پاکستان یہاں تک کہ چین نے بھی کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کر کے یہاں کے لوگوں کے دل جیت لئے ہیں۔ اگر ہندوستان بھی کشمیری عوام کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی اُن کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔" بعد میں ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو شیخ صاحب نے مسز اندرا گاندھی کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اُن سے یہ کہا گیا کہ کشمیر کے تنازعے پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی بات چیت میں کشمیری لیڈروں کو بھی شامل کیا جانا چاہیئے۔ ۱۵ جولائی ۱۹۷۲ء کو صبح سویرے کشمیر کے ایک سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد چل بسے۔ اُن کی موت پر شیخ محمد عبداللہ نے اپنے حامیوں کو ہدایت دی کہ وہ اُن کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوں اور وہ خود بھی شریک نہیں ہوئے۔ اسی دوران ریاستی حکومت نے ستمبر میں وادی میں بلدیاتی انتخابات کروانے کے پروگرام کا اعلان کر دیا اور ممنوعہ محاذ رائے شماری جس پر کہ پابندی تھی اور عوامی ایکشن کمیٹی جس کے سربراہ مولوی فاروق تھے نے انتخابات لڑنے کا اعلان کر دیا لیکن جمہوریت کی مسلّمہ روایات کے مطابق مختلف خیال اور مختلف پارٹیوں کے اُمیدواروں کو منتخب کرنے کا فیصلہ عوام پر چھوڑنے کی بجائے ہوا یہ کہ ممنوعہ محاذ اور عوامی ایکشن کمیٹی کے مولوی فاروق کے درمیان ایک ایسا انتخابی

سمجھوتہ طے کیا گیا جس کے مطابق شیخ صاحب اور مولوی فاروق نے میونسپل کونسل کی ۷۰ نشستوں کے لئے مشترکہ امیدواروں کی ایک فہرست جاری کروائی اور جو لوگ اس کے علاوہ انتخابات میں کھڑے ہوئے تھے انہیں انتخابی مقابلے سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ چنانچہ اس طرزِ عمل کے مطابق میونسپل انتخابات میں بلا مقابلہ کامیابی کی دیرینہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ان تمام امیدواروں کو بلا مقابلہ کامیاب کروا لیا گیا جنہیں شیخ صاحب اور مولوی فاروق نے ایک مشترکہ فہرست کے ذریعے نامزد کیا تھا۔

۱۱ نومبر ۱۹۷۲ء کو عید الفطر کے موقعہ پر وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے ایک دعوتِ عصرانہ کا اہتمام کیا جس میں شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر بیگ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کے بعد دونوں لیڈر پہلی مرتبہ ایک سرکاری دعوت میں شامل ہوئے اور اس کے بعد ۱۲ نومبر ۱۹۷۲ء کو شیخ محمد عبداللہ مسز گاندھی اور دوسرے لیڈروں سے بات چیت کرنے پھر دہلی گئے اور اس دوران بیگ پارتھا سارتھی ملاقاتوں اور مذاکرات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بیگ پارتھا سارتھی مذاکرات کا سلسلہ اس قدر طویل رہا کہ یہ ملاقاتیں عوام کے نزدیک ایک مذاق بن کر رہ گئیں، اور اس کے ساتھ ساتھ عوام میں ان ملاقاتوں کے متعلق شکوک و شبہات بڑھتے گئے۔

نئی دہلی میں شیخ محمد عبداللہ تقریباً دو ہفتے تک قیام کے بعد ۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء کو واپس سرینگر آ گئے۔ ان کی سرینگر میں آمد کے فوراً بعد کشمیر کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو نئی دہلی طلب کیا گیا جہاں انہیں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ گفتگو سے آگاہ کیا گیا۔ بعد میں سری نگر میں تقریباً ایک ماہ تک قیام کرنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پھر نئی دہلی گئے۔ نئی دہلی کے ساتھ ان کے مذاکرات کے بارے میں وہ اپنے قیام کشمیر کے دوران بار بار کشمیری عوام کو یقین دلاتے رہے کہ وہ کشمیر کے مسئلے پر کوئی سودے بازی نہیں کریں گے اور اگر نئی دہلی کے ساتھ کوئی بات طے بھی ہوئی تو اسے سب سے پہلے کشمیری عوام کے سامنے رکھا جائے گا اور کشمیری عوام کی پیٹھ پیچھے کسی بھی قیمت پر کوئی بات طے نہیں کی جائے گی۔ اس دوران بیگ پارتھا سارتھی بات چیت بھی جاری تھی کہ ۱۱ جنوری ۱۹۷۳ء کو حکومت ہندوستان نے محاذِ رائے شماری پر پابندی ہٹا لی اور اس کے اگلے دن محاذ کے جنرل

سیکریٹری خواجہ غلام محمد شاہ جو شیخ صاحب کے داماد بھی ہیں محاذ سے پُراسرار طور پر مستعفی ہو گئے اور خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ وہ کانگریس میں شامل ہو کر ریاستی کابینہ میں ایک وزیر کی حیثیت سے شمولیت کرنے والے ہیں۔ اس کے ایک ہفتے بعد ۱۰ جنوری کو عید الضحیٰ کے روز سرینگر اور اسلام آباد میں مولوی فاروق اور مرزا محمد افضل بیگ کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے۔ مسٹر بیگ جب نماز ادا کرنے کے لئے اسلام آباد کی جامع مسجد میں گئے اور وہاں تقریر کرنا چاہی تو لوگوں نے ان کے خلاف مخالفانہ نعرے بلند کئے جس پر وہ تقریر کئے بغیر ہی وہاں سے چلے گئے۔ یہی حالت سرینگر کی جامع مسجد میں مولوی فاروق کے خلاف نمودار ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ نے جو نئی دہلی میں تھے، ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے بعد ۲۴ جنوری کو پریس ٹرسٹ آف انڈیا کو اپنی بات چیت کے بارے میں ایک انٹرویو میں بتایا کہ ”میں ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حقیقت کو چیلنج نہیں کرتا لیکن کشمیر کے مرکز کے ساتھ تعلقات دستاویز الحاق اور دفعہ ۳۷۰ کے مطابق ہونے چاہئیں۔“ اس پر وادی میں زبردست بے چینی پھیلی اور جب امن و قانون کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تو وزیر اعلیٰ سید میر قاسم فوراً جموں سے سرینگر آئے اور حکام کو یہ ہدایت دی کہ وہ ہر قسم کا ایجی ٹیشن سختی کے ساتھ دبا دیں۔ لوگوں کی طرف سے محاذ رائے شماری کے لیڈروں پر الزام لگایا گیا کہ وہ اپنے بنیادی موقف سے انحراف کر رہے ہیں۔ چنانچہ ۳۰ جنوری کو پلوامہ میں محاذ کے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے مرزا محمد افضل بیگ نے اپنے بنیادی موقف سے منحرف ہو جانے کی یہ تشریح بیان کی کہ ”میدانِ جنگ میں ہم نے ایک محاذ پر ناقابلِ عبور مشکلات کے پیش نظر لڑائی کو دوسری جگہ منتقل کیا ہے اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم نے شکست تسلیم کی ہے۔ البتہ ہم نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی ہے۔“ مسٹر بیگ نے مخالفت کا بڑھتا ہوا زور دیکھ کر یکم فروری کو مجاہد منزل میں ایک اجلاس طلب کیا جس میں انہوں نے اعلان کیا ”ہمیں اقتدار کی ہوس یا آرزو نہیں ہے اور ہم پر مفاد پرست عناصر غلط الزامات عائد کر رہے ہیں۔“ اس پر محاذ رائے شماری کے ایک حصے نے مسٹر بیگ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ محاذ کی قیادت سے دستبردار ہو جائیں لیکن یہ مطالبہ تحریک کی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ البتہ محاذ کے ایک حصے نے

جس کی قیادت بیگم جواد کر رہے تھے یہ اعلان کیا کہ وہ عدالت سے رجوع کر رہے ہیں تاکہ مسٹر بیگ کو محاذ رائے شماری کے آئین کی خلاف ورزی کرنے پر انہیں محاذ کا نام اور اس کا اثاثہ استعمال کرنے سے روکا جا سکے

دوسری طرف پاکستان نے سرکاری طور پر یہ اعلان کر دیا کہ شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی کے درمیان جو بات چیت ہو رہی ہے اس میں پاکستان کو بھی شامل کیا جائے کیونکہ وہ اس مسئلے کا اہم فریق ہے اور اس کی شمولیت کے بغیر بات چیت بنیادی مسئلے کو حل نہیں کر سکے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ کشمیر میں محاذ رائے شماری کے حامیوں میں زبردست غم و غصہ پھیل گیا اور پارٹی کا تنظیمی ڈھانچہ عملاً درہم برہم ہو گیا۔ اس تشویشناک صورت حال کے پیش نظر مسٹر بیگ نے شیخ محمد عبداللہ جو نئی دہلی میں تھے کے ساتھ ٹیلیفون پر بات چیت کی اور انہیں فوراً کشمیر آنے کے لئے کہا۔ حکومت ہندوستان نے بھی مسٹر درگا پرشاد دھر کو صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے سرینگر بھیجا۔ مسٹر دھر ۱۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو سری نگر آئے اور یہاں تین دن تک مختلف لوگوں سے حالات معلوم کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کرن سنگھ بھی کشمیر آئے اور انہوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا البتہ مسٹر ڈی پی دھر اور ڈاکٹر کرن سنگھ نے ہندوستان کی وزیر اعظم مسز گاندھی کو مختلف اور متضاد اطلاعات فراہم کیں۔

کشمیر میں صورت حال بگڑتی چلی جا رہی تھی جس کے پیش نظر شیخ محمد عبداللہ ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو نئی دہلی سے جموں ہوتے ہوئے سری نگر پہنچے۔ سری نگر میں ۱۱ اپریل ۱۹۷۳ء کو انہوں نے مجاہد منزل میں محاذ کے کارکنوں اور عوام کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ پریشان نہ ہوں اور ان باتوں کا یقین نہ کریں کہ وہ نئی دہلی کے ساتھ کوئی سودے بازی کر رہے ہیں۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کہا۔ "میری پچاس سالہ سیاسی زندگی آپ کے سامنے ہے۔ میں نے ساری عمر آپ کی عزت اور آزادی کے لئے جدوجہد کی اب میں ایک ڈوبتا ہوا سورج ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس عمر میں آپ کی آزادی کا سودا کروں۔ مجھے صدارتیں اور وزارتیں پیش کی گئیں۔ اگر میں صدر بننا چاہتا تو پاکستان کا صدر بن سکتا تھا اور یہاں کا وزیر اعظم تو تھا ہی۔ ہم نے

یہ عہد کر رکھا ہے کہ کشمیر کی تقدیر کا فیصلہ صرف کشمیری عوام ہی کر سکتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں"۔ اور دوسری طرف بیگ پارتھا سارتھی مذاکرات چلتے رہے جس کے خلاف عوام میں اندر ہی اندر لاوا پکتا رہا۔ چنانچہ اچانک یہ ہوا کہ یہ عوامی لاوا پھوٹ پڑا اور "بُک آف نالج" نامی کتاب میں توہین آمیز الفاظ درج ہونے کی آڑ میں پوری وادی میں ایک ایجی ٹیشن شروع ہو گیا حالانکہ یہ کتاب تقریباً ایک سو برس پہلے ۱۸۸۸ء میں ایک انگریز مصنف نے لکھی تھی۔ لیکن بظاہر یہ مشہور کیا گیا کہ یہ کتاب کشمیر کی کسی لائبریری میں موجود ہے۔ اصل میں ایجی ٹیشن کشمیری لیڈروں کے بدلتے ہوئے نظریات کے خلاف تھا اور "بُک آف نالج" کا قصہ محض ایک بہانہ تھا۔

۲۲ مئی کو سری نگر میں زبردست احتجاجی ہڑتال اور تشدد آمیز مظاہرے ہوئے۔ جن میں پولیس فائرنگ سے تین افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے۔ مشتعل کشمیری عوام اور مسلح پولیس کے درمیان جگہ جگہ جھڑپیں ہوئیں اس زبردست ایجی ٹیشن کو سید میر قاسم کی حکومت نے شیخ محمد عبداللہ اور مولوی فاروق کے تعاون سے دبا دیا۔ بے شمار لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور بہت سے لوگوں کو نوکریوں کا لالچ دے کر حکومت نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ مرنے والوں اور زخمیوں کے لواحقین کو بھاری معاوضے دیئے گئے۔ اس کے باوجود کشمیری عوام کے جذبات مشتعل رہے۔ اس ایجی ٹیشن میں تقریباً تین سو سٹوڈنٹ اور نوجوان گرفتار کئے گئے۔ اس ہمہ گیر ایجی ٹیشن کو دبانے کے سلسلہ میں شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر بیگ نے حکام کے ساتھ تعاون کر کے نئی دہلی کو یہ تاثر دیا کہ کشمیر میں ہندوستان کے خلاف تحریک کو صرف یہی لوگ قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ ۱۳ جولائی ۱۹۷۳ء کو سرینگر کے مزار شہداء پر ایک عوامی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کشمیری عوام میں اُن کے خلاف شک و شبہ کی فضا پیدا ہو رہی ہے اور انہوں نے نہایت واشگاف الفاظ میں یقین دلایا کہ وہ لوگوں سے پوچھے بغیر اور ان کی پیٹھ پیچھے کوئی بھی فیصلہ نہیں کریں گے اور نہ ہی لوگوں کے منشاء کے خلاف ان پر کوئی فیصلہ ٹھونسا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود عوام کی بے چینی دور نہیں ہو سکی چنانچہ ۹ جولائی کو مجاہد منزل میں تحریک آزادی کے ایک مجاہد خواجہ غلام نبی گلکار کو جن کا پاکستان میں انتقال ہوا تھا

خراجِ عقیدت ادا کرنے کے لئے جو جلسہ ہوا اُس میں شیخ محمد عبداللہ نے پھر یہ شکوہ کیا کہ "لوگ ہمارے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم اپنے موقف سے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن میں آج پھر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ صرف کشمیری عوام کریں گے وہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا ہندوستان کے ساتھ یا آزاد رہنا چاہتے ہیں یہ اُن کا حق ہے"۔ انہوں نے کہا "یہ سرزمین غلام ہے اور اگر یہ غلام ہی رہی تو میرے مرنے کے بعد میری میت بحیرہ عرب کی لہروں کے سپرد کی جانی چاہیئے کیونکہ میں ایک غلام سرزمین میں دفن نہیں ہونا چاہتا"۔ یکم اگست ۱۹۷۴ء کو مسز گاندھی نے کشمیر کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو دہلی طلب کیا اور اُن سے کشمیر کی سیاسی بے چینی اور دوسرے معاملات پر بات چیت کی۔ سید میر قاسم نے نئی دہلی سے واپس آکر مجھے بتایا کہ انہوں نے نئی دہلی کو مشورہ دیا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کوئی تصفیہ کر لیا جائے۔ کیوں کہ کشمیر میں اُن کی سیاسی ساکھ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سید میر قاسم سے شیخ محمد عبداللہ کی ایک مختصر سی ملاقات کے بعد شیخ صاحب پھر دہلی گئے۔ جہاں انہوں نے ہندوستان کی وزیر اعظم کے ساتھ طویل بات چیت کی اور مسلم مجلس مشاورت کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے جہاں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ قومی دائرے سے الگ ہو کر نہ سوچیں۔ اس کے بعد وہ ۱۰ اگست کو واپس سرینگر آگئے اور ایک ہفتے بعد پھر دہلی گئے جہاں انہوں نے مسز گاندھی کے ساتھ پھر بات چیت کی۔ اس موقع پر ہند و پاک بات چیت میں حصہ لینے والے وفد کے لیڈر مسٹر عزیز احمد جو ہندوستانی افسروں کے ساتھ نئی دہلی میں بات چیت کر رہے تھے نے شیخ صاحب کو پیغام بھیجا کہ وہ اُن سے ملنا چاہتے ہیں لیکن شیخ محمد عبداللہ ان سے نہیں ملے۔ البتہ وزیر اعظم ہند کے سیکریٹریٹ میں اچانک اُن کی مسٹر عزیز احمد سے مڈبھیڑ ہو گئی جس پر مسٹر عزیز احمد نے اُن پر یہ فقرہ چست کیا "شیخ صاحب آج تو آپ بالکل نوجوان نظر آ رہے ہیں"۔

شیخ محمد عبداللہ کی ہندوستانی وزیر اعظم سے اس بات چیت کے تقریباً ایک ماہ بعد ۲۰ ستمبر ۱۹۷۴ء کو مسز گاندھی کشمیر آئیں اور پہلگام میں قیام کیا۔ اس کے اگلے روز ۲۱ ستمبر کو شیخ محمد عبداللہ سرینگر

سے پہلگام گئے جہاں انہوں نے ہندوستانی وزیر اعظم کے ساتھ کوئی دو گھنٹے تک ملاقات کی اور مسز گاندھی کو پھر یقین دلایا کہ وہ نئی دہلی کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ ان سے ملاقات کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے پہلگام میں ہی سید میر قاسم سے بھی ملاقات کی اور پھر سید میر قاسم مسز گاندھی سے ملے۔ اس کے اگلے دن ۲۲ ستمبر کو کشمیر کے گورنر مسٹر ایل کے جھا نے راج بھون میں ہندوستان کی وزیر اعظم کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی جس میں شیخ محمد عبداللہ کو بھی مدعو کیا گیا۔ راج بھون میں گورنر کی موجودگی میں کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے تعاون کی پیشکش پر اُن کے ساتھ بات چیت ہوتی رہی۔ شام کو مسز اندرا گاندھی شیخ محمد عبداللہ کے ہاں مدعو کی گئیں اور اس موقع پر مسز گاندھی کے علاوہ کشمیر کے گورنر اور وزیر اعلیٰ سید میر قاسم بھی بات چیت میں شریک ہوئے۔ ۲۳ ستمبر کو بھی مذاکرات جاری رہے لیکن اس کے باوجود ۲۳ ستمبر کو ہندوستانی وزیر اعظم نے سرینگر میں اپنی پریس کانفرنس کے دوران ان مذاکرات کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا اور اخباری نمائندوں نے اس بارے میں جو سوالات کئے انہیں بالکل ٹال دیا۔ البتہ انہوں نے سری نگر سے واپس نئی دہلی جا کر اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے میں زبردست احتیاط برت رہی ہیں اور ہندوستان کے قومی مفاد کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا جائے گا۔ اسی دوران سید میر قاسم کی حکومت نے یہ طے کیا کہ سری نگر کے گورنمنٹ وومن کالج کا نام تبدیل کر کے اس کا نام نہرو میموریل کالج رکھا جائے اور کالج کے نام کی تبدیلی کی جو تقریب ۱۰ نومبر شام کو منعقد ہونے والی تھی اُس کی صدارت شیخ محمد عبداللہ کو کرنا تھی۔ لیکن ۱۰ نومبر ۱۹۷۴ء صبح سویرے کالج کا نام تبدیل کرنے کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہو گیا اور زبردست "تشدد آمیز" مظاہرے ہوئے یہ ایجی ٹیشن وادی کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گیا اور سوپور اور اسلام آباد میں بھی زبردست مظاہرے ہوئے کئی سرکاری گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی اور پولیس پر پتھراؤ کیا گیا جس سے پوری وادی میں امن و انتظام درہم برہم ہو گیا۔ چنانچہ حکومت نہ تو اس کالج کا نام تبدیل کر سکی اور نہ نام تبدیل کرنے کی وہ تقریب

منعقد ہو سکی جس کی صدارت شیخ محمد عبداللہ کو کرنا تھی۔ اس کے دو دن بعد شیخ محمد عبداللہ سری نگر سے جموں چلے گئے۔ البتہ سری نگر میں ایجی ٹیشن جاری تھا اور اس نے ۱۸ نومبر کو اُس وقت سنگین صورت اختیار کر لی جبکہ تمام کالجوں کے طلبا اور طالبات سری نگر کی سڑکوں پر اُمڈ آئے اور محاذ رائے شماری کے لیڈروں کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ اس کے اگلے دن مرزا محمد افضل بیگ نے اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا جس میں اُنہوں نے اعلان کیا "ہندوستان سے کشمیر کا الحاق رائے شماری کے تابع ہے اور جو لوگ ہمارے متعلق غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں وہ کشمیری عوام کے دشمن ہیں"۔ پولیس نے ان تشدد آمیز مظاہروں کے دوران لگ بھگ چار سو طلبا اور نوجوانوں کو گرفتار کیا اور طاقت کے بے پناہ استعمال کے بعد اس ایجی ٹیشن کو دبا دیا گیا۔ اس ایجی ٹیشن کے بعد شیخ محمد عبداللہ جموں سے نئی دہلی پہونچے اور ہندوستانی حکام کو بتایا کہ کشمیر میں صورت حال سرعت کے ساتھ بگڑ رہی ہے اور اس کا بروقت اور موثر علاج کیا جانا چاہئے۔

۲۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو مجاہد منزل میں محاذ کے کارکنوں کا ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس میں اس ایجی ٹیشن سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کیا گیا جو سری نگر میں جاری تھا۔ اس اجلاس میں مرزا محمد افضل بیگ نے اعلان کیا کہ وہ کشمیر کو ایک حل طلب مسئلہ تسلیم کرتے ہیں۔ ۲۸ نومبر کو روس کے صدر برزنیف نئی دہلی آئے۔ پالم کے ہوائی اڈے پر اُن کا خیر مقدم کرنے والوں میں شیخ محمد عبداللہ بھی شامل تھے۔ نئی دہلی میں ہندوستان کی وزیر اعظم نے مسٹر برزنیف کے اعزاز میں جو کھانے کی دعوت دی اس میں شیخ محمد عبداللہ کو بھی مدعو کیا گیا اور انہیں مسٹر برزنیف سے متعارف کروایا گیا۔ اس کے اگلے روز شیخ محمد عبداللہ روسی وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو جو مسٹر برزنیف کے ساتھ آئے تھے سے ملنے گئے اور دس منٹ تک اُن کے ساتھ رہے۔ ۳۰ نومبر کو شیخ محمد عبداللہ نئی دہلی سے واپس سری نگر آئے۔ جب میں ہوائی اڈے پر اُن سے ملا تو وہ غیر معمولی طور پر ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے چنانچہ ۱۳ نومبر بروز جمعہ اُنہوں نے درگاہ حضرت بل میں تقریر کی اور کہا "ہمارے خلاف یہاں ہیجان پیدا کیا جا رہا ہے یہ محض ایک سازش ہے۔ میں نے اپنی

زندگی اپنی قوم کے لئے وقف کر رکھی ہے جو شخص ساری زندگی آپ کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتا رہا وہ اب اس بڑھاپے میں آپ کے مقاصد اور فوائد کے ساتھ کس طرح بے وفائی کر سکتا ہے۔ مسٹر بھٹو ہمارے معاملات میں دخل دینے کی بجائے اپنے اندرونی معاملات سنبھالیں وہ نامعلوم ہم مصیبت زدہ لوگوں سے ہڑتال کی کیوں اپیل کرتے ہیں آخر اس ہڑتال کے نتائج کون بھگتے گا۔" شیخ صاحب نے اپنی اسی تقریر میں مسٹر بھٹو کے اُس بیان کی بھی نکتہ چینی کی جس میں مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ اگر اقوام متحدہ کی قرار دادیں پرانی ہو چکی ہیں تو کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے بات چیت کی جا سکتی ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ ان قرار دادوں میں کشمیری عوام کا بنیادی حق تسلیم کر لیا گیا ہے اور انہیں ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکا جا سکتا ہے۔ البتہ اُنہوں نے مسٹر بھٹو کی اُس اپیل پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا جس میں پاکستان کے وزیر اعظم نے شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی کے درمیان کسی امکانی سمجھوتے کے خلاف احتجاج کے طور پر ہڑتال کرنے کو کہا تھا۔ اس کے اگلے روز اُنہوں نے مجاہد منزل میں محاذی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ میری نئی دہلی کے ساتھ بات چیت کی واحد بنیاد ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کرنے پر ہی آگے بڑھ سکتی ہے ورنہ نہیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے وادی کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد وہ پھر دہلی گئے اور وہاں ایک ہفتے تک قیام اور بات چیت کے بعد ۳ جنوری ۱۹۷۵ء کو عید الاضحیٰ کی تقریب منانے کے لئے واپس سری نگر آئے چنانچہ اُنہوں نے ۸ جنوری ۱۹۷۵ء کو مجھے ایک ملاقات کے دوران بتایا "نئی دہلی کے ساتھ میری بات چیت آگے بڑھ رہی ہے اور مجھے امید ہے کہ ہم جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے"۔ جب میں نے اُن کی توجہ اس بات چیت کے خلاف کشمیری عوام کی بے چینی کی طرف

[1] یاد رہے کہ حکومت ہندوستان اور شیخ صاحب کے درمیان کسی امکانی سمجھوتے کے لئے بات چیت کے بارے میں پاکستان میں تشویش کا اظہار کیا جا رہا تھا چنانچہ مسٹر بھٹو نے ایک جلسے میں یہ اعلان کیا تھا "اگر شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی کے ساتھ یکطرفہ طور پر کوئی سمجھوتہ کر لیا تو پاکستان اس سمجھوتے کو قبول نہیں کرے گا اور اگر کوئی ایسا سمجھوتہ ہوا تو میں اس کے خلاف کشمیر کے لوگوں سے احتجاج کرنے کے لئے ایک روز کی ہڑتال کرنے کی اپیل کروں گا"۔

مبذول کروائی تو انہوں نے اس پر کہا: "یہ سب مفادِ خصوصی والے کروا رہے ہیں"۔ چنانچہ وہ ۸ جنوری ۱۹۶۸ء کو پھر نئی دہلی جا پہنچے۔ اور تقریباً اڑھائی ماہ تک ریاست سے باہر قیام پذیر رہے۔ ۲۰ مارچ کو وہ نئی دہلی سے جموں پہنچے جہاں انہوں نے مختلف سیاسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت جاری رکھی اور اس کے چند دن بعد ۲۸ مارچ کو واپس سری نگر آ گئے۔ ان کی کشمیر میں عدم موجودگی کے دوران لوگوں میں مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا چنانچہ یہاں پہنچنے کے اگلے دن بروز جمعہ انہوں نے درگاہ حضرت بل میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ "پچھلے دو اڑھائی ماہ کے دوران میرے متعلق یہاں مختلف کہانیاں پھیلائی جاتی رہی ہیں۔ لیکن لوگوں کو ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیئے۔ میں آپ کو اس مقدس مقام پر یہ یقین دلاتا ہوں کہ جس طرح میں نے آج تک کبھی آپ کے مفاد کا سودا نہیں کیا اور نہ آپ کو چھوڑا اسی طرح میں آئندہ بھی اپنے عہد پر قائم رہوں گا جو وعدہ میں آپ کے ساتھ کر چکا ہوں اس پر تاحیات قائم رہوں گا میری ۴۰ سالہ سیاسی زندگی آپ کے سامنے ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہتر تعلقات اور تصفیہ ہی اس وقت ہمارا حقیقی مفاد ہے۔ نئی دہلی میں میرے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ محاذ رائے شماری کو اپنا نام بدل لینا چاہیئے۔ لیکن میں نے ان پر واضح کر دیا کہ محاذ رائے شماری اپنا نام کیوں بدلے گا اس کا موقف تو رائے شماری ہے۔ اگر کشمیر کے تصفیے کے لئے کوئی متبادل راستہ ہے تو وہ ہمارے سامنے رکھا جائے ہم اس پر ضرور غور کریں گے"۔ ان کی اس تقریر کا ملا جلا رد عمل ہوا لیکن مجموعی طور پر لوگوں کی بے چینی برقرار رہی۔ اس کے بعد انہوں نے ترال میں یکم اپریل ۱۹۶۸ء کو اور مجاہد منزل میں ۴ اپریل کو علاقے کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "نئی دہلی کے ساتھ بات چیت کی بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۹۵۳ء پر لوٹا جائے میں نے بارہا آپ کو یقین دلایا ہے کہ بات چیت کا جو بھی نتیجہ نکلے گا وہ آپ کے سامنے رکھا جائے گا۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کے مجاز آپ ہوں گے کہ جو کچھ بھی نتیجہ نکلا ہے وہ منظور کیا جائے یا نامنظور"

شیخ محمد عبداللہ کی ان یقین دہانیوں کے باوجود کشمیر میں سیاسی بے چینی بڑھ رہی تھی اور لوگوں

میں یہ خیال عام ہوتا جا رہا تھا کہ محاذ رائے شماری اپنے موقف سے ہٹ گیا ہے۔ ۱۱ اپریل کو سری نگر میں پھر ہنگامے اور مظاہرے ہونا شروع ہو گئے جن کی بنا پر تمام کالج اور کشمیر یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ کئی روز کے ان ہنگاموں کے بعد صورتِ حال پھر بظاہر پُرسکون سی ہو گئی اور حکومت نے بڑے سخت ہاتھ سے ایجی ٹیشن کو کچل دیا۔ ۱۳ اپریل ۱۹۶۸ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم جب سری نگر آئیں تو شہر میں زبردست احتجاجی ہڑتال اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ اسی دوران ۱۶ اپریل کو شیخ محمد عبداللہ نے گاندربل میں نمازِ جمعہ پر تقریر کرتے ہوئے پھر کہا: "کشمیر کا مسئلہ برابر لٹک رہا ہے اور ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ اس کا فیصلہ صرف کشمیری عوام ہی کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں قوم کا سودا نہیں کروں گا اور میں نے قوم سے جو وعدے کئے ہیں، ان پر آخری دم تک قائم رہوں گا"۔ ہندوستان کی وزیر اعظم دو دن یہاں قیام کرنے اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد واپس نئی دہلی چلی گئیں۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو سرینگر اور وادی کے دوسرے حصوں میں پھر زبردست اور تشدد آمیز واقعات ہوئے جو تقریباً ۴ دن تک جاری رہے۔ اس کے بعد ۲۹ اپریل کو شیخ محمد عبداللہ نے بڈگام کے ایک جلسہ میں پھر یہ اعلان کیا کہ "ہم نے ہندوستان کے ساتھ مذاکرات میں یہ واضح کر دیا ہے کہ ہمیں صرف وہی حل قابل قبول ہو گا جو عوام کے حق خود ارادیت کا آئینہ دار ہو اور جس میں لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی مکمل ضمانت دی گئی ہو۔ کشمیر کے مسئلے کا کوئی پائیدار اور آبرومندانہ حل نکالنے کے لئے ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے"۔ ۸ مئی ۱۹۶۸ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم اپنے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کو ساتھ لے کر پھر سری نگر آئیں ان کے ہمراہ سینیگال کے صدر بھی تھے ریاستی حکومت نے ہندوستانی وزیر اعظم اور سینیگال کے صدر کے اعزاز میں جس ڈنر کا اہتمام کیا اس میں شیخ محمد عبداللہ بھی شریک ہوئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب وہ سرینگر میں ہندوستانی حکام کے بالکل قریب دیکھے گئے۔ سری نگر میں شیخ صاحب نے دو مرتبہ سردار سورن سنگھ کے ساتھ طویل بات چیت کی۔ شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی کے درمیان مذاکرات پر پاکستان کو جو اطلاعات مل رہی تھیں، ان پر پاکستان کے

وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے ہندوستان کی وزیر اعظم کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں یہ کہا گیا کہ شیخ صاحب اور نئی دہلی کے درمیان کوئی بھی سمجھوتہ یکطرفہ نوعیت کا ہوگا اور پاکستان کی شرکت کے بغیر کشمیر کے مسئلے کا کوئی بھی حل پائیدار ثابت نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں ہندوستان کی وزیر اعظم نے مسٹر بھٹو کو جو مراسلہ بھیجا اُس میں اُن پر واضح کیا گیا کہ جس طرح مسٹر بھٹو آزاد کشمیر کے لیڈروں کے ساتھ داخلی معاملات پر بات چیت کرتے ہیں اسی طرح حکومت ہند شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ داخلی معاملات پر بات چیت کر رہی ہے۔ ۵ جون ۱۹۷۴ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم کے سیکرٹری مسٹر پی این دھر نئی دہلی سے سرینگر آئے اور انہوں نے یہاں مختلف لوگوں کے ساتھ سیاسی معاملات پر گفت و شنید کی۔ وہ شیخ محمد عبداللہ سے بھی ملے۔ مسٹر دھر سے میری ملاقات گورنر ہاؤس میں ہوئی اور اُنہوں نے بات چیت کے دوران اشارہ دیا کہ کشمیر میں بہت جلد سیاسی تبدیلیاں ہونے والی ہیں اور شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی کے ساتھ تعاون کرنے کا یقین دلا دیا ہے اور پھر ۹ جون ۱۹۷۴ء کو وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ دوبارہ سرینگر آئے اور یہاں اُنہوں نے گورنر، وزیر اعلیٰ اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت کی۔ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ دو طویل ملاقاتوں کے بعد سردار سورن سنگھ نے سرینگر کے چشمہ شاہی گیسٹ ہاؤس میں اخباری نمائندوں کو بتایا "میں سرینگر میں بات چیت کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چونکہ شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی کے درمیان بنیادی معاملات پر بڑی حد تک یکسانیت ہے جس کی بنا پر ایک بامقصد تعاون کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اگر اس قسم کے تعاون کی بنیاد رکھ دی جائے تو نئی دہلی اس کا خیر مقدم کرے گی"۔ سردار سورن سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ جی پارتھا سارتھی بات چیت جاری ہے اور معاملات طے ہو جانے کی اُمید ہے۔ سردار سورن سنگھ نے یہاں تو اتنا ہی بتایا لیکن ۱۲ جون کو نئی دہلی واپس لوٹنے پر انہوں نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ "شیخ صاحب سے سمجھوتے کی بنیاد طے ہوگئی ہے۔ البتہ تفصیلات طے کرنے میں دو ایک ماہ لگیں گے"۔ سردار سورن سنگھ کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے ایک انٹرویو میں مجھے بتایا "سردار سورن سنگھ سے

میری بات چیت خوشگوار ماحول میں ہوئی ہے۔ میں نے اپنے نظریات بڑی صفائی کے ساتھ واضح کر دیئے ہیں جب کوئی ٹھوس فارمولا طے ہوگا تو اسے براہ راست لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ لوگوں کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اُن کی پیٹھ پیچھے یا اُن کے مفاد کے خلاف نہ میں نے پہلے کچھ کیا ہے اور نہ آئیندہ کروں گا"۔ ۱۳ جون کو سید میر قاسم کی کابینہ کا پانچ گھنٹے تک اجلاس ہوا جس میں سید میر قاسم نے صورت حال سے اپنے رفقا کو آگاہ کیا۔ اسی شام سید میر قاسم نے اپنی قیام گاہ پر مجھے بتایا "سمجھوتے کی بنیاد طے ہوگئی ہے اب اسے عملی جامہ پہنانے کے طریقہ کار کا سوال حل کرنا باقی ہے"۔ ۱۵ جون کو ہندوستان کی وزیر اعظم نے غیر ملکی اخبار نویسوں کی طرف سے دی گئی ایک دعوت پر سوالات کے جواب میں کہا "میں یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ ہندوستان سے کشمیر کا الحاق شک و شبہ سے بالاتر ہے اور اس پر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کوئی بات چیت نہیں ہو رہی ہے البتہ اُن کے ساتھ داخلی معاملات پر بات چیت ہو رہی ہے"۔ اس پر ۱۷ جون ۱۹۷۴ء کو شیخ محمد عبداللہ نے بڈگام میں محاذ کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا "انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کشمیریوں کے جائز حقوق تسلیم کئے جائیں اور ہم ایک ایسا تصفیہ چاہتے ہیں جسے ریاستی عوام یہاں تک کہ آزاد کشمیر کے لوگوں تک کی حمایت حاصل ہو"۔ اس کے پانچ دن بعد ۲۲ جون ۱۹۷۴ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم پھر سرینگر آئیں۔ ۲۳ جون بروز اتوار ہندوستان کی وزیر اعظم نے ریاستی وزیروں اور کانگریس کے اعلیٰ عہدیداروں کو کھانے پر بلایا اور انہیں شیخ محمد عبداللہ کو جموں کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ تین گھنٹے کی اس بات چیت میں کانگریسی وزیروں اور عہدیداروں نے ہندوستان کی وزیر اعظم کو تعاون کا یقین دلایا۔ وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے بھی مسز گاندھی کو کھانے کی دعوت دی اور جب اس دعوت پر وہ آئیں تو شیخ محمد عبداللہ اور میر قاسم دونوں نے اکٹھے اُن کا خیر مقدم کیا۔ ہندوستان کی وزیر اعظم نے کشمیر میں مقیم فوجی کمانڈروں کے ساتھ بھی صلاح مشورہ کیا۔ ان مذاکرات کے فوراً بعد ریاستی حکومت نے انتخابی کیس کے تمام ملزموں کو رہا کر دیا۔ مسز گاندھی کی سرینگر میں بات چیت اور نئی دہلی کو واپسی کے

بعد ۷ جولائی ۱۹۷۲ء کو مسٹر پارتھا سارتھی سری نگر آئے اور یہاں مسٹر بیگ کے ساتھ دو دن تک بات چیت کی۔ ۸ جولائی ۱۹۷۲ء کو محاذِ رائے شماری کا سالانہ اجلاس ہوا۔ جس میں محاذ کے لیڈروں نے اپنا موقف دہراتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ کشمیر کے بنیادی مسئلے کا تصفیہ چاہتے ہیں۔ سالانہ اجلاس کے بعد ۹ جولائی کو لال چوک سرینگر میں ایک بہت بڑا جلسہ عام ہوا جس میں شیخ محمد عبداللہ نے اعلان کیا۔ "میں آپ کو بار بار یقین دلا چکا ہوں کہ میری نئی دہلی کے ساتھ بات چیت کے نتیجے میں جو بھی حل نکل آئے اُسے عوام کے سامنے رکھوں گا اور یہ آپ کو اختیار ہے کہ آپ اسے قبول کریں یا مسترد کر دیں۔ یہ حل آپ کو منظور ہو تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں آزاد کشمیر کے عوام سے بھی پوچھا جائے گا۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پاکستان کے مفاد کو زک نہ پہنچے کیونکہ وہی حل پائیدار ثابت ہو سکتا ہے۔ جسے پورے برصغیر کی حمایت حاصل ہو۔" لیکن عوام میں جو بے چینی تھی اُس میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ محاذ کے اس اجلاس کے بعد عوام میں جو بداعتمادی پھیل رہی تھی اُس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عوامی ایکشن کمیٹی کے لیڈر مولوی فاروق نے شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی کے درمیان بات چیت کے خلاف ۱۰ جولائی کو یومِ احتجاج منانے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو انسانی سروں کا ایک سمندر شہر اور دیہات سے آئے ہوئے لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم شاہراہوں پر اُمڈ آیا۔ سرینگر میں یہ ایک بہت بڑا اور تاریخی عوامی مظاہرہ تھا اور حکومت کی زور زبردستی اور سادہ حادثے کے باوجود ہزارہا مرد و زن سرینگر کی جامع مسجد سے شہر کے مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے اُسی لال چوک میں پہنچے جہاں صرف پانچ دن پہلے شیخ محمد عبداللہ نے تقریر کی تھی۔ لیکن حکومت نے اس عوامی سمندر کو لال چوک میں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور اس پر سارے شہر اور پوری وادی میں غم و غصہ پھیلا اور امن و انتظام درہم برہم ہو گیا۔ اُدھر ۱۵ جولائی کو پاکستان کے وزیراعظم مسٹر بھٹو نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ اگر کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور شیخ محمد عبداللہ نے کوئی ناپسندیدہ فیصلہ کیا تو پاکستان اس کا پابند نہیں ہوگا اور

ایسے کسی فیصلے سے کشمیر کی متنازعہ حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مسٹر بھٹو کے اس اعلان پر مسٹر بیگ نے جو اُس وقت نئی دہلی میں مذاکرات کر رہے تھے اعلان کیا کہ کشمیر کے تصفیے کے متعلق پاکستان کی رائے بھی معلوم کی جائے گی۔ مسٹر بیگ کے اس بیان کی سرینگر کے اخبارات میں بڑی زبردست تشہیر کروائی گئی۔ کشمیر کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو دیکھ کر شیخ محمد عبداللہ نے ۱۸ جولائی ۱۹۷۲ء کو پھر لال چوک میں ایک جلسہ بُلایا جس میں اُنہوں نے واشگاف طور پر اعلان کیا کہ کشمیر کا فیصلہ صرف کشمیری عوام ہی کر سکتے ہیں۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ "میں نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ کشمیری عوام کی مرضی اور خواہشات کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہوگا اور نہ ہونے دیا جائے گا۔ میں پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نئی دہلی سے میری بات چیت کا جو بھی نتیجہ نکلے گا۔ وہ سب سے پہلے کشمیری عوام کے سامنے رکھا جائے گا اور وہ اس بات کے مجاز ہوں گے کہ وہ اسے قبول کریں یا مسترد کر دیں۔" اُدھر نئی دہلی میں بیگ، پارتھا سارتھی ملاقات کے بعد وزیراعظم کو یہ رپورٹ پیش کی گئی کہ معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی وزیراعظم نے کشمیر کے وزیراعلیٰ سید میر قاسم کو نئی دہلی طلب کیا۔ بعد میں مسٹر بیگ ۲۰ جولائی کو بذریعہ طیارہ سرینگر آئے۔ اور ۲۲ جولائی کو پھر نئی دہلی چلے گئے اور وہاں مسٹر پارتھا سارتھی اور وزیراعظم کے ساتھ پھر کئی بار ملاقات کی۔ اس کے بعد ۱۲ ستمبر کو ہندوستانی کابینہ کا ایک وزیر مسٹر بروا سرینگر آیا اور اُس نے صورہ میں شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ سنگِ بنیاد رکھنے کی اس تقریب میں کشمیر کے وزیراعلیٰ، سرکاری افسروں اور کانگریسی لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ اس تقریب میں بہت سے دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ اور جب مسٹر بروا کا خیر مقدم کرتے ہوئے شیخ صاحب نے مسٹر بروا زندہ باد کا نعرہ لگایا تو تقریب پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ مسٹر بروا نے اُس ڈنر پر جو شیخ صاحب نے اُن کے اعزاز میں دیا تھا بات چیت کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۱۴ ستمبر ۱۹۷۲ء کو نئی دہلی کے لئے روانہ ہو گئے جہاں اُنہوں نے وزیراعظم اور مسٹر پارتھا سارتھی کے ساتھ طویل بات چیت کی۔ مسٹر بیگ بھی اُن کے ساتھ تھے ان مذاکرات کے بعد شیخ صاحب نے نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں ۱۸ ستمبر کو کہا "میرا نئی دہلی کے

ساتھ اُس وقت تک کوئی بھی سمجھوتہ خارج از امکان ہے جب تک کہ ریاست کی موجودہ اسمبلی کو توڑ کر باقاعدہ اور نئے سرے سے انتخابات نہ کروائے جائیں۔ میں نئی دہلی کے ساتھ اپنی بات چیت میں اس بات پر بھی زور دے رہا ہوں کہ کشمیر میں کم از کم ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کی جائے۔" نئی دہلی میں پانچ دن تک بات چیت کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر بیگ واپس سری نگر آ گئے۔

اکتوبر کے پہلے ہفتے میں کشمیر میں پھر تشدد آمیز مظاہرے ہوئے اور پولیس اور طلباء کے درمیان کئی مقامات پر جھڑپیں ہوئیں۔ طلباء اور نوجوانوں نے کئی جلوس نکالے جن میں رائے شماری کا مطالبہ کیا گیا اور محاذ کے لیڈروں پر بنیادی موقف سے انحراف کا الزام لگایا گیا۔ اُنہوں نے اندرا شیخ مذاکرات کے خلاف بھی احتجاج کیا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو نماز عید پر عیدگاہ میں تقریر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے یہ ڈرامائی اعلان کر دیا۔ کہ "اگر نئی دہلی کے لئے ۱۹۵۳ء کی پوزیشن قابل قبول ہو تو ہم اقتدار سنبھال سکتے ہیں۔" لیکن اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ کشمیر کے معاملے پر ہندوستان کے ساتھ جو بات چیت ہو رہی ہے۔ اُس کے نتائج سب سے پہلے یہاں کے لوگوں کے سامنے رکھے جائیں گے اور وہی اس کے مجاز ہیں کہ وہ اس امکانی حل کو قبول کریں یا مسترد کریں۔ ۲۵ اکتوبر کو شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کے ساتھ ملاقات کی۔ سید میر قاسم نئی دہلی میں ۱۵ دن تک ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد ۲۴ اکتوبر کو واپس سری نگر آئے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ نے اُن کے ساتھ ملاقات کے بعد اگلے دن پھر نئی دہلی کا رُخ کیا اور وہاں دو دن قیام کرنے کے بعد ۲۸ اکتوبر کو واپس سرینگر آ گئے۔ وہ اُسی طیارے میں واپس سرینگر آئے جس میں ہندوستان کی وزیر اعظم سرینگر پہنچیں۔ ہندوستان کی وزیر اعظم کشمیر کے وزیر اعلیٰ کو اپنے ہمراہ لے کر سرینگر سے روانہ ہو گئیں اور ۳۰ اکتوبر کو واپس سری نگر آگئیں اور یہاں ۳۰ اکتوبر شام کو سید میر قاسم کے ہاں کھانے پر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ تقریباً ڈھائی گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت میں خود سید میر قاسم نے بھی حصہ لیا۔ ہندوستان کی وزیر اعظم یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو واپس نئی دہلی چلی گئیں اور اس کے اگلے دن ۲ نومبر کو مسٹر پارتھا سارتھی سرینگر

آئے اور اُنہوں نے سری نگر میں مسٹر بیگ اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ گفت و شنید کی۔ اس بات چیت کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے ۲ نومبر کو سری نگر کے لال چوک میں ایک عوامی جلسے کو بتلایا۔ "اگر ہندوستان کشمیر کا مسئلہ بات چیت کے ذریعے طے کرنا چاہتا ہے تو یہ اچھی بات ہے لیکن اگر وہ ٹال مٹول کرنا چاہتا ہے تو وہ یہ آخری موقع بھی کھو دے گا اور اُسے پچھتانا پڑے گا۔ کیوں کہ اگر بات چیت ناکام ہو گئی تو یہاں ایک انقلاب آجائے گا۔ آپ یقین رکھیں کہ ہم ۱۹۳۱ء کے مقاصد کو ترک نہیں کر سکتے۔" اس کے بعد ۹ نومبر کو مسٹر بیگ نئی دہلی گئے اور وہاں مسٹر پارتھا سارتھی کے ساتھ اپنی بات چیت جاری رکھی۔

۱۳ نومبر کو سرینگر سے ۵۵ میل دور کپوارہ میں شیخ محمد عبداللہ نے پھر عوام کو یقین دلایا کہ "ہم کشمیر کا مسئلہ حتمی طور پر حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس مسئلے پر نئی دہلی سے بات چیت ہو رہی ہے اگر بات چیت میں کوئی باعزت حل نکل آیا تو اسے لوگوں کے سامنے رکھا جائے گا۔ کیوں کہ اسے قبول کرنا یا مسترد کرنا لوگوں کا کام ہے۔ اگر لوگوں نے یہ حل قبول کر لیا تو ہم اسے لے کر پاکستان کے پاس بھی جائیں گے تاکہ کشمیر کا کوئی حتمی فیصلہ ہو جائے۔ اور اس کے لئے پاکستان اور ہندوستان کی مفاہمت اور رضامندی لازمی ہے۔" اُدھر ۱۴ نومبر ۱۹۷۴ء کو نئی دہلی میں مرزا محمد افضل بیگ نے اعلان کر دیا کہ محاذ رائے شماری کے لیڈروں اور نئی دہلی کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ مسٹر بیگ نے نئی دہلی میں ۱۴ نومبر کی صبح کو ایک پریس کانفرنس میں یہ اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "میں اور مسٹر پارتھا سارتھی بات چیت کے بعد جس نتیجے پر پہنچے ہیں اُس سے مسز گاندھی اور شیخ محمد عبداللہ کو آگاہ کر دیا گیا ہے۔" اور اس کے بعد مسٹر بیگ ۱۸ نومبر کو واپس سرینگر آگئے مرزا محمد افضل بیگ کے ۱۴ نومبر کے بیان کے بعد ۱۵ نومبر ۱۹۷۴ء کو چرار شریف میں عرس کی تقریب پر شیخ محمد عبداللہ نے جو تقریر کی اُس میں اُنہوں نے لوگوں کی مایوسی اور اُن کے غم و غصے کا ازالہ کرنے کے لئے اعلان کیا کہ "کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے ساتھ باعزت سمجھوتہ ہونے سے ہی یہ مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اب ہم پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر بھٹو سے بھی بات چیت کریں گے۔ کیوں کہ جب تک پاکستان

بھی اس معاملے میں شریک نہیں ہوگا کشمیر کا مسئلہ حتمی طور پر حل نہیں ہو سکے گا۔" اس سمجھوتے کے اعلان پر پاکستان کو جو تشویش لاحق ہوئی اُس کا اظہار کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے ۱۰ نومبر کو ایک اخباری کانفرنس میں اعلان کیا: "ہندوستان شملہ سمجھوتے کے تحت کشمیر کا پاکستان کے ساتھ حتمی تصفیہ کرنے کا عہد کر چکا ہے۔ اس عہد کے ہوتے ہوئے کشمیر میں کوئی بھی یکطرفہ اقدام شملہ سمجھوتے کی سپرٹ کے منافی ہوگا اور پاکستان اسے قبول نہیں کرے گا۔" اس کے بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۷۴ء کو ہندوستان کی حکومت نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہت جلد کشمیر کے مسئلہ پر مذاکرات شروع ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے وزیر خارجہ نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بات چیت ہندوستان کا داخلی معاملہ ہے اور پاکستان کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کے بعد ۲۰ دسمبر کو عید الاضحیٰ پر شیخ محمد عبداللہ نے سری نگر کے عید گاہ میں ناراض اور مایوس لوگوں کے ایک بہت بڑے اجتماع سے کہا: "میری نئی دہلی کے ساتھ بات چیت جاری ہے لیکن کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اس بات چیت کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ مجھے اقتدار کی کوئی خواہش نہیں۔ البتہ کشمیر کے مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں آج پھر یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کا دائمی حل وہی ہوگا جو کشمیری عوام، ہندوستان اور پاکستان تینوں فریقوں کو قابل قبول ہو۔ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ بات چیت کا جو بھی نتیجہ نکلے گا اُسے آپ کے سامنے رکھوں گا یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اُسے قبول کریں یا مسترد کر دیں۔"



۲۰



وادی میں اپنے مختصر قیام کے بعد ۳ جنوری ۱۹۷۵ء کو شیخ محمد عبداللہ سرینگر سے جموں روانہ ہو گئے،
جموں میں انہوں نے ریاست کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کے ساتھ دوبار طویل بات چیت کی۔ اس بات چیت
کے بعد سید میر قاسم نے اپنے قریبی رفقاء کو بتایا کہ ____ "نئی دہلی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان جو
کچھ طے پایا ہے، اس کے مطابق میری جگہ شیخ صاحب وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ انہیں ریاستی اسمبلی کی موجودہ کانگریس
لیجسلیچر پارٹی ہی وزیر اعلیٰ منتخب کرے گی اور وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے یہ عہدہ سنبھالیں گے۔" اس
پر قاسم صاحب کے بعض رفقاء نے کچھ خدشات ظاہر کئے تو انہوں نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ اصل اقتدار تو کانگریس پارٹی
ہی کے پاس رہے گا، اس لئے انہیں گھبرانا نہیں چاہیے۔ اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو اب شیخ صاحب زیادہ دیر انتظار
نہیں کریں گے اور انہوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ اگر طے شدہ باتوں پر فوری طور عملدرآمد نہیں کیا جاتا، تو میں اپنی پرانی پوزیشن
پر واپس چلا جاؤں گا اور جموں کشمیر میں رائے شماری کرانے کا پھر سے مطالبہ کروں گا۔"

جموں میں بات چیت کے بعد ۶ جنوری ۱۹۷۵ء کو شیخ محمد عبداللہ بذریعہ طیارہ اور اسی دن شام کو وزیر اعلیٰ
سید میر قاسم بذریعہ ٹرین نئی دہلی روانہ ہو گئے۔ نئی دہلی پہنچنے کے بعد سید میر قاسم نے ہندوستان کی وزیر اعظم کو ساری صورت

حال سے باخبر کر دیا اور وہ بعد میں شیخ محمد عبداللہ کی قیام گاہ پر ان سے بھی ملنے گئے ____ اگلے دن شام کو میں نے
ٹیلی فون پر سید میر قاسم کے ساتھ رابطہ قائم کیا تو انہوں نے مجھے بتایا ____ "سارے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ شیخ
صاحب کانگریس لیجسلیچر پارٹی کا لیڈر بننے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ اور باقی تمام آئینی، انتظامی اور سیاسی معاملات جوں کے
توں چلتے رہیں گے۔" قاسم صاحب نے میرے استفسار پر بتایا کہ اگر شیخ صاحب نے یہ پوزیشن قبول کر لی تو وہ اسی
جگہ وزیر اعلیٰ ہوں گے، تاہم اقتدار برابر کانگریس کے ہاتھ میں رہے گا۔ نئی دہلی میں شیخ صاحب نے سید میر قاسم کے علاوہ مسٹر ڈی
پی دھر اور مسٹر پارتھا سارتھی سے بھی ملاقات کی۔ اسی اثنا میں مسٹر پنت کو نئی دہلی بلایا گیا اور ان کے علاوہ کشمیر کے گورنر اور
چیف سیکرٹری کو بھی نئی دہلی طلب کر لیا گیا۔ مذاکرات کا یہ سلسلہ تقریباً ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ چنانچہ ۱۰ جنوری کو شیخ محمد
عبداللہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کے ہمراہ نئی دہلی سے جموں واپس آ گئے۔ جہاں ان دونوں کا سرکاری طور پر استقبال کیا گیا۔ جموں
میں شیخ محمد عبداللہ نے کانگریسی ممبران اسمبلی کے ساتھ بات چیت کی اور انہیں یقین دلایا کہ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد وہ ان کے
منتخب لیڈر کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ان ملاقاتوں میں سید میر قاسم اور مسٹر ڈی پی دھر بھی شامل رہے۔ جموں میں بات چیت
کرنے اور اطمینان حاصل ہونے کے بعد شیخ محمد عبداللہ ۱۵ جنوری کو واپس نئی دہلی گئے۔ جہاں انہوں نے ہندوستان کی
وزیر اعظم مسز گاندھی کو اپنی جموں کی بات چیت کے نتائج سے آگاہ کیا اور مسز گاندھی نے انہیں یقین دلایا کہ انہیں
جموں کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے گا۔

شیخ محمد عبداللہ اور نئی دہلی کے درمیان سمجھوتے کے خلاف پاکستان میں شدید رد عمل ہوا اور پاکستان کے
وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ وہ کشمیری عوام اور پاکستان کی طرف سے اس سمجھوتے کو مسترد کر کے اس کے خلاف احتجاج کے لئے
پاکستان اور ریاست جموں کشمیر میں ایک دن کی علامتی ہڑتال کی اپیل کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ہڑتال کے دن کا اعلان بعد
میں کیا جائے گا۔ ادھر سب کچھ طے کرنے کے بعد ہندوستان کی وزیر اعظم نے کشمیر کے وزیر اعلیٰ اور بعض سرکردہ کانگریسی لیڈروں
کو نئی دہلی بلایا اور ان کے ساتھ بات چیت کے دوران وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کے کانگریس پارٹی کے لیڈر کے عہدے سے
مستعفی ہونے اور ان کی جگہ شیخ محمد عبداللہ کو پارٹی کا لیڈر منتخب کرنے کا پروگرام طے کیا اور جب اس کی اطلاع میر قاسم نے
مسٹر بیگ کو دی تو بیگ صاحب نے ۱۰ فروری کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ شیخ صاحب اور نئی دہلی

کے درمیان مفاہمت ہوگئی ہے اور اس طرح ریاست جموں کشمیر اور مرکز کے درمیان پائیدار تعلقات کے لئے ایک اچھی بنیاد فراہم ہوگئی ہے۔ اب میں کشمیر واپس جاکر اپنے رفقاء سے محاذ رائے شماری کا نام اور اس کے اغراض و مقاصد تبدیل کرنے کے معاملے پر بات چیت کروں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا۔"

شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مفاہمت کے فوراً بعد مسٹر درگا پرشاد دھر کو دوبارہ ماسکو میں سفیر مقرر کیا گیا۔ وہ دو برس تک ہندوستان کی کابینہ میں منصوبہ بندی کے وزیر رہے اور اہم داخلی اور خارجی منصوبوں کو پورا کرنے کے بعد ہی دہلی سے ماسکو گئے جہاں انہوں نے پھر سفیر کا منصب سنبھال لیا۔ ۱۱ فروری کو مرزا محمد افضل بیگ نے سرینگر آکر محاذ رائے شماری کا اجلاس طلب کیا اور اس میں بتایا کہ "مذاکرات کے نتائج سے کسی موزوں وقت پر عوام کو آگاہ کیا جائے گا۔ ہمارا نئی دلی سے سمجھوتہ ہو چکا ہے اور یہ سمجھوتہ میرے اس بیان کے مطابق ہے جو میں نے ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء کو نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں دیا تھا اور جس میں یہ بات میں نے واضح کردی تھی کہ برصغیر میں حالات کی تبدیلی نے ہمیں مجبور کردیا ہے کہ ہم ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کریں۔ ہم پاکستان کے خیر خواہ ہیں۔ اور اسے خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں لیکن کشمیر کے لوگ اپنے مسائل خود طے کرنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہاں ایک ناخوشگوار فضا دیکھنے میں آرہی ہے یہ ان لوگوں کی پیدا کردہ ہے جو سمجھوتے سے پریشان ہوگئے ہیں۔" اس کے چند دن بعد وہ یہاں سے جموں چلے گئے جہاں سے وہ دہلی گئے

چنانچہ پروگرام کے مطابق ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء کو جموں میں کانگریس لیجسلیچر پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں سید میر قاسم نے اپنا استعفیٰ پیش کیا اور ممبروں سے استدعا کی کہ وہ ان کی جگہ شیخ محمد عبداللہ کو وزیر اعلیٰ منتخب کریں۔ اس کے اگلے دن شیخ محمد عبداللہ دہلی سے بذریعہ ٹرین جموں روانہ ہوئے۔ ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ جو سمجھوتہ ہوا ہے وہ آئین ہند کی حدود کے اندر ہے اور مرکز اور جموں کشمیر کے تعلقات آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے مطابق ہوں گے۔ اگر کسی آئینی دفعہ کے بارے میں ریاستی آئین میں ترمیم کی جائے گی تو یہ صدر جمہوریہ ہند کی اجازت کے بغیر نافذ نہیں ہو سکے گی۔ ہم نے کشمیری لیڈروں کی اس تجویز کو منظور نہیں کیا ہے کہ جموں کشمیر میں سپریم کورٹ کا حد اختیار مختصر کیا جائے۔ جموں کشمیر میں گورنر کو صدر ریاست اور وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم نام دینے کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ ہم نے شیخ محمد عبداللہ کی اس تجویز کو بھی منظور نہیں کیا ہے کہ کشمیر میں ۱۹۵۳ء کی آئینی

پوزیشن بحال کی جائے۔ شیخ صاحب نے ریاست میں گورنر راج نافذ کرنے کے بارے میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایسا کرنے سے پہلے ریاستی حکومت کی رضامندی حاصل کی جائے لیکن ہم نے یہ تجویز بھی تسلیم نہیں کی۔ آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ ایک مستقل دفعہ ہے اور ۱۹۵۲ء سے آئین ہند کا ایک حصہ چلی آرہی ہے۔" ہندوستان کی وزیر اعظم کے اس بیان کا کشمیر میں انتہائی شدید رد عمل ہوا اور شہر میں کئی جلوس نکالے گئے جن میں شیخ اندرا سمجھوتہ مردہ باد کے نعرے بلند کئے گئے۔ ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کی صبح سید میر قاسم سخت پریشان ہوگئے کیونکہ انہیں پارلیمنٹ کے ایک ممبر شمیم احمد شمیم نے یہ بتایا تھا کہ پارلیمنٹ میں مسز گاندھی کے بیان سے شیخ صاحب کو بہت دکھ ہوا ہے۔ انہوں نے صبح سویرے مجھے بتایا ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن سید میر قاسم کا کہنا تھا کہ جب شیخ محمد عبداللہ کی قیام گاہ پر انہیں اپنے ساتھ لانے کے لئے گئے۔ تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ شیخ صاحب ایک خوبصورت سوٹ پہنے اور وزیر اعلیٰ بننے کے لئے تیار بیٹھے ہیں اور انہوں نے اس موقعہ پر مسز گاندھی کے بیان کا ذکر تک نہیں کیا۔ شیخ صاحب اجلاس میں آئے اور کانگریس پارٹی نے شیخ محمد عبداللہ کو اپنا لیڈر منتخب کیا۔ اور شیخ صاحب نے مسٹر بیگ کے علاوہ دو سرکاری ملازمین جموں کے ایک جج ہائی کورٹ ٹھاکر اور وی داس اور لداخ کے سنم نربو جو ریاست میں پبلک ورکس کے انجینئر رہ چکے تھے پر مشتمل اپنی کابینہ بنائی۔ یہ ساری کارروائی کشمیری عوام کی پیٹھ پیچھے ہی کی گئی اور انہیں پوچھا تک نہیں گیا۔ البتہ محاذ کے کارکنوں نے اس بات کی خوشی منائی کہ انہیں اقتدار مل رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد شیخ صاحب نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے مختلف سوالات کے جواب میں بتایا ــــــ "موجودہ انتظام بالکل عارضی نوعیت کا ہے۔ اگلے دو تین ماہ کے دوران ریاستی اسمبلی کے لئے نئے انتخابات کرائے جائیں گے تاکہ عوام کی منتخب کی گئی حکومت بن سکے۔"

شیخ محمد عبداللہ کے وزیر اعلیٰ بننے پر پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے کشمیری عوام سے اپیل کی کہ وہ اس سمجھوتے کے خلاف ۲۸ فروری ۱۹۷۵ء بروز جمعہ ہڑتال کریں جو شیخ محمد عبداللہ اور ہندوستان کی وزیر اعظم کے درمیان ہوا ہے چنانچہ ۲۸ فروری ۱۹۷۵ء کو نہ صرف سرینگر بلکہ وادی کے تمام حصوں میں ایک ہمہ گیر احتجاجی ہڑتال ہوئی۔ اور ساری وادی میں خوف و دہشت کا سماں پیدا ہوگیا۔

۲۸ فروری بروز جمعہ ہڑتال ہونے سے ایک روز قبل سرینگر میں کچھ دھماکہ خیز واقعات رونما ہوئے اور تقریباً تین

مقامات پر بموں کے دھماکے بھی ہوئے۔ ایک بم کا دھماکہ شہر کے سب سے اہم اور بارونق مرکز امیرا کدل میں ہوا جس میں کشمیر آرمڈ پولیس کے چار افسر بُری طرح زخمی ہوئے۔ جن میں سے ایک ہلاک ہو گیا۔ ان واقعات نے سرینگر میں خوف و دہشت کی ایک فضا سی قائم کر دی۔ ان دھماکہ خیز واقعات اور خوف و دہشت کی فضا نے بھٹو صاحب کی ہڑتال کی اپیل کو کامیاب بنا دیا۔ ہڑتال کو ناکام بنانے کے لئے حکام نے زور زبردستی کے تمام حربے استعمال کئے یہاں تک کہ سوپور میں سنٹرل ریزرو پولیس کے سپاہیوں نے طلباء اور نوجوانوں کے ایک جلوس پر اس بے دردی سے لاٹھی چارج کیا کہ اس میں ایک جواں سال طالب علم غلام محمد بٹ ہلاک اور دوسرے کئی نوجوان بُری طرح زخمی ہو گئے۔ وادی میں تو مسٹر بھٹو کی اپیل پر مکمل ہڑتال ہوئی لیکن ہندوستان کی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اس سارے معاملے کی پردہ پوشی کے لئے یہ مضحکہ خیز بیان دیا کہ "میں کشمیری عوام کو مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کی اپیل کو نظر انداز کر دیا اور کوئی ہڑتال وغیرہ نہیں کی" — مسز اندرا گاندھی کے اس بیان پر اپوزیشن پارٹی کے ایک لیڈر نے ایوان میں سرینگر کے اخبارات ایوان کو دکھائے جن میں جلی سرخیوں کے ساتھ اس ہمہ گیر ہڑتال کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ اس احتجاج کے دو دن بعد یعنی ۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو شیخ محمد عبداللہ جموں سے سرینگر آئے۔ سرینگر پہنچتے ہی نئے وزیر اعلیٰ کا محاذ رائے شماری کی طرف سے اور سرکاری طور پر نہایت ہی پرتپاک استقبال کیا گیا۔ یہاں لال چوک میں ایک جم غفیر سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اپنی نئی کابینہ کا اس طرح تعارف کرایا "جب میں وزیر اعلیٰ بنا تو مجھے ریاست میں کوئی دیانت دار شخص نظر نہ آیا چنانچہ میں نے جموں کے ٹھاکر دیوی داس سے جو ہائی کورٹ کے جج تھے استدعا کی کہ ملازمت چھوڑ کر میری کابینہ میں شامل ہو جائیں۔ ٹھاکر صاحب نے مجھ پر مہربانی کی اور میری درخواست منظور کر کے کابینہ میں شامل ہو گئے۔ مسٹر سونم نربو جو منگولیا میں ہندوستان کے سفیر تھے کو میں نے مسز گاندھی کی وساطت سے واپس منگوایا اور وہ منگولیا کی چراگاہوں سے آ کر میری کابینہ میں شامل ہو گئے۔" شیخ صاحب نے مسٹر بیگ کا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ میری نظریں صرف دیانت داروں کو تلاش کر رہی تھیں چنانچہ مجھے اس ساری ولایت میں صرف یہ تین ایسے آدمی دیانت دار مل سکے جن کو وزیر بنایا گیا ہے۔ اس ساری کارروائی کے بارے میں محاذ رائے شماری کے لیڈر اور عہدے دار عوام میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اصل مقاصد کو آگے بڑھانے کی جدوجہد کے لئے اقتدار پر قبضہ ضروری تھا۔ "جس میں ہم کامیاب ہو گئے ہیں" اور بظاہر یہ تاثر بھی دیا جاتا تھا کہ شیخ صاحب کا کانگریس لیجسلیچر پارٹی کی حمایت سے

وزیر اعلیٰ بننا محض ایک آئینی رسم کو پورا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں شیخ صاحب تمام تر اختیارات کے مالک بن گئے ہیں۔ محاذ کے لیڈر اور عہدے دار عوام میں یہ تاثر پیدا کر کے اس بات میں کامیاب ہو گئے کہ لوگوں نے کسی قسم کی مزاحمت کی بجائے "انتظار کرو اور دیکھو آگے کیا ہوتا ہے" پر اکتفا کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کے کانگریس لیجسلیچر پارٹی کی حمایت پر وزیر اعلیٰ بننے کے صرف دو ایک ہفتے بعد ہی ریاستی کانگریس نے کابینہ میں اپنے نمائندوں کو شامل کرنے کا مطالبہ پیش کر دیا اور یہ انکشاف کیا کہ سمجھوتے کی بات چیت کے دوران شیخ محمد عبداللہ نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد وہ کانگریس پارٹی کے نمائندوں کو بھی اپنی وزارت میں شامل کر لیں گے۔ ایک طرف ریاستی کانگریس کے لیڈر کابینہ میں شمولیت کے مطالبے کر رہے تھے اور دوسری طرف ۱۸ اپریل ۱۹۷۵ء کو محاذ رائے شماری کی مجلس عاملہ کا اجلاس جموں میں منعقد ہوا۔ محاذ رائے شماری کی ۲۲ برس کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا جبکہ اس کی مجلس عاملہ کا اجلاس جموں میں ہوا۔ مجلس عاملہ میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس کا مقصد محاذ رائے شماری کا نام تبدیل کرنا تھا۔ ریاستی کانگریس کے لیڈروں نے جب ہندوستان کی وزیر اعظم مسز گاندھی سے شکایت کی کہ شیخ صاحب کانگریسیوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور طے شدہ سمجھوتے کے مطابق ریاستی کانگریس کو کابینہ میں نمائندگی نہیں دی جا رہی ہے تو مسز گاندھی خود ۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء کو نئی دہلی سے جموں آئیں۔ اور وہاں اپنے دو روزہ قیام کے دوران شیخ صاحب سے کہا کہ وہ کابینہ میں کانگریسی وزیروں کو فوراً شامل کریں۔ چنانچہ مسز گاندھی کے مشورے کے مطابق وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے ۲۲ اپریل کو گیارہ افراد کی ایک فہرست گورنر کو بھیجی جنہیں بطور وزرائے مملکت اور نائب وزیر بنانے کی سفارش کی گئی۔ ان میں کانگریس کے پانچ — محبت پیچو رام، مرزا رنگیل سنگھ، مسٹر منگت رام، چوہدری محمد اسلم اور کرگل کے کاچو محمد علی — محاذ رائے شماری کے تین عطاء اللہ سہروردی، غلام نبی کوچک اور حکیم حبیب اللہ — اور تین ان پارٹی افراد — [illegible] موہن کشن ٹکو، نواکدل گرلز کالج کی پرنسپل مس طاہرہ شاہ تیمیری اور خواجہ غلام محمد شاہ شامل تھے — جب کانگریسی لیڈروں کو اس فہرست کا علم ہوا تو انہوں نے ٹیلیفون پر مسز گاندھی سے شکایت کی کہ شیخ صاحب سیاسی لیڈروں پر سرکاری ملازمین کو ترجیح دے کر وزیر بنا رہے ہیں۔ چنانچہ مسز گاندھی نے شیخ محمد عبداللہ کو ٹیلیفون پر کہا کہ وہ مس طاہرہ شاہ تیمیری کی بجائے ایک سابق وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کی دختر زینب بیگم کو کابینہ میں شامل کریں۔ مس طاہرہ شاہ تیمیری کو وزیر بننے کے لئے پہلے ہی سرینگر سے جموں طلب کیا گیا تھا کالج کے سٹاف نے انہیں الوداعی پارٹی بھی دی۔ اور محکمہ اطلاعات نے حسب دستور دوسرے وزیروں کی طرح ان کی پبلیکیشن خدمات

عمر سلیاتی، چوڑاتی اور ہنڈواٹی کا محاذ تیار کر کے اخبارات کو ذرائع ہم بھی کر دیا۔ لیکن جب وہ جموں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا نام ڈراپ کر کے زینب بیگم کو وزیر بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ گورنر نے کانگریس کے چھ، محاذ کے تین اور دو نان پارٹی وزیروں کو اُن کے عہدوں کا حلف دلوایا۔

کابینہ میں نمائندگی حاصل کرنے کے باوجود ریاستی کانگریس کے جو لیڈر اقتدار سے محروم ہو گئے تھے اُن کے اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان سیاسی محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جس کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستان کی وزیر اعظم نے مسٹر پارتھا سارتھی کو سرینگر بھیجا اور سرینگر میں مسٹر پارتھا سارتھی نے بات چیت کے بعد ہندوستان کی وزیر اعظم کو صورت حال سے باخبر کر دیا۔ اس کے بعد مسز گاندھی نے ۸ جون ۱۹۷۵ء کو ہندوستان کے صدر فخر الدین علی احمد کو کشمیری لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لیے سرینگر بھیجا۔ ان کی آمد کے دوسرے دن امورِ خارجہ کے سیکرٹری مسٹر کیول سنگھ اور مسز گاندھی کے ایک معتمد مسٹر ٹی این کول کو بھی سرینگر بھیجا گیا۔ ۱۱ جون ۱۹۷۵ء کو کانگریس کے صدر مسٹر بروا بھی سرینگر آ گئے۔ اور اُسی دن مسٹر ڈی پی دھر جو ستمبر ۱۹۷۴ء سے کشمیری سیاست سے وابستہ رہے تھے اور اُن دنوں ماسکو میں ہندوستان کے سفیر تھے نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔ ۱۲ جون ہی کو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس جگ موہن سنہا نے ہندوستان کی وزیر اعظم مسز گاندھی کا پارلیمنٹ کے لیے انتخاب کالعدم قرار دے دیا۔ مسٹر ڈی پی دھر کی میت نئی دہلی سے سرینگر لائی گئی جہاں اُن کی آخری رسومات انجام دی گئیں۔ اُن کے سوگ میں وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ بھی ہوا۔ جس میں شیخ صاحب نے زار و قطار روتے ہوئے ڈی پی دھر کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے خواجہ غلام محمد صادق اور بخشی غلام محمد کی موت پر شیخ صاحب کا رویہ اس کے بالکل مختلف رہا۔ انہوں نے بخشی صاحب اور صادق صاحب کی موت پر اُن کے خاندان سے اظہار تعزیت تک نہیں کیا۔ ۲۵ جون ۱۹۷۵ء رات کو ہندوستان میں ہنگامی حالات کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ جس کے تحت مسز گاندھی نے وسیع تر اختیارات سنبھال لیے۔ تمام اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈران جن میں جے پرکاش نارائن اور مرارجی ڈیسائی بھی شامل تھے گرفتار کر لیا گیا۔ اخبارات پر پابندی لگا دی گئی۔ اور سنسر بٹھا دیا گیا۔ اور جماعت اسلامی ہند کے ساتھ ساتھ راشٹریہ سیوک سنگھ کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔

۲ جولائی ۱۹۷۵ء کو شیخ محمد عبداللہ گاندربل کے حلقۂ انتخاب سے ضمنی انتخاب لڑ کر ریاستی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ کانگریس کے ساتھ طے کئے گئے سمجھوتے کے مطابق اس حلقے کے کانگریسی ممبر اسمبلی مسٹر مقبول بٹ نے مستعفی ہو کر

یہ نشست خالی کر دی تھی۔ تاکہ شیخ صاحب ایوان کے ممبر بن سکیں۔ یہ اس لئے ضروری تھا کیونکہ کوئی شخص آئین کی رو سے اگر ایوان کا ممبر نہ ہو تو چھ ماہ کے بعد وزیر یا وزیر اعلیٰ نہیں رہ سکتا۔ اُن کے ممبر اسمبلی بن جانے اور ہندوستان میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ریاستی اسمبلی کے لئے انتخاب کا معاملہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ریاستی حکومت کی استدعا پر جموں و کشمیر پر بھی ایمرجنسی کا اطلاق کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جموں و کشمیر جماعت اسلامی کو بھی خلاف قانون قرار دیا گیا۔



کشمیر ایکارڈ کی دستاویزیں

۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء کو نئی دہلی میں مرزا محمد افضل بیگ اور مسٹر جی پارتھا سارتھی نے "کشمیر ایکارڈ" کی دستاویز پر دستخط کئے۔ اس دستاویز میں فریقین جن باتوں پر متفق ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱ —— ریاست جموں کشمیر، جو ہندیونین کا ایک جزو ہے، کے یونین کے ساتھ تعلقات بدستور آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تابع ہوں گے۔

۲ —— قانون سازی سے متعلق بقایا اختیارات بدستور ریاست کے دائرہ اختیار میں رہیں گے تاہم ہند کی علاقائی سالمیت اور خود مختاری کو جھٹلانے، اس پر انگلی اٹھانے یا اس میں تفرقہ ڈالنے یا ہند کے کسی حصے کو الگ کرنے یا ہند کے کسی حصے کو یونین سے الگ کرنے یا ہند کے قومی پرچم، قومی ترانے اور آئین کی توہین کرنے کی کارروائیوں کا تدارک کرنے سے متعلق قانون بنانے کا اختیار بدستور پارلیمنٹ کو حاصل ہوگا۔

۳ —— اگر آئین ہند کی کوئی مد ریاست جموں کشمیر پر مناسبت یا تبدیلی کے ساتھ لاگو کی گئی ہو تو ایسی مناسبت یا تبدیلی دفعہ ۳۷۰ کے تحت صدر کے ایک حکمنامے کے ذریعے تبدیل یا منسوخ کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہر منفرد تجویز کی افادیت پر غور کیا جائے گا۔ لیکن آئین ہند کی جو کلازیں پہلے ہی کسی مناسبت یا تبدیلی کے بغیر ریاست جموں کشمیر پر لاگو کی گئی ہیں اُن میں تبدیلی کی گنجائش نہیں۔

۴ —— ریاست جموں کشمیر کو اپنے خصوصی حالات کے مطابق فلاحی اقدامات، ثقافتی معاملات، سماجی تحفظ، پرسنل لا اور ضابطہ قوانین جیسے معاملات سے متعلق اپنے قانون وضع کرنے کی آزادی کی یقین دہانی

کے طور اس بات پر اتفاق کیا جاتا ہے کہ ریاستی حکومت کنکرنٹ لسٹ سے متعلق پارلیمنٹ کی طرف سے بنائے گئے یا ریاست پر ۱۹۵۳ء کے بعد لاگو کئے گئے قوانین کا از سر نو جائزہ لے سکتی ہے اور اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کر سکتی ہے کہ ان میں سے کن میں ترمیم یا منسوخی کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد آئین ہند کی دفعہ ۲۵۴ کے تحت صحیح اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی قانون سازی پر صدر کی منظوری کے سلسلے میں صدر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔ یہی طریقہ کار اس دفعہ کے کلاز شق (۲) کے تحت مستقبل میں پارلیمنٹ کی طرف سے بنائے گئے قوانین کے بارے میں بھی اپنایا جائے گا۔ ایسے کسی قانون کے ریاست پر لاگو کرنے کے بارے میں ریاستی حکومت سے مشورہ کیا جائے گا اور ریاستی حکومت کے خیالات پر پورا غور کیا جائے گا۔

۵ —— دفعہ ۳۶۸ کے تحت جو کچھ طے پایا گیا ہے۔ اس کے باہمی انتظام کے لئے ریاست پر لاگو شدہ اس دفعہ میں صدارتی حکمنامے کے تحت موزون تبدیلی کی جانی چاہیئے کہ ایسا کوئی قانون جو ریاست جموں کشمیر قانون سازیہ نے مندرجہ ذیل معاملات سے متعلق ریاست جموں کشمیر کے آئین کی کسی بھی شق میں تبدیلی لانے کی غرض سے بنایا ہو۔ اُس وقت تک مؤثر نہیں ہوگا جب تک وہ بل جسے صدر کی منظوری کے لئے محفوظ رکھا گیا ہو، صدر کی منظوری حاصل نہیں کرتا۔ یہ معاملات ہیں:-

(ا) گورنر کی تقرری، اختیارات، خدمات، فرائض، استحقاق اور استثنا۔

(ب) انتخابات سے متعلق مندرجہ ذیل معاملات جن کے نام ہیں:- ہند کے الیکشن کمیشن کی طرف سے انتخابات کی دیکھ بھال، ہدایت اور کنٹرول بلالحاظ امتیاز انتخابی فہرستوں میں اندراج کی اہلیت بالغ رائے دہی اور قانون ساز کونسل کی تشکیل۔ یہ معاملات ریاست جموں کشمیر کے آئین کی دفعات ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰ اور ۵۰ میں درج ہیں۔

۶ —— گورنر اور وزیر اعلیٰ کے ناموں پر کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا ہے۔ لہٰذا یہ معاملہ سربراہوں کے سپرد

کیا جاتا ہے۔

دستخط | دستخط
مرزا محمد افضل بیگ | جی۔ پارتھا سارتھی

نئی دہلی — بتاریخ ۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء

مناسب وقت پر غور کرنے کیلئے مخصوص کئے گئے معاملات

مندرجہ ذیل مخصوص سوالات مزید غور کرنے کیلئے الگ رکھے گئے

۱۔ ریاست کے آئین کے تحت گورنر کی تقرری پر ریاستی حکومت کے ساتھ تبادلۂ خیال کے لئے کیا قول و قرار ہونا چاہیئے؟

۲۔ کیا ریاست پر آل انڈیا سروسز سکیم کے اطلاق کی ترمیم میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے؟

دستخط | دستخط
مرزا محمد افضل بیگ | جی۔ پارتھا سارتھی
۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء | ۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء

۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء ہی کو مرزا محمد افضل بیگ نے مسٹر جی پارتھا سارتھی کو یہ باقاعدہ لکھ کر دیا—

کیمپ نئی دہلی

۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء

ڈیئر مسٹر جی پارتھا سارتھی

ہم نے آج دستاویز، جس میں وہ نقطے درج ہیں، جن پر ہمارے مابین سمجھوتہ ہوا ہے، پر دستخط

کئے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے درمیان مختلف امور پر مذاکرات کے دوران میں نے مندرجہ ذیل امور پر اپنی تجویزیں پیش کی تھیں:۔

i بنیادی حقوق سے متعلق دفعات ریاستی آئین میں شامل کی جائیں۔

ii ریاستی قانون سازیہ کے لئے انتخابات پر الیکشن کمیشن کی دیکھ بھال ہدایت اور دیکھ کنٹرول ہٹا دیا جائے۔

iii دفعہ ۳۵۶ میں یہ تبدیلی کی جائے کہ اسکے تحت جاری کئے جانے والے حکمنامے کے اجرائے قبل ریاست کی منظوری حاصل کرنا پڑے۔ یا پھر اسی قسم کا تحفظ فراہم کیا جائے۔

طویل مذاکرات کے بعد آپ نے ان تجاویز سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

بمہربانی جواب دیں

آپکا صادق

(دستخط) مرزا محمد افضل بیگ

ایکارڈ کی دستاویز پر دستخط ہو جانے کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے ۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء کو سرینگر سے وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کو ایک خط بھیجا۔ خط کا متن حسب ذیل ہے:

مجاہد منزل
سرینگر (کشمیر)

۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء

مائی ڈیئر اندرا جی

مرزا محمد افضل بیگ نے مجھے لکھا ہے کہ ان کے اور شری پارتھا سارتھی کے درمیان ریاست جموں کشمیر اور ہند یونین کے درمیان تعلقات کے سلسلے میں کئی امور پر تصفیہ ہو گیا ہے۔ ہماری تجویز پر ان کے مابین ان امور پر مفصل

بات چیت ہوئی ہے اور مجھے مسٹر بیگ کی طرف سے دستاویزات کی کاپیاں موصول ہوئی ہیں۔ جن میں وہ نقطے درج ہیں جن پر ان کے درمیان سمجھوتہ ہوا ہے اور وہ بھی جن پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا ہے۔

جن امور پر دونوں ایلچیوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا ہے، ان امور سے متعلق اپنا نقطہ نظر میں نے کئی مرتبہ آپ پر واضح کیا ہے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ آپ مہربانی ہمارے نقطہ نظر کے لئے گنجائش پیدا کریں گی تاکہ میں اصل مدعا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔

کچھ نقطوں پر تصفیہ ہونے کے لئے انہیں آپ کے اور میرے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب ہمارے درمیان ملاقات ہوگی، ہم اطمینان بخش طور پر ان نقطوں پر مفصل بات چیت کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ ایسا سمجھوتہ مرکز اور ریاست کے باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے کے لئے میرے اور ریاست کے لوگوں کو وسیع بنیادیں فراہم کرے گا۔

ہم کب ان امور پر بات چیت کر سکتے ہیں، میں آپ کے موزوں جواب کا منتظر ہوں۔

احترام سے بھرپور آداب کے ساتھ

آپ کا صادق

دستخط

ایس۔ ایم عبداللہ

شریمتی اندرا گاندھی
وزیر اعظم ہند، نئی دہلی

اس خط کے جواب میں وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے ۱۲ دسمبر ۱۹۷۴ء کو شیخ محمد عبداللہ کو مندرجہ ذیل خط لکھا:-

پرائم منسٹر ہاؤس
نئی دہلی
۱۲ دسمبر ۱۹۷۴ء

ڈیئر شیخ صاحب

مجھے آپ کا ۱۵ نومبر ۱۹۷۴ء کا خط ملا ہے۔ شری جی پارتھا سارتھی نے مجھے وہ دستاویزیں بھی دی ہیں، جو ان کے اور مرزا محمد افضل بیگ کے درمیان بات چیت کے نتیجے میں طے شدہ سمجھوتے پر تیار کی گئی ہیں۔

آپ نے ان امور کا ذکر کیا ہے، جن پر ہمارے نمائندوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا ہے آپ کو بخوبی علم ہے کہ یہ وہ بنیادی امور ہیں، جن پر ان کے درمیان مفصل بات چیت ہوئی ہے۔ اس بات چیت کے دوران بیگ صاحب نے آپ کے نظریات کو بخوبی پیش کیا ہے اور شاید ہی ہمارے درمیان ان امور پر دوبارہ بات چیت سے کوئی نتیجہ حاصل ہو سکے گا۔

تاہم جب ہم ملیں گے تو ہم ان امور پر غور کر سکتے ہیں، جو ہماری سوچ بچار کے لئے مخصوص رکھے گئے ہیں۔

شری جی پارتھا سارتھی نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ مجھے ریاستی آئین کے ان بنیادی خط و خال کی بابت لکھیں گے، جو نہ صرف ہم آہنگی کیلئے ضروری ہیں بلکہ ریاست میں حکومت کے جمہوری عمل کے بارے میں لوگوں کو اطمینان و اعتماد دلانے کی کارروائی کے لئے بھی۔

میں بے حد آرزو مند ہوں کہ ہم اپنے مذاکرات کو اختتام تک پہنچائیں۔ مجھے آپ کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ ہمارے درمیان سیاسی تعاون اس رشتے کو اور مضبوط بنائے گا، جو ریاست جموں کشمیر اور یونین کے درمیان پایا جاتا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں ان دنوں پارلیمنٹ میں بے حد مصروف ہوں - ہم ممکن ہے اس ماہ کے آخری ہفتے میں متفقہ طور پر مقرر کی گئی تاریخ کو مل سکیں گے -

آپ کے لئے اور بیگم صاحبہ کیلئے نیک خواہشات کے ساتھ

دستخط

اندرا گاندھی

۲۹ دسمبر ۱۹۷۴ء کو شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر سے مسز اندرا گاندھی کو ایک اور خط لکھا۔ شیخ صاحب کے اس خط کا متن درج ذیل ہے:

۱۔ مولانا آزاد روڈ
سرینگر (کشمیر)
۲۹-۱۲-۱۹۷۴ء

"خفیہ"

مائی ڈیئر اندرا جی

مجھے آپ کا ۱۲ دسمبر ۱۹۷۴ء کا خط موصول ہوا ہے

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے ساتھیوں کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ میں ایک بار پھر ریاست کے آئین کے ان بنیادی عوامل کی برقراری کے بارے میں لکھوں جو نہ صرف اہم آئینی ہیں بلکہ عوام کو ریاست میں حکومت کے جمہوری عمل کے بارے میں اطمینان دلانے کیلئے بھی ضروری ہیں - مجھے اس بات سے رنج ہوا ہے کہ جن قدروں کے لئے میں نے برسوں قربانیاں دیں اور مصائب برداشت کئے ان پر قائم رہنے کیلئے مجھ سے تحریری یقین دہانی طلب کی جائے - اس رویئے سے یہ بات واضح طور ثابت ہوتی ہے کہ مجھے مستقبل میں جن لوگوں سے واسطہ پڑے گا، ان کے ذہنوں میں ابھی تک شک و شبہات پائے جاتے ہیں - مجھے امید ہے کہ آپ کو مجھ سے اتفاق ہوگا کہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کے من مانے اقدام کی وجہ سے ہند کشمیر تعلقات کو جو زبردست زک پہنچی ہے

اس کا ازالہ ایک دوسرے پر مکمل اعتماد اور باہمی بھروسے سے ہی ہو سکتا ہے - اس اعتماد میں ذرا بھی کمی ہو تو کسی سمجھوتے تک پہنچنے کی ہماری تمام تر کوششیں رائیگاں ثابت ہوں گی -

برصغیر کی تقسیم کے بنیادی اصولوں کے مدنظر، ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں کشمیر پاکستان کے ساتھ شامل ہو جاتی لیکن کئی وجوہات کی بنا پر اس کے برعکس ہوا۔ ہندوستان کے بنیادی عقاید اور قدروں کے ساتھ ہماری یکجہتی کے سبب نیشنل کانفرنس کی قیادت نے مہاراجہ کی دستاویز الحاق کی حمایت کی۔ لیکن ہند کشمیر تعلقات پائیدار بنانے کے لئے نیشنل کانفرنس کے اس عمل کی ریاستی عوام کے تمام حلقوں سے حمایت حاصل کرنے کے لئے اقدامات کرنے کی ضرورت تھی۔ ریاست کی اقلیتوں نے بے شک اپنے آپ کو اس وقت محفوظ تصور کیا جب نیشنل کانفرنس کی قیادت نے ہندوستان کے ساتھ ریاست کا الحاق کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ان کی حمایت یقینی تھی لیکن مسلم اکثریت کا کیا حال تھا! ریاست کے مسلمان بیک وقت ہندوستان کی کل آبادی میں اقلیت میں تھے اور اپنی ریاست کے اندر اکثریت میں تھے۔ اس طرح ان کے تمام خدشات کہ ان پر کل ہند اکثریت غالب ہو جائے گی دور کئے جانے تھے اور انہیں اس بات کا یقین دلانا تھا کہ ریاست کے اندر بحیثیت اکثریت کے ان کے حقوق محفوظ رہیں گے۔ ان کے خدشات ریاست کی اندرونی خود مختاری کی ضمانت سے ہی دور کئے جا سکتے تھے۔ جیسا کہ دستاویز الحاق میں درج ہے۔ چنانچہ دونوں طرف کے لیڈروں کے درمیان مرکز۔ ریاست تعلقات کے بارے میں ایک سمجھوتہ ہوا۔ ان تعلقات کو بناتے وقت مسئلے کے تمام پہلو اور حالات کی خصوصیت کو زیر غور رکھا گیا اور آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ انہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اس طریقے کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی شک نہیں ہے۔ جس کے تحت حکومت ہند نے یکے بعد دیگرے آئین ہند کی خصوصی دفعہ میں تبدیلی کر کے تعلقات کی وہ بنیاد خطرے میں ڈال دی جسے برسوں کی تھکا دینے والی محنت اور خلوص کے ساتھ قائم کیا گیا تھا۔ یہ یاد کرتے ہوئے میں بڑا دکھ اور کرب محسوس کر رہا ہوں کہ ایک مرتبہ ہندوستان کے ایک سابق وزیر داخلہ نے برسر عام دفعہ ۳۷۰ کو ایک "ٹنل" قرار دیا جس کا مطلب واضح طور یہ تھا کہ اس کے ذریعے کشمیر کی داخلی خود مختاری ختم کی جائے گی اور حقیقت میں بڑی کوششوں کے

ساتھ ہی کچھ ہوا سب پیچھے دیکھیے جو اگست ۱۹۵۳ء کے بعد کیا گیا۔

حال ہی میں حکومتِ ہند کے ایک ذمہ دار عہدیدار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ہندوستان بنیادی حقوق کو ریاست کے آئین میں لاگو کر کے ریاست کے اقلیتی فرقے کو اکثریتی فرقے کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہندوستان کا اس بات کا طرزِ عمل اس مسلم اکثریت کا، جس نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی قیادت پر مکمل اعتماد کیا۔ اور اس بات کا کافی ثبوت فراہم کیا کہ وہ ضرورت پڑنے پر نازک اوقات میں اپنی زندگیوں کے عوض اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کر سکتی ہے ـــــ اعتماد اور بھروسہ مکمل طور نیست و نابود کر سکتا ہے تو ان سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔

۱۹۵۷ء، ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۲ء میں ریاستی اسمبلی یا پارلیمنٹ کے لئے انتخابات کے موقعوں پر مجھے اور محاذِ رائے شماری کے لیڈروں کو ایک مقصد کے تحت یا تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا یا پھر ریاست سے نکال دیا گیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ انتخابات کیا بڑے پیمانے کی دھاندلیوں کا بھی سہارا لیا گیا۔ ان حربوں کو صرف اس لئے آزمایا گیا تاکہ ایک مخصوص پسند کی اسمبلی اور حکومت کا قیام عمل میں لایا جاتا اور ایک مؤثر اپوزیشن کو راستے سے ہٹایا جاتا اور اس طرح دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنا آسان بن جاتا۔ یہ ایک سلسلہ ہے، جو پچھلے بیس برس سے چلا رہا ہے۔

اس تمام بے وفائی، مصائب اور سختیوں، جس کا ہم نے برسوں سے سامنا کیا ہے، کے باوجود میں نے آپ کی اس خواہش، جس کا آپ نے ۱۹۷۰ء میں اظہار کیا تھا کہ ہند کشمیر تعلقات کا از سر نو جائزہ لیا جائے، خیر مقدم کیا۔ میں نے آپ پر اور عوام پر کئی مرتبہ یہ بات واضح کی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ میرے اختلافات ریاست کے الحاق پر نہیں بلکہ الحاق کی مقدار پر ہیں۔ میں نے مہاراجہ کی دستاویزِ الحاق جس میں ریاست کی اندرونی خود مختاری کی ضمانت دی گئی ہے، کے تحت اپنی قسمت ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر دی۔ اگر یہ خود مختاری واپس لی جاتی ہے تو تعلقات کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں نے یہ رائے آپ کے سامنے رکھی کہ اگر آپ اس اعتماد اور یقین جو ریاست کی اکثریت کو ہندوستان پر تھا اور اب ختم ہو گیا ہے، کو دوبارہ بحال کرنے میں میری مدد کرنا چاہتی

تو میں صرف اسی نقطے سے شروع کروں گا، جو میں نے اگست ۱۹۵۳ء میں چھوڑا تھا۔ اگرچہ میرے لئے یہ پوزیشن حاصل کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں اور مجھے بہت سے ایسے ذہنوں کا سامنا کرنا پڑے گا، جو شکوک و شبہات سے بھرے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود میں ایک سعی کروں گا۔

آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ مسائل، جن پر ہمارے نمائندوں کے درمیان کوئی اتفاق نہیں ہو سکا ہے، اگرچہ بنیادی مسائل ہیں لیکن ہمارے درمیان ان امور پر دوبارہ تبادلہ خیال کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان پر پہلے ہی بھرپور غور کیا گیا ہے ـــــ اگر ان بنیادی مسائل پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا تو ان مسائل پر بات چیت کرنے سے کیا حاصل ہوگا، جو بنیادی نہیں ہیں؟ ہمارے لئے وہ مسائل جن پر سمجھوتہ نہیں ہو سکا ہے بھی برابر اہم اور بنیادی درجہ رکھتے ہیں اور جب تک ان پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو جاتا، میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے درمیان مذاکرات کو طوالت دینے سے کوئی مقصد پورا ہوگا۔

بیگم صاحبہ تسلیمات بھیجتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گی۔

آداب کے ساتھ

آپ کا صادق

(دستخط) شیخ محمد عبداللہ

۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء کو نثار احمد کے ہاتھ بھیجا گیا

شیخ محمد عبداللہ کے اس خط کا کوئی جواب ایکارڈ کی دستاویزات میں موجود نہیں۔ البتہ شیخ صاحب جب فروری ۱۹۷۵ء کے شروع میں نئی دہلی گئے تو انہوں نے ان تمام مسائل پر وزیرِ اعظم ہند سے بات چیت کی، جو بے نتیجہ رہی اور جس کے بعد نئی دہلی سے ہی ۱۱ فروری ۱۹۷۵ء کو شیخ صاحب نے

مسز گاندھی کو مندرجہ ذیل مراسلہ بھیجا:۔

۳۔ کوٹھا لین

نئی دہلی۔

۱۱ فروری ۱۹۷۵ء

مائی ڈیر وزیر اعظم

میں نے تصفیہ کی دستاویزات کا مضمون دیکھا ہے، جو شری جی۔ پارتھا سارتھی اور مرزا محمد افضل بیگ کے درمیان ان مختلف آئینی امور پر طے پایا ہے۔ جو ریاست جموں کشمیر اور ہندوستان یونین کے درمیان مرکز ریاستی تعلقات سے متعلق ہے۔ میں نے دستاویز کا مطالعہ کیا اور آپ کے ساتھ بھی تبادلہ خیال کیا۔ جیسا کہ آپ واقف ہیں، میری رائے میں مرکز اور ریاست جموں کشمیر کے درمیان آئینی تعلقات وہی ہونے چاہئیں، جو ۱۹۵۳ء میں تھے۔ تاہم مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ جن امور پر تصفیہ ہوا ہے، وہ سیاسی سطح پر اور مرکز ریاستی تعلقات کے سلسلے میں میرے تعاون کے لئے ایک اچھی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ مذاکرات کا اصلی مقصد دونوں طرف کی غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا تاکہ مرکز اور ریاست کے درمیان رشتے کو مزید مضبوط بنایا جائے اور ریاست کے لوگوں کی سماجی بہبود اور ترقیاتی اقدامات کے لئے راہ ہموار کی جائے۔

ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں کشمیر کے الحاق پر کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ہمارے مشترکہ عقائد کے پیش نظر میرا یہ پختہ یقین ہے کہ جموں کشمیر کا مستقبل ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ میرے سیاسی اور سرکاری سطح پر تعاون کے لئے آمادہ ہو جانے کا حقیقی مقصد ریاستی حکومت کے ریاست کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے اقدامات کو یقینی بنانا ہے۔ جسے کہ میں نے ہمیشہ اپنا مقدس فریضہ سمجھا ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ میرے اس جذبہ کی قدر کریں گی۔ ملک کی سالمیت اور ترقی کی حفاظت کے لئے ریاست جموں کشمیر کی طرف سے اپنا حصہ ادا کرنے

کو یقینی بنانے میں میری مستقل جدوجہد جاری رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یقین ہے کہ مرکزی حکومت ریاستی حکومت کی طرف سے ریاست کے ہندوستان کا ایک اٹوٹ حصہ ہونے کی حیثیت میں اسکے عوام کی مزید ترقی اور بہبود کیلئے اسکی طرف سے کئے گئے اقدامات کے سلسلے میں ریاستی حکومت کو اپنا بھرپور تعاون دے گی۔

ملک اس وقت ایک نازک دور سے گذر رہا ہے اور ہم سب جو جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کے اصولوں میں یقین رکھتے ہیں، کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ملک کی قیادت ہونے کی حیثیت میں آپکے ہاتھ مضبوط بنائیں اور میری طرف سے بھرپور دلی تعاون کے پیچھے یہی مقصد کارفرما ہے۔

آپ کا صادق

(دستخط) شیخ محمد عبداللہ

شیخ محمد عبداللہ کے اس مکتوب کے جواب میں وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے انہیں اگلے دن ۱۲ فروری ۱۹۷۵ء کو یہ خط بھیجا:

"رازدارانہ"

وزیر اعظم

نئی دہلی

۱۲ فروری ۱۹۷۵ء

ڈیر شیخ صاحب!

مجھے آپ کا خط حاصل کر کے خوشی محسوس ہوئی۔ جس میں آپ نے اس سمجھوتے کی منظوری دی ہے۔ جو مرزا محمد افضل بیگ اور شری جی۔ پارتھا سارتھی کے درمیان ریاست جموں کشمیر کے مرکز کے ساتھ تعلقات کے متعلق مختلف آئینی پہلوؤں پر ہوا ہے۔ اور جس میں آپ نے ریاست جموں کشمیر کے عوام کی بہبود کو مزید وسعت دینے کے لئے اپنی طرف سے سیاسی اور سرکاری سطح پر مکمل اور دلی تعاون دینے کا یقین دلایا ہے۔ میں ریاست

جموں کشمیر کے معاملے میں مرکز ریاستی تعلقات کے سلسلے میں آپ کے خیالات سے واقف ہوں۔ میں نے پہلے ہی آپ پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف نہیں لوٹائی جا سکتیں اور ہمیں موجودہ حالات کے حقائق کو مدِ نظر رکھنا ہے۔ میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں، جس کے تحت آپ نے متفقہ امور کے ضوابط پر اپنے اتفاقِ رائے کا اظہار کیا ہے۔

متفقہ امور کا جائزہ لیا گیا ہے اور میں اس پوزیشن میں ہوں کہ آپ کو مطلع کروں کہ ان پر انتظامی عملدرآمد کے لئے جو موزوں اور صحیح اقدام ضروری سمجھا جائے گا، کیا جائے گا۔ میں ریاست کے وزیرِ اعلیٰ کے ساتھ رابطہ قائم رکھے ہوئے ہوں اور آپ کے ساتھ سیاسی تعاون اور ریاست اور مرکز کے درمیان تعاون کے سلسلے میں جو مفاہمت ہوئی ہے، وہ اس سلسلے میں سیاسی تعاون دینے پر آمادہ ہیں۔

مرکزی حکومت بالخصوص ریاستی حکومت کی طرف سے ریاست کے لوگوں کی ترقی اور بہبود جو مرکزی حکومت کے لئے بھی برابر اہمیت رکھتی ہے، کے لئے کئے جانے والے اقدامات کے سلسلے میں ریاستی حکومت کو اپنا بھرپور تعاون دینے کے لئے آمادہ ہو گی۔

جیسا کہ آپ نے بھی اشارہ دیا ہے کہ اس وقت ملک نازک دور سے گزر رہا ہے اور یہ بات میرے لئے باعثِ اطمینان ہے کہ آپ جیسے مرتبے کا ایک شخص، جس نے ملک کی جدوجہدِ آزادی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کیا ہے، ملک کو مستحکم بنانے اور اس کے نظریات کو زندہ رکھنے کے لئے سامنے آ رہا ہے۔

آپ کی صادق

(دستخط) اندرا گاندھی

اس کے ٹھیک دو ہفتے بعد یعنی ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کو سید میر قاسم کی جگہ شیخ محمد عبداللہ کو جموں کشمیر کا وزیرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔

۲۱

محاذِ رائے شماری توڑ دیا گیا

جامع منزل میں محاذ رائے شماری کے کارکنوں کے ایک اجلاس میں محاذ کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھ دیا گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمان اور اُن کے تمام ساتھیوں اور عزیزوں کے قتل کے جانے کی خبر کشمیر میں بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنی گئی۔ اسی دوران کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان کشیدگی نے نئی دہلی کو مزید پریشان کر دیا اور شیخ محمد عبداللہ نے مسز اندرا گاندھی سے یہ اپیل کی کہ وہ یہاں کانگریس کو قائم رکھنے کی بجائے نیشنل کانفرنس ہی کو کانگریس کی ریاستی شاخ تسلیم کریں۔ لیکن مسز گاندھی نے شیخ محمد عبداللہ کی اس تجویز کو بڑی سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور اپنی پارٹی کے لیڈروں کو دہلی بلا کر یہ مشورہ دیا کہ وہ کشمیر میں کانگریس کو مضبوط بنائیں چنانچہ اس سلسلے میں کانگریس کی ریاستی شاخ کو دوبارہ منظم کیا گیا اور مفتی محمد سعید اس کے صدر بنائے گئے شیخ محمد عبداللہ نے اس کے خلاف معمولی اظہار ناراضگی کیا اُن کے ردعمل پر کشمیر کے گورنر کو فوراً دہلی بلایا گیا۔ جو ۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو واپس آئے۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو شیخ محمد عبداللہ نے لال چوک میں ایک جلسہ بلایا جس میں کانگریس پارٹی کی مخالفت کرتے ہوئے انہوں نے کہا "نئی دہلی کشمیریوں کی عزت سے کھیلنا چاہتی ہے لیکن ہم اپنی توہین برداشت نہیں کریں گے"۔ اس پر نئی دہلی کا مزاج کچھ مزید بگڑا چنانچہ اس کے اگلے دن ہی ہندوستان کی وزیر اعظم

نئی دہلی سے سری نگر آئیں اور یہاں شیخ محمد عبداللہ، اُن کے رفقاء اور نیشنل کانفرنس والوں نے اگرچہ اُن کا بڑا پُرجوش استقبال کیا لیکن اس کے باوجود ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ہندوستان کی وزیر اعظم نے سری نگر کے ایسپوریم گارڈن میں اپنی پارٹی کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا "یہ کشمیر کے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ وہ یہاں کانگریس کو رہنے دیں گے یا ختم کریں گے اگر کشمیر کے سارے لوگ بھی یہ چاہیں کہ یہاں کانگریس ختم ہو پھر بھی ایسا نہیں ہوگا۔ یہ کانگریس ہی تھی جس نے شیخ محمد عبداللہ سے سمجھوتہ کیا اور انہیں اقتدار بخشا۔ سید میر قاسم کو کوئی نہیں ہٹا سکتا تھا اور نہ ہمیں اس کی ضرورت تھی لیکن ہم نے یہ پسند نہیں کیا کہ کشمیر کے لیڈر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں اس لئے میر قاسم نے یہ پیش کش کی کہ اگر اُن کے اقتدار سے علیحدہ ہو جانے سے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے تعلقات مزید مضبوط ہوتے ہیں تو وہ یہ قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں چنانچہ انہوں نے یہ قربانی دیش کے لئے کی۔ ہمیں فخر ہے کہ کانگریس نے کشمیر کی بے شمار مشکلات پر قابو پایا ہے اور اُسے آئندہ بھی لوگوں کی خدمت کرنا ہے"۔ مسز گاندھی کی اس تقریر کے ریڈیو پر نشر اور اخبارات میں شائع ہونے پر نیشنل کانفرنس کے حلقوں میں شدید ردعمل ہوا لیکن خود شیخ صاحب نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور جب ۱۳ اکتوبر کو لوگوں کو معلوم ہوا کہ شیخ کشمیر مسز گاندھی سے ملنے گیسٹ ہاؤس گئے اور اُن کی یہ تجویز قبول کر لی کہ سید میر قاسم، مسٹر اوم مہتہ، مسٹر بیگ اور دیوی داس ٹھاکر پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے علاوہ ریاستی حکومت اور مرکز کے درمیان مختلف مسائل طے کیا کرے گی، تو کشمیری عوام کو بڑی مایوسی ہوئی اور پھر ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو شیخ صاحب نے لال چوک میں نیشنل کانفرنس کا پہلا پبلک جلسہ بلایا جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نئی دہلی یا ریاستی کانگریس سے محاذ آرائی نہیں چاہتے البتہ نیشنل کانفرنس کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ اس جلسہ میں وہ خود بھی نیشنل کانفرنس کے ممبر بن گئے اور بعد میں وہ اس پارٹی کے صدر بن گئے لیکن اُن کی نرم روی کے باوجود ریاستی کانگریس کے لیڈر اُن کی نکتہ چینی کرتے رہے اور جب دوبارہ دونوں پارٹیوں کے درمیان محاذ آرائی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تو شیخ محمد عبداللہ نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ کشمیر اسمبلی کے لئے نئے سرے سے انتخابات کروائے جائیں

لیکن نئی دہلی نے اُن کا یہ مطالبہ منظور نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی شیخ صاحب سے یہ کہا گیا کہ وہ کانگریس کو اپنی کابینہ میں مزید اور بھرپور نمائندگی دیں تاکہ کانگریس اقتدار میں باثر حصے دار کا رول ادا کر سکے۔ جنوری ۱۹۷۵ء کے پہلے ہفتے میں پردیش کانگریس کے صدر مفتی محمد سعید نے مجھے ایک ملاقات کے دوران بتایا: "اگر شیخ محمد عبداللہ نے ہمیں وزارت میں بھرپور نمائندگی دینے سے انکار کر دیا تو ہم اُن کے خلاف اسمبلی میں عدم اعتماد کر دیں گے۔" اس خبر کی اشاعت پر شیخ محمد عبداللہ نے جو نئی دہلی میں تھے سید میر قاسم کے ساتھ ملاقات کی اور اُن سے اس معاملے پر تبادلۂ خیال کیا لیکن سید میر قاسم نے انہیں یقین دلا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی البتہ اس کے ساتھ ہی خود سید میر قاسم کے علاوہ ریاستی کانگریس کے بعض دوسرے لیڈروں نے بھی یہ تحریک شروع کر دی کہ شیخ محمد عبداللہ ریاستی سیاست تک محدود رہنے کی بجائے ملک کے وسیع سیاسی دائرے میں جا کر کام کریں۔ چنانچہ شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی میں مسز گاندھی کے ساتھ ایک گھنٹے کی ملاقات کے دوران یہ یقین دہانی چاہی کہ انہیں اقتدار سے نہیں ہٹایا جا رہا ہے اور اس کے بعد وہ ایک کلچرل گروپ لیکر ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے دورے پر گئے ——

۱۰ فروری ۱۹۷۶ء کو ریاستی اسمبلی کے اجلاس میں شیخ محمد عبداللہ نے یہ تجویز پیش کی کہ سیاسی معاملات پانچ برس تک پس پشت ڈال دیئے جائیں اور ساری توجہ اقتصادی ترقی پر مرکوز کی جائے لیکن کانگریس ممبروں نے اُن کی اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس اجلاس میں ریاستی اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور ہندوارہ کے ایک نوجوان عبدالغنی لون کی قیادت میں کانگریسی ممبرانِ اسمبلی کا ایک گروپ جو دس افراد پر مشتمل تھا کانگریس سے الگ ہو گیا اس اقدام کو نئی دہلی نے ناپسند کیا اور وہاں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ شیخ محمد عبداللہ کانگریسی ممبرانِ اسمبلی کو توڑ کر اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں۔ ان معاملات پر براہِ راست شیخ محمد عبداللہ اور ریاستی کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے ہندوستان کی وزیرِ اعظم مسز گاندھی ۹ مارچ ۱۹۷۶ء کو جموں پہنچیں اور دو دن وہاں قیام کے دوران ریاست کے گورنر، اپنی پارٹی کے لیڈروں اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان تعلقات پر بات چیت کی۔ اس موقعے پر جموں میں پردیش کانگریس کا کنونشن

بھی طلب کیا گیا جس میں شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کی پالیسیوں کی کڑی نکتہ چینی کی گئی لیکن مسز گاندھی نے اپنی پارٹی کے لیڈروں کو ہدایت دی کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کے خلاف تب تک کوئی اقدام نہ کریں جب تک شیخ محمد عبداللہ اُن سے تعاون کرتے رہیں البتہ انہوں نے جموں کشمیر میں کانگریس کو متحرک کرنے اور اس کی سرگرمیاں تیز کرنے کے لئے کہا اور دوسری طرف شیخ محمد عبداللہ کو کہا گیا کہ وہ ریاستی کابینہ میں کانگریس کے بعض سرکردہ لیڈروں کو وزیر بنائیں۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۶ء کو شیخ محمد عبداللہ نے جموں میں نیشنل کانفرنس کا پہلا کنونشن بلایا جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اور اُن کی پارٹی نیشنل کانفرنس اس اجتماع کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہے جو سنہ ۱۹۵۳ء سے پہلے اس کا نصب العین تھا اور چونکہ اب نئی دہلی سے سمجھوتہ ہو چکا ہے اس لئے اب ریاست کی تعمیر و ترقی اس پارٹی کا واحد نصب العین ہوگا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں اعلان کیا گیا کہ شیخ محمد عبداللہ اور مسز گاندھی کے درمیان سمجھوتے سے کشمیر کا سیاسی مسئلہ حل ہو گیا ہے اور جموں کشمیر اور نئی دہلی کے درمیان تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے لیکن شیخ صاحب کے اس اعلان کے باوجود ریاستی کانگریس نے اُن کے خلاف سیاسی مہم جاری رکھی اور اقتدار میں بھرپور شرکت کے مطالبے پر اصرار کیا جانے لگا۔ اسی دوران ۱۰ جون ۱۹۷۶ء کو کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو مرکزی کابینہ میں شامل کر لیا گیا اور مرکز میں کشمیر کے ایک وزیر کی شمولیت کے مسئلے پر شیخ صاحب سے مشورہ تک نہیں کیا گیا جس کی بنا پر ریاستی کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ اس مسئلے پر بات چیت کے لئے کانگریس کے صدر سید میر قاسم کے ہمراہ ۱۵ جون ۱۹۷۶ء کو نئی دہلی سے سری نگر آئے اور یہاں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ طویل بات چیت کی لیکن اس بات چیت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد بعض مرکزی لیڈر جن میں سردار سورن سنگھ اور مسٹر اوم مہتہ بھی شامل تھے ریاستی کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان مفاہمت کروانے سری نگر آئے اور پھر ۱۶ جولائی کو اس مسئلے پر بات چیت کے لئے خود شیخ صاحب نئی دہلی گئے لیکن بات چیت کے دوران کچھ بھی طے نہ پا سکا۔ اس کے بعد ۲۶ جولائی کو مسز گاندھی نے مسٹر بروا

ساتھی کو سری نگر بھیجا اُنہوں نے سری نگر میں شیخ صاحب اور مسٹر بیگ کے ساتھ طویل بات چیت کی جس میں نیشنل کانفرنس کے لیڈر اس بات پر بضد رہے کہ ریاست میں بلدیاتی انتخابات کروائے جائیں گے اور ان انتخابات میں یہ پارٹی ریاستی کانگریس کے ساتھ اشتراک نہیں کرے گی۔

۲۰ اگست ۱۹۷۵ء کو ریاستی اسمبلی کے اُن دس کانگریسی ممبروں نے جو کانگریس سے الگ ہو گئے تھے نیشنل کانفرنس میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان سری نگر میں ایک پبلک اجتماع میں کیا گیا اور اس اجتماع میں وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے بھی شمولیت کی۔ شیخ صاحب کا یہ اقدام ریاستی کانگریس کے خلاف ایک سازش قرار دیا گیا اور اس پر نئی دہلی میں بھی کوئی اچھا ردِ عمل نہیں ہوا۔ ریاستی اسمبلی کے ان باغی کانگریسی ممبروں کی قیادت کانگریس کے ایک سابق وزیر تعلیم مسٹر عبدالغنی لون کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی شیخ صاحب نے ریاست کی میونسپل کمیٹیوں اور ٹاؤن ایریا کمیٹیوں کے انتخابات کروانے کے پروگرام کا اعلان کر دیا۔ یہ انتخابات اکتوبر میں کروانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے نیشنل کانفرنس نے تیاری شروع کر دی۔ پروگرام کے مطابق ۲۰ ستمبر کو کاغذات نامزدگی داخل کرنا تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کے نئی دہلی کے ساتھ سمجھوتا اور اقتدار سنبھالنے کے باوجود کشمیر میں سیاسی بے چینی اور مایوسی برابر بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ ۱۰ ستمبر کو اچانک انڈین ایر لائنز کا ایک طیارہ جو نئی دہلی سے جے پور کے لئے پرواز کر رہا تھا اغوا کر کے لاہور پہنچا دیا گیا۔ یہ طیارہ اُن کشمیری نوجوانوں نے ہائی جیک کیا تھا جو ہندوستان کے خلاف جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔ جو لوگ طیارے کو ہائی جیک کر کے لے گئے اُن کے نام محمد رفیق، غلام حسن راتھر، عبدالرشید شربانی، غلام نبی تیو، غلام رسول جام اور عبدالحمید دیوانی (گروپ لیڈر) تھے۔ اُن کا مقصد یہ طیارہ لیبیا یا سعودی عرب لے جانا تھا لیکن پائلٹ نے ایندھن نہ ہونے کا بہانہ بنایا جس پر اسے ہائی جیک کرنے والے اس خیال سے لاہور لے گئے کہ وہاں سے ایندھن مل جائے گا لیکن پاکستانی حکام نے یہ طیارہ ضبط کر لیا اور اسے ہائی جیک کرنے والوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور بعد میں اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔

اِدھر کشمیر میں بلدیاتی انتخابات کے لئے ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں کہ شیخ صاحب نے نئی دہلی اور ریاستی کانگریس کے دباؤ کے تحت ۱۴ ستمبر کو یہ انتخابات ملتوی کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی لیکن بعد میں ۱۳ اکتوبر کو ریاستی حکومت نے پھر باقاعدہ طور پر بلدیاتی انتخابات کروانے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا جس کے تحت اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں بلدیاتی انتخابات ہونا قرار پائے۔ اس پر آل انڈیا کانگریس کے صدر مسٹر بروا دس اکتوبر کو سری نگر آئے اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کی اور جب بات چیت کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکل سکا تو مسٹر بروا نے شیخ محمد عبداللہ کو نئی دہلی آنے کے لئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ریاستی کانگریس کے لیڈر بھی دلی بلائے گئے۔ شیخ صاحب ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو نئی دہلی پہنچے جہاں اُن کے اور کانگریسی لیڈروں کے درمیان پھر بات چیت ہوئی اور ہندوستان کی وزیر اعظم کے کہنے پر شیخ محمد عبداللہ اپنی کابینہ میں کانگریس کو بھرپور نمائندگی دینے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ ۱۸ اکتوبر کو واپس سری نگر آئے اور ۱۸ اکتوبر کو اپنی کابینہ میں توسیع کا اعلان کر دیا جس کے مطابق کانگریس کے مسٹر علی محمد نائیک، مسٹر عبدالغنی گونی، مسٹر منگت رام اور سردار رنگیل سنگھ کو کابینہ کے درجے کا وزیر بنایا گیا اور جو کانگریس کے ممبر اپنی پارٹی چھوڑ کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے تھے اُن میں سے عبدالغنی میر، محمد اشرف خان اور محمد شفیع کو بھی نائب وزیر بنایا گیا۔ ان ۳ افراد کو نائب وزیر بنانے پر ریاستی کانگریس ناراض ہو گئی اور اُنہوں نے ہندوستان کی وزیر اعظم سے اس کی شکایت کی۔ شیخ محمد عبداللہ جو کانگریس کی حمایت سے وزیر اعلیٰ بنے ہیں کانگریس چھوڑ کر جانے والے باغی ممبران اسمبلی کی حوصلہ افزائی کر کے ریاستی کانگریس کو کمزور بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نئی کابینہ کے حلف اُٹھانے سے پہلے ہی مسز گاندھی نے اپنے کانگریسی ممبروں کو حکم دیا کہ وہ وزارت میں شمولیت کا حلف نہ اُٹھائیں جس پر نیشنل کانفرنس کی قیادت سخت پریشان ہو گئی کیونکہ شیخ محمد عبداللہ وزیروں کے ناموں اور اُن کے قلمدان تک کا اعلان کر چکے تھے۔ حلف اُٹھانے کے لئے ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی تاریخ مقرر تھی چنانچہ وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے وزیر ٹھیک دس بجے

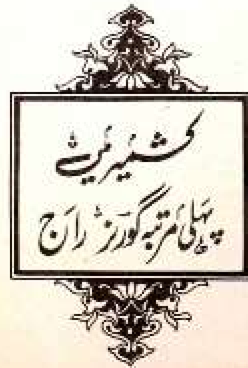
صبح گورنر ہاؤس پہنچے جہاں نئی کابینہ کو حلف اٹھانا تھا۔ وزیر اعلیٰ جب گورنر ہاؤس پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ کانگریسی لیڈروں کو جنہوں نے وزیر بنایا ہے انہوں نے حلف اٹھانے کی تقریب کا بائیکاٹ کر دیا ہے اور وہ حلف اٹھانے نہیں آتے ہیں۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے گورنر سے کہا کہ وہ فی الحال نیشنل کانفرنس کے وزیروں کو ہی حلف دلوائیں لیکن ان کی یہ تجویز بار آور نہیں ہو سکی اس کے برعکس گورنر نے انہیں یہ ترغیب دلائی کہ شیخ صاحب نے اپنی وزارت اعلیٰ کی کرسی برقرار رکھنے کے لئے مان لیا کہ حلف اٹھانے کی رسم منسوخ کر دی جائے اور اس مقصد کے لئے گورنر ہاؤس میں جو تقریب ہو رہی ہے اس میں شیخ صاحب خود اس بات کا اعلان کریں اور نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کو برقرار رکھنے کے لئے کانگریس کی طرف سے پیش کی گئی شرائط کو قبول کرنے کا بھی اعلان کریں۔ چنانچہ اس تقریب میں جو مقررہ وقت سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد شروع ہوئی شیخ محمد عبداللہ گورنر کے ساتھ وارد ہوئے۔ گورنر صاحب کے چہرے سے اطمینان ٹپک رہا تھا اور شیخ صاحب نہایت اترے ہوئے چہرے اور متورم لہجے میں ایک پرچہ اٹھا کر ایک تحریری بیان پڑھ کر سنایا جس میں انہوں نے کہا کہ گورنر کے مشورے پر حلف اٹھانے کی یہ تقریب منسوخ کی جا رہی ہے اور میری حکومت نے بلدیاتی انتخابات کروانے کا جو پروگرام مشتہر کر رکھا ہے۔ کانگریس کے ساتھ مفاہمت کو برقرار رکھنے کے لئے اسے بھی منسوخ کیا جا رہا ہے۔ شیخ صاحب کے اس ڈرامائی اور غیر متوقع اعلان پر مرزا محمد افضل بیگ نے جو کابینہ میں وزیر مال تھے اخباری نمائندوں کے قریب آ کر کہا کہ "تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشا نہ ہوا"۔ اصل میں بیگ صاحب کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ خواجہ غلام محمد شاہ اور بیگ صاحب کے ایک کٹر مخالف غلام نبی کوچک کو بھی کابینہ کے درجے کا وزیر بنایا جائے۔ اس لئے جب وزارت میں توسیع کا معاملہ ٹھپ ہو گیا تو اس پر سب سے زیادہ بیگ صاحب کو خوشی ہوئی۔

اس کے اگلے دن یعنی ۱۰ اکتوبر کو وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان کی وزیر اعظم مسز گاندھی کو سری نگر سے زعفران کے پھولوں کا ایک گلدستہ اور دیوالی پر مبارکباد کا پیغام بھیجا اور پھر ۲ نومبر کو مسٹر بیگ

دہلی بھیجے گئے تاکہ وہ نئی دہلی کو یقین دلائیں کہ نیشنل کانفرنس کی قیادت ہندوستان کی پوری طرح وفادار ہے مسٹر بیگ نے نئی دہلی میں مسز گاندھی کو یہ بھی یقین دلایا کہ ہندوستان کی وزیر اعظم آئین میں جو تبدیلیاں لا رہی ہیں نیشنل کانفرنس ان کی مکمل حمایت کرے گی حالانکہ ان تبدیلیوں کی بنا پر ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۷۰ اور اس کے تحت جموں کشمیر کو دی گئی مراعات اور اختیارات بالکل ختم ہو جاتے۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت اب پوری طرح بے بس ہو چکی تھی اور بے بسی کے اس عالم میں عوام کی توجہ تعمیراتی کاموں کی طرف لگانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن عوام میں نیشنل کانفرنس کے خلاف غم و غصہ اور نکتہ چینی برابر پھیلتی جا رہی تھی، کیونکہ نیشنل کانفرنس کی حکومت نئی دہلی کے ہر ارشاد اور ہر ہدایت کے تابع ہو کر رہ گئی تھی اور اسے اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں اندرا گاندھی کے خلاف اندر ہی اندر جو لاوا پک رہا ہے وہ کسی بھی وقت پھوٹ سکتا ہے اور وہاں ایمرجنسی کے نفاذ سے لوگوں کی جو آواز دبائی گئی ہے وہ ہمیشہ کے لئے نہیں دب سکتی۔



۲۲



پاکستان میں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو جونہی یہ اعلان کیا کہ پاکستان میں پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کی مقررہ میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی ۷ مارچ کو عام انتخابات کرائے جائیں گے تو اس کا ہندوستانی رائے عامہ میں عجیب و غریب ردعمل ہوا کیونکہ مسز گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کر کے ہندوستانی عوام کے تمام تر جمہوری حقوق سلب کر رکھے تھے۔ ان نئے سیاسی رجحانات جو ہندوستان میں نظر آ رہے تھے کو محسوس کئے بغیر نیشنل کانفرنس کی قیادت ہندوستانی وزیر اعظم کی خوشنودی حاصل کرنے اور ریاستی کانگریس کے ساتھ اختلافات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی چنانچہ وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو جموں سے نئی دہلی گئے اور وہاں بات چیت کے بعد کلکتہ کے دورے پر گئے کہ اسی دوران ۱۸ جنوری ۱۹۷۷ء کی شام کو ہندوستان کی وزیر اعظم مسز گاندھی نے اپنے ایک اچانک اور ڈرامائی ریڈیو براڈکاسٹ میں ہندوستانی پارلیمنٹ کو توڑنے اور اس کے لئے مارچ میں انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی تمام اپوزیشن لیڈروں کو رہا کرنے اور اخبارات پر سے سنسر شپ ہٹانے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے لئے انتخابات کے اعلان

کے ساتھ ہی جموں کشمیر کے کانگریسی لیڈروں نے ریاستی اسمبلی کے لئے بھی ابھی کے ساتھ انتخابات کرانے کا مطالبہ کر دیا اور جونہی اس مطالبے کی اطلاع شیخ محمد عبداللہ کو ملی۔ وہ مغربی بنگال کا اپنا دورہ منسوخ کر کے فوراً ہی دہلی لوٹ آئے۔ اور ۲ یا یکم فروری ۱۹۷۷ء کو ہندوستان کی وزیراعظم، کانگریس کے صدر، مرکزی وزیر [illegible] سید میر قاسم اور مرکزی وزیر مسٹر اوم مہتہ کے ساتھ انتخابات کے مسئلے پر بات چیت کی۔ نئی دہلی میں ہونے کے باوجود شیخ محمد عبداللہ نے ہوا کے بدلتے ہوئے رخ کا اندازہ نہیں کیا۔ وہ نئی دہلی میں ہی تھے کہ کانگریس کے ایک سرکردہ لیڈر مسٹر جگ جیون رام نے مرکزی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت اپوزیشن سے جا ملے۔ شیخ محمد عبداللہ کے مشورے پر ہندوستان کی وزیراعظم نے جموں کشمیر کانگریس پارٹی کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا کہ پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ جموں کشمیر اسمبلی کے انتخابات بھی کرائے جائیں۔ اسمبلی کی برقراری کا اطمینان حاصل کرنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ نئی دہلی سے جموں آ گئے جہاں انہوں نے ۱۳ فروری ۱۹۷۷ء کو ایک پریس کانفرنس میں یہ انکشاف کیا کہ ان کے اور ہندوستان کی وزیراعظم کے درمیان پارلیمانی انتخابات کے لئے سیٹوں کی تقسیم پر سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ اور اس کے مطابق ریاستی کانگریس اور نیشنل کانفرنس میں انتخابی مقابلہ نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان کی اپوزیشن پارٹیوں کو خبردار کیا کہ وہ کشمیر سے الگ رہیں۔ کیونکہ کشمیر میں کسی قسم کا داخلی بحران برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اور مسز گاندھی کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ جموں کشمیر میں ضلع بارہمولہ، ضلع سرینگر اور ضلع جموں کے لئے نیشنل کانفرنس اپنے امیدوار اور ضلع اودھم پور، ضلع اسلام آباد اور ضلع لداخ کے لئے کانگریس اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق سرینگر سے بیگم شیخ محمد عبداللہ کو، ضلع بارہمولہ سے عبدالاحد وکیل اور ضلع جموں سے برج پوری کو نیشنل کانفرنس نے کھڑا کیا اور اس کے ساتھ ہی ضلع جموں، ضلع اسلام آباد اور لداخ میں کانگریسی امیدواروں کی کامیابی کے لئے تعاون کا یقین بھی دلایا گیا۔ انتخابی میدان میں بھی اس سودے بازی پر کشمیری عوام ناخوش تھے اور انہوں نے اس کا بہت برا منایا۔ اس کا ایک اندازہ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو اس وقت ہوا جب پارلیمنٹ کے لئے پارٹی کی امیدوار بیگم شیخ محمد عبداللہ جموں سے بذریعہ طیارہ سرینگر پہنچیں اور عوام نے ان کے استقبال کے پروگرام میں بڑی سرد مہری دکھائی۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت اس بات کی زبردست خواہاں تھی کہ اول تو [illegible] کی دونوں پارلیمانی نشستیں بلا مقابلہ حاصل کی جائیں۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم سرینگر کی سیٹ بلا مقابلہ حاصل کی جائے۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ اور سرینگر سے [illegible] کانفرنس کا ایک کانگریسی ممبر

مولوی افتخار حسین انصاری اور بارہمولہ سے جماعت اسلامی کے سید علی گیلانی جو اس وقت جیل میں تھے مقابلے میں رہ گئے اور نیشنل کانفرنس کی طرف سے خوف و دہشت کی فضا پیدا کرنے کی کوششوں کے باوجود انتخابی میدان گرم ہو گیا اور انتخابی میدان میں جب نیشنل کانفرنس کی طرف سے ریاست کے لینڈ گرانٹ ایکٹ میں ترمیم کا ایک موضوع بحث بنا تو نیشنل کانفرنس کے لیڈر پریشان ہو گئے۔ یاد رہے کہ لینڈ گرانٹ ایکٹ ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۹۲۷ء میں نافذ کیا تھا۔ جس کے تحت جموں کشمیر میں کوئی غیر ریاستی باشندہ زمین نہیں خرید سکتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس ایکٹ میں وقتاً فوقتاً ترمیموں کے ذریعے غیر ریاستی باشندوں کو یہ اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ وہ جموں کشمیر میں پٹے پر دس برس کے لئے زمین حاصل کر سکتے تھے اور اب شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں بنائی گئی حکومت نے لینڈ گرانٹ ایکٹ میں ایک ایسی ترمیم کر دی تھی جس کے مطابق کسی غیر ریاستی باشندے کمپنی یا ادارے کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا کہ وہ اس ریاست میں ایک سو برس تک کے لئے زمین یا جائیداد وغیرہ پٹے پر حاصل کر سکتا۔ لینڈ گرانٹ ایکٹ کا بل جب اسمبلی میں پیش کیا گیا تو اس کے بعض ممبروں کے شدید اعتراضات کے بعد اسے ایک سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کیا گیا تھا۔ انتخابی میدان میں عوام کی طرف سے مخالفت کی اطلاعات موصول ہوتے ہی وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ یکم مارچ کو سرینگر آ گئے۔ اور یہاں شیر کشمیر پارک میں اپنی پارٹی کے انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اپنے خلاف کنبہ پروری، جائیداد بنانے اور لینڈ گرانٹس ایکٹ میں ترمیم کرنے کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ بیگم شیخ محمد عبداللہ کو ووٹ دیں۔ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں سے سوال کیا کہ وہ شیخ صاحب کے خلاف ان الزام تراشیوں کو کس طرح برداشت کرتے ہیں؟ وزیر اعلیٰ کی اس تقریر کے فوراً بعد سرینگر کے مختلف حصوں میں عوام کے درمیان کشیدگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وزیر اعلیٰ نے ضلع سرینگر اور ضلع بارہمولہ میں نیشنل کانفرنس کے کئی انتخابی جلسوں سے خطاب کیا۔ شہر کے بیشتر حصوں میں صورت حال بگڑ چکی تھی جس کی بنا پر بعض علاقوں میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تو مخالف امیدوار کے لئے انتخابی جلسے کرنا ناممکن بنا دیا گیا۔ اس الیکشن میں بھی برسراقتدار پارٹی نے انتخابی مشینری کے ساتھ مل کر بڑے پیمانے پر دھاندلیاں کیں اور تشدد کے ایسے واقعات رونما ہوئے جن پر عوام کو بڑی مایوسی ہوئی۔ سرینگر اور بارہمولہ میں کئی مقامات پر برسراقتدار پارٹی اور اس کے مخالفوں میں تصادم بھی ہوئے اور پولیس اور سرکاری مشینری نے نیشنل کانفرنس کے مخالفوں کو ہر طرح سے ہراساں کیا۔

جبکہ ضلع اسلام آباد میں جہاں نیشنل کانفرنس کا امیدوار ضمیں تھا نہایت امن و سکون اور آزادی کے ساتھ الیکشن لڑ رہا تھا۔ انتخابات میں ضلع بارہمولہ اور ضلع سری نگر میں برسرِ اقتدار پارٹی کے ممبر جیت گئے لیکن جموں میں اس پارٹی کا امیدوار بُری طرح شکست کھا گیا۔ اسلام آباد اور ضلع ادھم پور کے انتخابی حلقوں سے اگرچہ کانگریسی امیدوار کامیاب ہو گئے۔ لیکن ہندوستان میں انتخابی نتائج انقلاب انگیز ثابت ہوئے کیونکہ مسز اندرا گاندھی نہ صرف خود اپنا انتخاب ہار گئیں بلکہ کانگریس کے بڑے بڑے ستون گر گئے اور اُسے پورے تیس برس کے بعد ہندوستانی عوام نے اقتدار سے بے دخل کر دیا اور ہندوستان کی عنانِ اقتدار مسٹر مرارجی ڈیسائی اور جنتا پارٹی کے ہاتھ میں چلی گئی۔

ہندوستان میں اس انقلابی تبدیلی سے کشمیر کی سیاست بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔ اُن ہی دنوں جموں میں ریاستی اسمبلی کا بجٹ اجلاس بھی ہو رہا تھا۔ ریاستی کانگریس کے لیڈروں نے نئے حالات میں شیخ محمد عبداللہ کی حمایت ترک کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء کو جب وزیر خزانہ مسٹر ٹھاکر نے اسمبلی میں نئے مالی سال کا بجٹ پیش کیا تو کانگریس کی طرف سے اس میں رکاوٹ ڈالی گئی اور ایک تحریکِ التوا پیش کی گئی۔ اس غیر یقینی صورتِ حال میں اسمبلی کا اجلاس اگلے دن تک ملتوی ہو گیا۔ چنانچہ جب وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کو یہ اطلاع ملی کہ کانگریس پارٹی جس کی ایوان میں غالب اکثریت تھی۔ شیخ صاحب کے خلاف عدمِ اعتماد کرنا چاہتی ہے تو وہ دوسرے دن یعنی ۲۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو گورنر سے ملے۔ اور اس کے فوراً بعد ایک ولولہ انگیز انداز میں وزیر اعلیٰ اور گورنر نئی دہلی جا پہنچے۔ دوسرے دن کانگریس کے لیڈر بھی نئی دہلی گئے۔ اور وہاں مسز گاندھی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جموں کشمیر میں کانگریس پارٹی کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سے ہٹا دے اور اُن کی جگہ ریاستی کانگریس پارٹی کے صدر مفتی محمد سعید کو وزیر اعلیٰ بنایا جائے۔ شیخ صاحب نے نئی دہلی میں مسز گاندھی کے علاوہ ہندوستان کے نئے وزیر اعظم مسٹر ڈیسائی سے بھی ملاقات کی اور کشمیر کے گورنر نے بھی ساری سیاسی صورتِ حال سے نئے وزیر اعظم کو آگاہ کر دیا۔ مسٹر مرارجی ڈیسائی نے کسی قسم کی مداخلت کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو کچھ بھی کیا جائے آئین کے مطابق اور جمہوری طریقے پر کیا جائے۔ نئی دہلی میں قیام کے دوران ہی شیخ محمد عبداللہ نے گورنر کو یہ مراسلہ بھیجا کہ وہ کشمیر کی موجودہ اسمبلی کو توڑ کر ریاست میں گورنر راج نافذ کریں۔ گورنر نے اس معاملے پر مسٹر ڈیسائی سے صلاح مشورہ کیا اور مسٹر ڈیسائی نے اُن کو ہدایت دی کہ وہ واپس جا کر آئین کے مطابق اپنے فرائض انجام دیں۔

چنانچہ گورنر ۲۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو واپس جموں پہنچے۔ کانگریس کے لیڈر بھی اُسی روز واپس جموں آ گئے اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء کو کانگریس لیجسلیچر پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں شیخ محمد عبداللہ کی جگہ مفتی محمد سعید کو پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی سے واپسی کے قبل ایک اخباری بیان میں یہ اعلان کیا کہ "چونکہ کانگریس پارٹی نے مجھے دیا ہوا اعتماد واپس لے لیا ہے۔ اس لئے وہ ایکارڈ جو میرے اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان ہوا تھا ختم سمجھا جانا چاہیے۔" ان کی واپس جموں میں آمد کے تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے گورنر سے ملاقات کی اور گورنر نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ وزیر اعلیٰ کے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں۔ ۲۶ مارچ شام کو گورنر نے ٹیلی فون پر ہندوستان کے وزیر اعظم کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور اُنہیں اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا جو کانگریس اسمبلی پارٹی جس کی ایوان میں غالب اکثریت تھی کے اس فیصلے سے کہ شیخ محمد عبداللہ کی جگہ مفتی محمد سعید کو وزارت سازی کی دعوت دی جائے سے پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم نے گورنر کو مشورہ دیا کہ وہ آئینی بحران کی بنا پر اسمبلی توڑ دیں۔ اور حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں۔ چنانچہ گورنر نے ۲۷ مارچ کو ریاستی اسمبلی توڑ دی۔ اور گورنر راج نافذ کر دیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا جبکہ کشمیر میں گورنر راج نافذ کیا گیا۔ گورنر نے حکومت کا انتظام سنبھالنے کے فوراً بعد ریاست کے چیف سیکرٹری مسٹر پیر جی کو اپنا مشیر مقرر کیا۔ کانگریس پارٹی نے گورنر راج نافذ کرنے پر زبردست احتجاج اور گورنر راج نافذ کرنے کو ایک غیر آئینی اقدام قرار دیا۔ اُدھر سری نگر میں چونکہ وسیع پیمانے پر "شیر بکرا" فسادات ہو رہے تھے، اس لئے وادی میں گورنر راج کے نفاذ کا مجموعی طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ کیونکہ شیخ صاحب کی حکومت کا خاتمہ ہونے کے اعلان کے ساتھ ہی سری نگر اور دوسرے علاقوں میں اُس کشیدگی اور تناؤ کا کافی حد تک خاتمہ ہو گیا جو نیشنل کانفرنس اور اس کے مخالفوں کے درمیان ہو رہا تھا۔ نیشنل کانفرنس نے شیخ صاحب کی حکومت ختم ہونے پر جب شہر میں ہڑتال کرانے کی کوشش کی تو لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس شہر میں کئی جلوس نکالے گئے۔ جس میں وزارت کے خاتمے اور گورنر راج کے نفاذ کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے دو دن بعد یعنی ۲۹ مارچ کو شیخ محمد عبداللہ دہلی گئے۔ جہاں اُنہوں نے وزیر اعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی، ہندوستان کے وزیر داخلہ مسٹر چرن سنگھ، جنتا پارٹی کے دوسرے لیڈروں سے گفت و شنید کی۔ اس گفت و شنید کے دوران اُنہوں نے نیشنل کانفرنس کے دونوں ممبران پارلیمنٹ، بیگم عبداللہ اور عبدالاحد وکیل نے یہ بیان

دلوایا کہ نیشنل کانفرنس جنتا پارٹی کی پالیسیوں اور پروگرام کی مکمل حمایت کرتی ہے۔ بعد میں اس بات چیت میں مسٹر بیگ بھی شامل ہو گئے۔

۲ اپریل ۱۹۷۷ء کو خواجہ غلام محی الدین قرہ نے اعلان کیا کہ انہیں مسٹر جے پرکاش نارائن کا ایک پیغام موصول ہوا ہے جس پر وہ جنتا پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔ اس اعلان کی اطلاع ملتے ہی شیخ محمد عبداللہ دہلی سے بمبئی گئے اور وہاں مسٹر جے پرکاش نارائن سے ملاقات کی اور اگلے دن وہاں سے واپس دہلی آ گئے۔ اور وہاں ۴ اپریل ۱۹۷۷ء کو ہندوستان کے نئے وزیر اعظم مسٹر ڈیسائی کے ساتھ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک بات چیت کی۔ مسٹر بیگ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس ملاقات کے دوران مسٹر ڈیسائی نے نیشنل کانفرنس کو جنتا پارٹی میں ضم کرنے کے لئے کہا لیکن شیخ صاحب اور مسٹر بیگ نے انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جموں کشمیر میں انتخابات کے بعد بھی وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ یہ بات چیت کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی اور شیخ محمد عبداللہ دہلی سے واپس جموں آ گئے جبکہ مسٹر بیگ سیدھے سرینگر واپس آ گئے۔ شیخ محمد عبداللہ جموں سے براستہ بانہال سرینگر آئے اور یہاں نیشنل کانفرنس نے ان کا استقبال کیا۔ جب وہ لال چوک پہنچے تو یہاں انہوں نے ایک پبلک جلسے سے خطاب کیا اور کہا: "جنتا پارٹی میں اگرچہ میرے کئی دوست ہیں لیکن میں کشمیر کی تقدیر جنتا پارٹی کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتا۔"

۷ اپریل ۱۹۷۷ء کو جنتا پارٹی کے دو لیڈر مسٹر اٹل بہاری واجپئی اور مسٹر جارج فرنانڈیز سرینگر آئے۔ ۸ اپریل ۱۹۷۷ء کو بعض شہریوں نے ان کے اعزاز میں سرینگر کے براڈوے ہوٹل میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی۔ اس استقبالیہ تقریب میں بعض سرکردہ شہریوں کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ، مسٹر بیگ اور جنتا پارٹی کا قرب حاصل کرنے والے دوسرے کئی سیاسی لیڈر بھی مشترکہ طور پر موجود تھے۔ مسٹر واجپائی جو ہندوستان کے وزیر خارجہ بن چکے تھے اور ان کے رفقاء نے ریاستی اسمبلی کے آنے والے انتخابات کے معاملے پر شیخ صاحب سمیت دوسرے تمام لیڈروں سے طویل بات چیت کی اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ شیخ محمد عبداللہ کشمیری عوام میں اب اس قدر مقبول نہیں ہیں جس قدر وہ دو برس قبل تھے۔ اور صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ جموں ڈویژن میں، جہاں کے ممبران اسمبلی کی تعداد ۳۲ تھی، شیخ محمد عبداللہ کی نیشنل کانفرنس ایک نشست بھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ ان کا یہ اندازہ کسی حد تک درست بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے

نیشنل کانفرنس کے تمام تر مخالفوں کو یکجا کر کے کشمیر میں اپنی پارٹی کی شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ یہ تمام عناصر مل کر ریاستی اسمبلی کی وادی کی ۴۲ نشستوں میں سے زیادہ سے زیادہ نشستیں بھی حاصل کر لیں تو یہاں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ وادی کے مختلف خیال کے سیاسی لیڈروں کو جنتا پارٹی میں لا کر ان کی سربراہی کے لئے ان کی نگاہیں مولانا محمد سعید مسعودی پر پڑیں۔ —— مولانا مسعودی کئی برس سے عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر گاندربل میں مقیم تھے اور عوام میں ان کے متعلق یہ تاثر تھا کہ وہ بڑے مخلص، بے لوث اور بے غرض سیاسی مدبر ہیں۔ جو حالات سے بددل ہو کر فقیرانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ عوامی اور سیاسی حلقوں میں ان کے خیالات اور ان کی بے غرضی کی وجہ سے ان کو عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو بظاہر ایک بیزار شخص اور عملی سیاست سے بالاتر انسان جتلاتے تھے۔ اسی دوران ہندوستان میں سیاسی انقلاب برپا کرنے والی سب سے اہم شخصیت مسٹر جے پرکاش نارائن نے بھی اپنے ایک بیان میں جموں کشمیر میں جنتا پارٹی قائم کرنے کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ جب مسٹر واجپائی اور ان کے رفقاء جموں کشمیر میں جنتا پارٹی کے قیام کے بارے میں بات چیت کرنے مولانا مسعودی کے پاس گاندربل گئے تو انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں مولانا مسعودی کو اپنے شیشے میں اتار لیا۔ خود مولانا مسعودی بھی گردوپیش کے حالات سے متاثر ہو کر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ نیشنل کانفرنس کے مخالفوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے سے ایک ایسی سیاسی قوت پیدا کی جا سکتی ہے جو وادی میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کی پارٹی نیشنل کانفرنس کا موثر طور پر مقابلہ کر سکے گی۔ نہایت تجربہ کار اور بظاہر ایک سیاسی مدبر ہونے کے باوجود مولانا مسعودی اس بات کو قطعی طور پر نظرانداز کر گئے کہ بارہ برس کی طویل مدت تک برسر اقتدار رہنے، لگاتار کروڑوں سیاسی رشوتوں اور بے شمار مراعات دینے کے باوجود کانگریس کشمیری عوام میں قابل قبول نہیں ہو سکی۔ اور جب نئی دہلی کے لیڈروں کے ایما پر یہاں جنتا پارٹی بنانے کی بات عوام میں پھیلی تو انہوں نے کانگریس ہی کی طرح جنتا پارٹی کی درآمد کو بھی پسند نہیں کیا۔ خاص طور پر وادی کے عوام، شہریوں اور دیہاتیوں میں یکساں طور پر یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ جنتا پارٹی جن سنگھ اور اسی قسم کی دوسری انتہا پسند جماعتوں کا مجموعہ ہے۔ اسی دوران خواجہ غلام محی الدین قرہ جنہوں نے از خود یہاں جنتا پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا تھا نئی دہلی اور بمبئی کا چکر لگا کر جنتا پارٹی کے لیڈروں اور مسٹر جے پرکاش نارائن سے بات چیت کی۔

انہوں نے بستر سے پرکاش تارا مین کو ان کو بھیجا گیا۔ ایک مراسلہ بھی اخبارات میں شائع کردیا جس میں مسٹر بے پرکاش نرائن نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جموں کشمیر میں جنتا پارٹی کا قیام کشمیر اور ملک کے دوسرے حصوں کے درمیان سیاسی اور انتظامی خلیج کو پاٹ کر کشمیر کو ملک کے زیادہ قریب لائے گا۔



آئین ہند کا

آرٹیکل ۳۷۰

ریاست جموں کشمیر سے متعلق عارضی دفعات

ا۔ اس آئین میں کسی اور بات کے تعلق کے بغیر :۔

(ا) آرٹیکل ۲۳۸ کا اطلاق ریاست جموں کشمیر پر نہیں ہوگا۔

(ب) مذکورہ ریاست کے لئے پارلیمنٹ کا قوانین بنانے کا اختیار مندرجہ ذیل تک محدود ہوگا :۔

(ا) یونین لسٹ اور کنکرنٹ لسٹ میں شامل معاملات ' جو ریاستی حکومت کے مشورے سے صدر جمہوریہ کی طرف سے ' ہندیونین کے ساتھ ریاست کے الحاق سے متعلق دستاویز الحاق میں درج اُن معاملات کے مطابق قرار دیئے جائیں جن کے بارے میں قومی قانون ساز نے ریاست کیلئے قوانین بنانے کا حق ہے ' اور

(ii) مذکورہ لسٹوں میں درج وہ دوسرے معاملات جو ریاستی حکومت کے اتفاق رائے سے صدر جمہوریہ قرار دیں

وضاحت — اس دفعہ کے لئے حکومت جموں کشمیر اس شخص سے مطلب ہے جو وقتی طور کے لئے صدر جمہوریہ کی طرف سے ' مہاراجہ کے ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کے فرمان کے تحت وقتی طور کیلئے مقرر کی گئی وزیروں کی کونسل کے مشورے کے تحت کام چلانے والا مہاراجہ کشمیر تسلیم کیا گیا۔

(ج) آرٹیکل (ا) اور اس آرٹیکل کی دفعات ریاست پر لاگو ہوں گی۔

(د) اس آئین کی دوسری دفعات صدر جمہوریہ کی طرف سے جاری کئے گئے احکامات کے مطابق ترمیموں اور استثنٰی کے تحت ریاست پر لاگو ہوں گے۔

بشرطیکہ ایسا کوئی حکم جو سب کلاز (ب) کے پیراگراف (ا) میں مذکورہ دستاویز الحاق میں درج معاملات سے تعلق رکھتا ہو' جاری نہ کیا جائے بجز ریاستی حکومت کے مشورے کے تحت جاری کیا جائے۔

۲۔ ریاست کا آئین مرتب کرنے کے لئے قانون ساز اسمبلی میں اگر کلاز (۱) کی سب کلاز (ب) کے پیراگراف (۱)، یا اس کلاز کی سب کلاز (د) کی دوسری مد میں مذکورہ ریاستی حکومت کی آمادگی ظاہر کی جائے تو یہ اس اسمبلی میں فیصلہ لئے جانے کے لئے پیش کی جانی چاہئے۔

۳۔ اس آرٹیکل کی ایسی دفعات جن کا اب تک ذکر ہو چکا ہے، میں سے کسی کا لحاظ کئے بغیر صدر جمہوریہ ایک عام فرمان کے ذریعے قرار دے سکتا ہے کہ یہ آرٹیکل (دفعہ ۳۷۰) زیر عمل نہیں رہا یا پھر صدر جمہوریہ کی طرف سے قرار دی گئی استثناؤں اور ترمیموں کے تحت اور اس کی طرف سے مقررہ تاریخ سے زیر عمل ہوگا۔

لیکن صدر کی طرف سے ایسا کوئی فرمان جاری کئے جانے سے قبل کلاز (۲) میں مذکورہ ریاست کی قانون ساز اسمبلی کی سفارش حاصل کرنا ضروری ہوگا۔



(۲۳)

کون ہارا کون جیتا؟

اس کے بعد جنتا پارٹی کے مسٹر اشوک مہتہ ، نانا جی دیش مکھ اور مہاشے پرتاپ سنگھ جموں کشمیر کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کشمیر آئے ۔ کشمیر میں سیاسی صورت حال بڑی عجیب و غریب تھی ۔ شیخ محمد عبداللہ کے پرانے اور نئے سیاسی حریف ایک ایک کر کے جنتا پارٹی میں جا رہے تھے ۔ ان میں پنڈت پریم ناتھ بزاز خاص طور پر قابل ذکر تھے بزاز صاحب اگرچہ حالیہ برسوں میں کشمیر پیوپلز کنونشن کے سلسلے میں شیخ محمد عبداللہ کے قریب نظر آتے رہے لیکن بعد میں بعض ذاتی وجوہات کی بنا پر بزاز صاحب شیخ محمد عبداللہ سے ناراض ہو گئے ۔ جنتا پارٹی کے لیڈر جو کشمیر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے آئے ، شیخ صاحب کے ہاں کھانے پر مدعو کئے گئے ۔ اس موقع پر جنتا پارٹی اور نیشنل کانفرنس کے درمیان اشتراک و تعاون کے موضوع پر بات چیت ہوئی ۔ اس کے اگلے دن جب میں نے مرزا محمد افضل بیگ کی قیام گاہ پر ان سے ملاقات کی تو بیگ صاحب ایک عجیب قسم کی سیاسی کشمکش اور تذبذب میں مبتلا تھے ۔ انہوں نے مجھے بتایا : "میں مارچ میں ہی وزارت سے مستعفی ہو جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے شیخ محمد عبداللہ کی بیشتر پالیسیوں سے

اختلاف رہا ہے ۔" اس سلسلے میں انہوں نے دو باتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ۔ ایک شیخ محمد عبداللہ کے خلاف کنبہ پروری کے الزامات اور دوسری پارلیمانی انتخابات میں دھاندلیاں ۔ جنتا پارٹی کے تینوں لیڈر جو سرینگر میں تھے مرزا بیگ سے دو تین بار الگ الگ ملے ۔ انہوں نے گاندربل جا کر مولانا مسعودی کے ساتھ بھی دو بار ملاقات کی ۔ یہ بات چیت ۱۹ اپریل تک جاری رہی ۔ اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۷ء کو جنتا پارٹی کے لیڈروں نے سرینگر میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ یہاں کمیٹی ممبران پر مشتمل جنتا پارٹی کا یونٹ بنا دیا گیا ہے ۔ جس کے کنوینر مولانا محمد سعید مسعودی بنائے گئے ہیں ۔ جنتا پارٹی کے لیڈروں کی سرینگر سے واپسی پر انہوں نے نئی دہلی میں اخبارات کو جو بیان دیئے ۔ ان کی بنا پر کشمیری عوام میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ جنتا پارٹی جموں کشمیر کی مخصوص پوزیشن جو اسے آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت حاصل ہے ، برقرار رکھنے کے حق میں نہیں ۔ اس سے پہلے کشمیری سیاست یا عوام کے دل و دماغ میں آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی لیکن کشمیر ایکارڈ اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے کشمیر میں سیاسی سوچ کو کچھ تبدیل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی سیاسی حلقوں میں آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کی تاویلیں اور اس کی تشریح توڑ مروڑ کر پیش کی جانے لگی اور یہ عام خیال ہو گیا کہ کشمیر کی ایک علیحدہ اور انفرادی حیثیت اسی دفعہ کی وجہ سے قائم ہے اور اگر آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کو ختم کر دیا گیا تو اس کے نتیجے میں غیر ریاستی باشندوں کو جموں کشمیر میں زمین جائیداد وغیرہ خریدنے کا حق حاصل ہو جائے گا حالانکہ حقیقت میں آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ سے ان ساری باتوں کا کوئی تعلق نہیں تھا ۔ چنانچہ سیاسی صورت حال تبدیل ہونا شروع ہو گئی ۔ اور جنتا پارٹی کو غیر پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ۔ مولوی محمد فاروق کی عوامی ایکشن کمیٹی اور جماعت اسلامی وغیرہ کسی اصول یا مقصد کے لئے نہیں بلکہ محض شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی پوزیشن کو کمزور بنانے کے لئے جنتا پارٹی کی حمایت پر اتر آئیں ۔ حالانکہ عوامی ایکشن کمیٹی اس وقت تک کشمیر کے لئے استصواب رائے اور حق خودارادیت کا مطالبہ کرتی چلی آئی تھی ۔ دوسری طرف جنتا پارٹی کے مرکزی لیڈر جو پارلیمنٹ کے انتخابات کے نتیجے میں اچانک نئی دہلی میں برسر اقتدار آ گئے تھے کشمیر کی سیاست ، اس کے اتار اور چڑھاؤ ، اس کے منظر اور پس منظر اس کے سیاسی مزاج اور اس کی سیاسی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے ۔ انہوں نے جن لوگوں کو اپنی پارٹی کی ریاستی شاخ کی مرکزی کمیٹی کا ممبر نامزد کیا ۔ وہ عوام کے لئے بالکل ناقابل قبول تھے ۔ ان کی سیاسی ساکھ اور وقعت نہ ہونے کے برابر تھی ۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان سب میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی ۔ خیالات نظریات اور کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر ان کو جنتا پارٹی

میں شامل ہو جانا ایک مضحکہ خیز سی بات نظر آتی تھی۔ اور ان میں سے بیشتر محض اس لئے اس پارٹی میں شامل ہو گئے تھے کہ نئی دہلی میں چونکہ اس پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ اس لئے انہیں یہ یقین تھا کہ پچھلی بیس سالہ روایات کے مطابق اس مرتبہ بھی انتخابات میں وہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ جنہیں نئی دہلی کی پشت پناہی حاصل ہوگی۔ خود ریاستی کانگریس کو بھی انتخابات میں اپنی کامیابی کا چونکہ بالکل کوئی یقین نہ تھا۔ اس لئے ریاستی کانگریس نے نیشنل کانفرنس کے ساتھ انتخابی اتحاد اور سیٹوں کی تقسیم کے لئے مذاکرات شروع کئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سید میر قاسم نے شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کے ساتھ کئی ملاقاتیں کیں۔ لیکن ان دونوں پارٹیوں کے درمیان انتخابی اتحاد کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ انتخابی معاملات میں جوڑ توڑ اور سرگرمیوں کے دوران سرینگر میں یوتھ فیڈریشن کے نام سے نوجوانوں جن میں زیادہ تر شیخ صاحب کے حامی شامل تھے کی ایک نئی جماعت ڈرامائی انداز میں ابھر آئی۔ عوام میں یہ خیال تقویت پکڑ رہا تھا کہ نئی مرکزی حکومت بھی کشمیر میں آزادانہ اور صاف ستھرے انتخابات نہیں ہونے دے گی۔ چنانچہ جب ۴ مئی ۱۹۷۷ء کو بمبئی کے ایک پارسی افسر سارا دالا کو گورنر کا دوسرا مشیر مقرر کیا گیا تو اس کا بھی لوگوں میں یہی تاثر پیدا ہوا کہ یہ سب انتخابات میں دھاندلیاں کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ یوتھ فیڈریشن کے نوجوانوں نے سرینگر میں "شیر بکرا" تقسیم کا جھگڑا ابھی پھر زندہ کر لیا اور اس طرح پرانی اور آپسی دشمنی، رقابتیں اور عداوت فساد کا باعث بن گئی۔ وادی میں صورت حال اگرچہ بڑی حد تک مخدوش تھی۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے مخالف عوام کو اپنی طرف کسی طرح بھی متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، اور نہ ان میں اس قدر صلاحیت موجود تھی۔ کہ وہ ذاتی مفادات اور کامیابی کے لئے کوشش کرنے کی بجائے تنظیم اور اتحاد کی کوشش کرتے۔

۱۰ مئی ۱۹۷۷ء کو شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر سے اسلام آباد جا کر نیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا "جنتا پارٹی اور اس کی مرکزی حکومت کشمیر کی انفرادیت ریاست کے آئین اور ہندوستان کے آئین کی دفعہ ۳۷۰ جس کے تحت کشمیر کو داخلی خود مختاری حاصل ہے، ختم کر کے اس ریاست کو ہندوستان کے ساتھ ضم کرنا چاہتی ہیں اور اس کا اظہار مسٹر جے پرکاش نرائن کے اس خط سے بھی ہوتا ہے۔ جو انہوں نے خواجہ غلام محی الدین قرہ کو لکھا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ کشمیر اور ہندوستان کے درمیان اب تک جو خلیج موجود ہے، وہ پاٹ دی جانی چاہئے اور کشمیر نے اب

اپنا جو علیحدہ وجود برقرار رکھا ہے۔ وہ باقی نہیں رہنا چاہئے۔ اس سے ہندوستانی لیڈروں کے عزائم واضح ہو جاتے ہیں جے پرکاش نرائن اگرچہ میرے دوست ہیں۔ لیکن میں انہیں یا کسی اور کو یہ ہرگز اجازت نہیں دوں گا کہ وہ کشمیر کو ہندوستان میں ضم کریں یا اس کی خصوصی حیثیت ختم کر دیں۔ ہم ایسی کوششوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ نیشنل کانفرنس کی تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے عوام کو اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا حق دلوائے۔ میں لوگوں سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا جن لوگوں کے نام ابھی ذہن میں آتے ہیں ان کی تعداد میں قابل اعتبار ہیں اور میں اور مرزا محمد افضل بیگ ناقابل اعتبار؟ مولانا مسعودی اور جنتا پارٹی میں شامل کچھ دوسرے لوگ ۱۹۵۳ء کے خونیں واقعات میں ملوث تھے۔ بخشی غلام محمد، اور غلام محمد صادق تو انتقال کر چکے ہیں۔ لیکن مولانا مسعودی ابھی زندہ ہے اور وہ اب بھی ۱۹۵۳ء کے عزائم کو عمل میں لانے کے پیچھے ہے۔ دستاویز الحاق کی رو سے ہم نے صرف تین امور مرکز کو دیتے ہیں۔ یعنی دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسائل۔ دیگر تمام معاملات میں کشمیر بالکل خود مختار رکھا گیا تھا۔ اور اس کی خود مختاری کی ضمانت دفعہ ۳۷۰ میں دی گئی۔ جنتا پارٹی اس خصوصی پوزیشن کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اسلئے انہوں نے یہ تجویز کی تھی کہ نیشنل کانفرنس کو جنتا پارٹی میں ضم کیا جائے۔" اسی جلسے میں مرزا بیگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا "کشمیر میں جو انتخابات ہونے والے ہیں۔ وہ ایک قسم کی رائے شماری ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ کس کو ووٹ دیتے ہیں۔"

۲۳ مئی ۱۹۷۷ء کو مجاہد منزل میں نیشنل کانفرنس کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے کہا "اگر ہم ہندوستان میں عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتے تو ہم اس سے علیحدہ ہو جانے میں پس و پیش نہیں کریں گے۔" "کشمیر سے باہر کا کوئی شخص ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ اور نیشنل کانفرنس نے ہر دور میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ باہر کا کوئی بھی ملک یا طاقت یہاں کے لوگوں کی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے ساتھ ہم صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے محکموں میں تعلق قائم رکھ سکتے ہیں۔ اور باقی تمام معاملوں میں ہم خود مختار رہنا چاہتے ہیں۔ دفعہ ۳۷۰ میں اگر کوئی تبدیلی لائی گئی تو ہندوستان کے ساتھ الحاق کی ساری بنیاد ہل کر رہ جائے گی۔ ہمیں اقتدار کی کوئی خواہش نہیں البتہ اقتدار اُن مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے جن کے لئے ہم جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ جنتا پارٹی اور کانگریس ہندوستان سے مکمل الحاق کی حامی ہیں۔ لیکن ہم اپنا الگ وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ آنے والے

انتخابات کشمیر کی تقدیر کا فیصلہ کریں گے۔"

۲۲ مئی ۱۹۷۷ء کو چیف الیکشن کمشنر نے جموں کشمیر کیلئے انتخابی پروگرام کا اعلان کر دیا اور ریاستی آئین کی رُو سے گورنر سے کہا گیا کہ وہ اس بارے میں باقاعدہ ایک نوٹیفکیشن جاری کریں۔ اس پروگرام کے مطابق ۳ جولائی ۷ جولائی اور ۹ جولائی ۱۹۷۷ء ووٹ ڈالنے کی تاریخیں مقرر کی گئیں اور اس کے ساتھ ہی ساری ریاست میں انتخابی محاذ گرم ہوگیا۔ ریاستی جنتا پارٹی، مولوی فاروق اور جماعت اسلامی کو اگرچہ اس بات کا احساس ہوا تھا کہ نیشنل کانفرنس عوام کی توجہ کا مرکز بن رہی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے باہمی اتحاد اور ایک دوسرے سے تعاون کی بجائے صرف اس بات پر تکیہ رکھا کہ ہم دہلی کی امداد و اعانت سے الیکشن میں کامیابی حاصل کر لیں گے۔ جنتا پارٹی کے سربراہ مولانا مسعودی نے مولوی محمد فاروق کو اپنے ساتھ ملایا حالانکہ مولوی فاروق سرینگر میں ایک مخصوص اور محدود حلقے میں اپنے اثر و رسوخ کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ مولوی فاروق کے جنتا پارٹی سے میل ملاپ کی بنا پر نیشنل کانفرنس کچھ زیادہ طاقت پکڑ گئی جیسا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کیلئے ۲۸ مئی ۱۹۷۷ء کو مجاہد منزل میں نیشنل کانفرنس کا جو انتخابی جلسہ ہوا اس میں مرزا افضل بیگ اور دوسرے لیڈروں نے اعلان کیا کہ نیشنل کانفرنس کا اولین مقصد کشمیر کے لئے مکمل داخلی خودمختاری حاصل کرنا ہے اور اگر نیشنل کانفرنس کو ریاستی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوگئی تو ہم مرکز کی تحویل میں امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے تین محکمے رکھیں گے جیسا کہ ۱۹۴۷ء کی دستاویز الحاق میں درج ہے۔ اس کے سوا کشمیری اپنے معاملات کے خود مالک رہیں گے۔"

کشمیر میں ہر روز کوئی نہ کوئی سیاسی واقعہ رونما ہو رہا تھا۔ ۲۰ مئی ۱۹۷۷ء کو اسی طرح کا ایک واقعہ رونما ہوا جبکہ شیخ صاحب کے ایک پرانے ساتھی صوفی محمد اکبر نے اچانک سیاسی طور پر سرگرم ہو کر محاذ آزادی کے نام سے ایک نئی پارٹی قائم کی اور اعلان کیا کہ یہ پارٹی کشمیری عوام کیلئے حق خودارادیت کی بنیاد پر کشمیر کا مسئلہ حل کرانے کی جدوجہد کرے گی۔ اس نئی پارٹی کا قیام اور صوفی صاحب کا اعلان بھی شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے مخالفوں کیلئے نقصان دہ اور شیخ صاحب اور نیشنل کانفرنس کیلئے مفید ثابت ہوا کیونکہ صوفی صاحب شیخ صاحب کے ایک معتمد ترین ساتھی تھے۔ اس نئی تنظیم کے اس اقدام کا نیشنل کانفرنس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ۳۰ مئی ۱۹۷۷ء کو انتخابات کیلئے جو باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کیا گیا اس کے مطابق ۳ جولائی کو ضلع بارہمولہ اور ضلع سرینگر اور ۷ جولائی کو ضلع اسلام آباد کے انتخابی حلقوں میں ووٹ

ڈالنے کی تاریخیں مقرر کر دی گئیں۔ ۹ جون ۱۹۷۷ء کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ اسی دن شام کو الیکشن کمیشن کے ایک نمائندے نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ریاست جموں کشمیر کی ۷۶ انتخابی سیٹوں کیلئے چھ سو سے زیادہ امیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کئے ہیں۔ اس کے اگلے دن کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال کے بعد سرکاری طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ تمام کے تمام امیدواروں کے کاغذات نامزدگی درست قرار دیئے گئے ہیں اور کسی ایک امیدوار کے کاغذات نامزدگی بھی مسترد نہیں ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا جبکہ کشمیر میں ریاست کی قانون ساز اسمبلی کیلئے انتخابات میں عوام نے حصہ لیا کیونکہ ریاست میں گورنر راج تھا۔ نہ نیشنل کانفرنس کی وزارت تھی اور نہ کانگریس کی وزارت تھی۔ اس لئے کاغذات نامزدگی مسترد کروانا کسی حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا اور چونکہ کوئی سیاسی جماعت برسر اقتدار نہیں تھی۔ اس لئے مقابلہ کرنے والوں اور ووٹروں کو مکمل آزادی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک ریاستی اسمبلی کے انتخابات جب بھی کرائے گئے وہ سب کے سب غیر جمہوری اور یکطرفہ نوعیت کے تھے اور ان میں جمہوریت اور انتخابات کے طور طریقوں، عدل و انصاف اور ووٹر کے حق کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف برسراقتدار پارٹی کامیابی حاصل کر لیا کرتی تھی۔ گورنر راج میں ہر امیدوار کو آزادی تھی ووٹر کو آزادی بھی، اخبارات کو آزادی تھی اور ساری سیاسی پارٹیوں کو یکساں طور پر آزادی حاصل تھی لیکن اس کے باوجود سرینگر شہر کا اختلافات کی وجہ سے جھڑپوں، مار دھاڑ اور خوف و دہشت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ انتخابی تصادم سوپور اور اسلام آباد میں بھی ہوئے لیکن سرینگر میں حالات زیادہ بدتر تھے۔ انتخابات کے نام پر ہمسایہ ہمسائے کا جانی دشمن بن گیا۔ سیاسی مخالفوں کو ڈرانے، دھمکانے، مارنے پیٹنے اور لوٹنے کی وارداتیں عام ہو گئیں۔ اور کسی ایک پارٹی کے حامیوں کا کسی دوسری پارٹی کے حامیوں کے علاقے میں جانا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ اسی دوران ۱۱ جون کو اچانک شہر میں یہ خبر پھیلی کہ شیخ صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ اور جب دو ایک مقامی اخبارات میں اُن کی علالت کی خبر چھپ گئی تو یہ خبر تشویش کا باعث بن گئی۔ لوگ جوق در جوق اور بڑی تعداد میں شیخ صاحب کی قیام گاہ پر اکٹھے ہو گئے۔ عوام میں پھیلی ہوئی تشویش کو کم کرنے کیلئے جب میں نے "آفتاب" میں یہ خبر شائع کی کہ "شیخ صاحب کی صحت کچھ بہتر ہو رہی ہے" تو شیخ محمد عبداللہ کے خصوصی معالج ڈاکٹر ریحان صاحب نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا "آفتاب" کی یہ خبر صحیح نہیں کیونکہ شیخ صاحب

کی حالت حد درجہ تشویشناک ہے۔ ڈاکٹر کی اطلاع پر گورنر مسٹر ایل کے جہا اُن کے مشیر مسٹر بیرجی اور دوسرے
اعلیٰ حکام اور سرکردہ نیشنل کانفرنس کے لیڈر شیخ صاحب کی قیام گاہ پر گئے۔ ڈاکٹر کے مشورے پر گورنر نے نئی دہلی کو
یہ تشویشناک اطلاع دی چنانچہ مرکزی وزیرِ داخلہ مسٹر چرن سنگھ نے امراضِ قلب کے دو ممتاز ڈاکٹروں کو فوری طور
پر سرینگر بھیجا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر گورنر نے بیگم شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے فرزند ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو جو ضلع ڈوڈہ
کے انتخابی دورے پر تھے، ہیلی کاپٹر کے ذریعے فوراً سرینگر لانے کا انتظام کیا۔ ہندوستان کے وزیرِ اعظم جو اُس وقت
لندن میں تھے اور وزیرِ خارجہ مسٹر واجپائی کے علاوہ سابق وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے بھی شیخ صاحب کی تشویشناک
حالت پر ہمدردی کے پیغامات بھیجے۔ جو ریڈیو پر نشر ہوئے اور اخبارات میں چھپے۔ اس سے شیخ صاحب کی صحت کے
بارے میں تشویش اور زیادہ پھیل گئی۔ شیخ صاحب کی صحت کے لئے مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں اور عام شاہراہوں پر نذر و
نیاز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب میں شیخ صاحب کی مزاج پرسی کے لئے اُن کی قیام گاہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے اُن کی
قیام گاہ کے اندر داخل ہونے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ نئی دہلی سے جو دو بڑے ڈاکٹر شیخ صاحب کا معائنہ کرنے سرینگر آئے
تھے، وہ اُن کا معائنہ کرنے کے بعد دوسرے ہی دن بذریعہ طیارہ چپکے سے واپس چلے گئے۔ ۱۲ جون ۱۹۷۷ء کو میں خود
ڈاکٹر جان صاحب کی قیام گاہ پر گیا تاکہ شیخ صاحب کی صحت کے بارے میں اچھی طرح کچھ معلوم کر سکوں۔ تو ڈاکٹر صاحب اپنے
ڈرائنگ روم میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے نہایت رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا "شیخ صاحب کی طبیعت حد درجہ
خراب ہے اور اُن کی زندگی خطرے سے باہر نہیں"۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا "اگر وہ کسی طرح سے بچ بھی گئے، پھر بھی آپ
کوئی سیاسی ذمہ داری نہیں سنبھال سکیں گے۔" اسی دن شام کو آل انڈیا ریڈیو کی خبروں کے بلیٹن میں یہ خبر نشر ہوئی کہ ۔۔
"شیخ محمد عبداللہ کی حالت نازک ہے اور اُن کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اُن کی زندگی خطرے سے باہر نہیں۔"

۱۸ جون ۱۹۷۷ء کو ہندوستان کے مرکزی وزیرِ داخلہ مسٹر چرن سنگھ سرینگر آئے یہاں پہنچ کر انہوں
نے گورنر اور اعلیٰ سرکاری حکام اور جنتا پارٹی کے لیڈروں سے بات چیت کی۔ انہوں نے سرینگر کے پولو گراؤنڈ میں جو شیخ صاحب
کی قیام گاہ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے ایک انتخابی جلسے سے بھی خطاب کیا۔ مسٹر چرن سنگھ نے اپنی تقریر میں شیخ محمد عبداللہ
کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ صرف جنتا پارٹی کو ووٹ دیں۔ انہوں نے اپنی رہائش گاہ پر سرکاری مشینری

کو بھی ہدایات دیں کہ وہ جنتا پارٹی کی کامیابی کے لئے پارٹی کی مدد کریں۔ اُن کی پولو گراؤنڈ میں کی گئی تقریر کا قدرتی طور پر عوام
کی طرف سے ردِ عمل ہوا۔ مسٹر چرن سنگھ اپنے قیام سرینگر کے دوران شیخ صاحب کی مزاج پرسی کے لئے نہیں گئے۔ اس کے
دو دن بعد ۲۱ جون کو ہندوستان کے وزیرِ دفاع مسٹر جگجیون رام سرینگر آئے اور پولو گراؤنڈ میں ایک انتخابی جلسے سے
خطاب کیا۔ انہوں نے بھی شیخ محمد عبداللہ کی علالت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ شیخ محمد عبداللہ بوڑھے اور بیمار ہیں اس
لئے انہیں سیاست سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ حالانکہ خود مسٹر جگجیون رام شیخ صاحب سے زیادہ بوڑھے تھے جنتا
پارٹی کے لیڈروں کی ان تقریروں سے وہ لوگ بھی جنہیں جنتا پارٹی کے ساتھ کسی نہ کسی وجہ سے ہمدردی تھی۔ اس پارٹی سے
بیزار ہو گئے اور پھر جب مرکزی وزیرِ اعلیٰ کی ہدایات کے مطابق مقامی سرکاری ایڈمنسٹریشن میں بڑے پیمانے پر افسروں اور
اہلکاروں کا تغیر و تبدل عمل میں لایا گیا تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ جنتا پارٹی کی مرکزی حکومت بھی کشمیریوں کو اپنی مرضی کے
مطابق ووٹ دے کر اپنے نمائندے منتخب کرنے کے حق سے محروم کرنا اور زور زبردستی اور دھاندلیوں سے انتخابات جیتنا چاہتی
ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرینگر اور وادی کے دوسرے علاقوں میں نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ بھی شروع ہو گئی۔

۲۵ جون ۱۹۷۷ء کو ہندوستان کے وزیرِ اعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی بھی کشمیر آئے۔ اور یہاں جنتا پارٹی کے
پانچ چھ انتخابی جلسوں سے خطاب کیا۔ اُن کے سرینگر میں قیام کے دوران گورنر نے اُن کے اعزاز میں رات کے کھانے کی
دعوت دی۔ اس دعوت میں جنتا پارٹی کے لیڈروں اور مولوی محمد فاروق کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مولوی فاروق نے
وزیرِ اعظم مسٹر ڈیسائی کو اپنے ہاں میر واعظ منزل پر آنے کی دعوت دی۔ جو مسٹر ڈیسائی نے قبول کر لی۔ اس کے اگلے دن سرینگر
کے پولو گراؤنڈ میں ایک انتخابی جلسے میں مسٹر مرارجی ڈیسائی نے تقریر کرتے ہوئے نیشنل کانفرنس اور شیخ محمد عبداللہ کی کڑی نکتہ
چینی کی۔ مسٹر ڈیسائی بھی سرینگر میں اپنے قیام کے دوران شیخ صاحب کی مزاج پرسی کے لئے نہیں گئے۔ البتہ اسی شام جس دن
دوپہر کو انہوں نے پولو گراؤنڈ کے جلسے سے خطاب کیا تھا مسٹر مرارجی ڈیسائی میر واعظ منزل گئے۔ میر واعظ منزل کی تاریخ اور میر واعظ
خاندان کی سیاست میں یہ پہلا موقعہ تھا جبکہ ہندوستان کا وزیرِ اعظم یا کوئی سرکردہ سیاسی لیڈر وہاں گیا۔ وادی میں یہ بات عام طور پر پھیل
گئی تھی کہ شیخ صاحب بسترِ علالت پر ہیں اور انتخابی معرکے میں جنتا پارٹی، کانگریس اور جماعتِ اسلامی کے لیڈر اپنی تقریروں
میں بار بار شیخ صاحب کو نکتہ چینی کا ہدف بنا رہے تھے۔ اور اس ساری کارروائی کا ردِ عمل یہ ہو رہا تھا کہ نیشنل کانفرنس کی

سیاسی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وزیر اعظم مسٹر مرار جی ڈیسائی نے انتخابی جلسوں سے فراغت کے بعد اور دہلی روانہ ہونے سے پہلے گورنر ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا۔ اگرچہ ابھی انتخابات نہیں ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود اپنی اس پریس کانفرنس میں مسٹر ڈیسائی نے بڑے اعتماد کے ساتھ اعلان کیا ——— "کشمیر میں انتخابات کے بعد تاریخ میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اور جنتا پارٹی کی حکومت سابق حکومت کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرے گی" ——— ایک اخباری نمائندے کے اس سوال پر کہ اگر انتخابات میں نیشنل کانفرنس کامیاب ہو گئی تو پھر تحقیقاتی کمیشن کون قائم کرے گا؟ ——— مسٹر ڈیسائی نے کہا ——— "نیشنل کانفرنس کی حکومت قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" مسٹر ڈیسائی نے اخباری نمائندوں کے سوالات کے جواب میں یہ بھی کہا کہ ——— "رائے شماری کا نعرہ اب ہمیشہ کیلئے مردہ ہو چکا ہے اور اس کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ——— مسٹر ڈیسائی کے اس بیان کی ریڈیو اور اخبارات میں تشہیر سے عام لوگوں میں کوئی اچھا رد عمل نہیں ہوا اور انہوں نے برملا طور پر یہ کہنا شروع کر دیا کہ ابھی انتخابات ہونا باقی ہیں لیکن جنتا پارٹی والے الیکشن کے نتائج سے پہلے ہی اپنی کامیابی کا کیوں اعلان کر رہے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اسمبلی کو ووٹر منتخب نہیں کریں گے بلکہ ——— یہ تمام تر باتیں اور ان ساری کارروائیوں کا نیشنل کانفرنس کو بے حد سیاسی فائدہ پہنچا۔ اور عوام اس بات پر کمربستہ ہو گئے کہ وہ ہر قیمت پر اپنے ووٹ کا استعمال کریں گے اور اپنی مرضی کے مطابق امیدواروں کو ووٹ دیں گے۔ حالانکہ ان سارے واقعات سے پہلے محاذ رائے شماری کو توڑنے اور حق خود ارادیت کے موقف سے دستبردار ہو جانے کی بنا پر شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی پوزیشن بڑی حد تک کمزور ہو چکی تھی اور خود نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ وہ انتخابات میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ ایک مرحلے پر نیشنل کانفرنس نے ناکامی سے بچنے کیلئے انتخابات کے بائیکاٹ کی تجویز پر بھی غور کیا تھا ——— لیکن اب صورت حال یکسر بدل چکی تھی اور ساری سیاسی فضا اُن کے حق میں ہو گئی تھی۔

اُدھر پاکستان میں بڑے پیمانے پر سیاسی اتھل پتھل اور مسٹر بھٹو کی حکومت کے خلاف وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن کی بنا پر بھی کشمیری عوام میں ایک قسم کی مایوسی پیدا ہو رہی تھی اور پاکستان میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے انہوں نے لوگوں کی سوچ اور ان کے سیاسی اپروچ کو بری طرح متاثر کیا۔ ووٹ ڈالنے کی تاریخ جب قریب آ گئی تو شیخ محمد عبداللہ

کی علالت کے بارے میں تشویشناک اطلاعات بھی پھیلتی جا رہی تھیں، اور ان کے قریبی حلقے یہ کہتے تھے کہ ——— "شیخ صاحب اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہونے والا ہے" ——— یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو اعلان کیا گیا کہ اسی روز دوپہر کو سرینگر کے گول باغ میں شیخ صاحب کی بستر علالت سے ٹیپ کی گئی تقریر کا ریکارڈ عوام کو سنایا جائے گا۔ گول باغ میں شیخ محمد عبداللہ کی ٹیپ کی گئی یہ تقریر سننے کیلئے ایک جم غفیر جمع ہو گیا، اپنی ٹیپ کی گئی اس تقریر میں شیخ صاحب نے دبی ہوئی آواز اور بیماری کے سبب ڈوبتے لہجے میں عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے نیشنل کانفرنس کو ووٹ دیں۔ اسکے ساتھ ہی روزنامہ آفتاب میں شیخ صاحب کی بستر علالت پر لی گئی دو ایسی تصویریں بھی شایع ہوئیں جن سے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور ان کی تمام تر ہمدردیاں شیخ صاحب کے ساتھ ہو گئیں۔ ——— ۲ اور ۳ جولائی کو وادی میں ریاستی اسمبلی کی ۴۲ سیٹوں کیلئے ووٹ ڈالے گئے اور ایک عام اندازے کے مطابق ووٹر کے سامنے صرف دو امیدوار تھے ایک ان کے خیال میں بستر علالت پر پڑے ہوئے شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے ——— جنتا پارٹی، کانگریس اور جماعت اسلامی کے انجانے، غیر معروف اور انتہائی تیسرے درجے کے امیدوار۔ انتخابات میں ووٹروں نے نیشنل کانفرنس کے امیدوار کو نہیں بلکہ شیخ صاحب کو ووٹ دیئے۔ انتخابات میں شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں تین چار پارٹیوں کے امیدوار تھے۔ ان میں کانگریس، جنتا پارٹی اور جماعت اسلامی وغیرہ قابل ذکر تھیں اس طرح نیشنل کانفرنس کے خلاف ووٹ تقسیم ہو گئے اور اگر ان تین چار پارٹیوں کے امیدواروں کے حق میں ایک ایک ووٹ اور نیشنل کانفرنس کے امیدوار کے حق میں صرف دو ہی ووٹ بھی پڑے تو نیشنل کانفرنس کا امیدوار اپنے مد مقابل امیدواروں کے ووٹ تقسیم ہو جانے کی بنا پر بھی کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ ووٹ شماری کے نتائج میں نیشنل کانفرنس نے وادی کی بیالیس (۴۲) سیٹوں میں سے ۳۹ جیت لیں۔ کانگریس کے سلسلے کیلئے امیدوار ریاستی کانگریس پارٹی کے صدر بھی ناکام ہو گئے اور بہت سے امیدواروں کی ضمانتیں تک ضبط ہو گئیں۔ جنتا پارٹی کو صرف دو حلقوں میں کامیابی حاصل ہو سکی۔ ایک مندرواہ کے حلقہ انتخاب میں جس میں ایک سابق وزیر تعلیم مسٹر عبدالغنی لون اپنی ذاتی مقبولیت اور زبردست کوشش سے کامیاب ہو سکے اور دوسرا حلقہ صفاکدل تھا جس میں میر واعظ خاندان کے پیروکاروں کی کثرت تھی اور جہاں سے جنتا پارٹی کا امیدوار بڑی مشکل سے اور ووٹوں کی معمولی اکثریت سے کامیاب ہو سکا۔ تیسرا حلقہ جس میں نیشنل کانفرنس کا امیدوار کامیاب نہیں ہو سکا سوپور کا

کی علالت کے بارے میں تشویشناک اطلاعات بھی پھیلتی جا رہی تھیں، اور اُن کے قریبی حلقے یہ کہتے تھے کہ ــــ "شیخ صاحب اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔" ــــ یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو اعلان کیا گیا کہ اُسی روز دوپہر کو سرینگر کے گول باغ میں شیخ صاحب کی بسترِ علالت سے ٹیپ کی گئی تقریر کا ریکارڈ عوام کو سنایا جائے گا۔ گول باغ میں شیخ محمد عبداللہ کی ٹیپ کی گئی یہ تقریر سننے کے لئے ایک جمِ غفیر جمع ہو گیا۔ اپنی ٹیپ کی گئی اس تقریر میں شیخ صاحب نے اپنی ڈوبتی ہوئی آواز اور بیماری کے سے لب و لہجے میں عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے نیشنل کانفرنس کو ووٹ دیں۔ اسکے ساتھ ہی روزنامہ آفتاب میں شیخ صاحب کی بسترِ علالت پر لی گئی دو ایسی تصویریں بھی شائع ہوئیں جن سے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور اُن کی تمام تر ہمدردیاں شیخ صاحب کے ساتھ ہو گئیں۔ ــــ ۲ اور ۳ جولائی کو وادی میں ریاستی اسمبلی کی ۴۲ سیٹوں کے لئے ووٹ ڈالے گئے اور ایک عام اندازے کے مطابق ووٹر کے سامنے صرف دو اُمیدوار تھے۔ ایک ان کے خیال میں بسترِ علالت پر پڑے ہوئے شیخ محمد عبداللہ اور دوسرا ــــ جنتا پارٹی، کانگریس اور جماعتِ اسلامی کے انجانے، غیر معروف اور انتہائی تیسرے درجے کے اُمیدوار۔ انتخابات میں ووٹروں نے نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار کو نہیں بلکہ شیخ صاحب کو ووٹ دیئے۔ انتخابات میں شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں تین چار پارٹیوں کے اُمیدوار تھے۔ ان میں کانگریس، جنتا پارٹی اور جماعتِ اسلامی وغیرہ قابلِ ذکر تھیں۔ اس طرح نیشنل کانفرنس کے مخالف ووٹ تقسیم ہو گئے اور اگر ان تین چار پارٹیوں کے اُمیدواروں کے حق میں ایک ایک ووٹ اور نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار کے حق میں صرف دو ہی ووٹ بھی پڑے تو نیشنل کانفرنس کا اُمیدوار اپنے مدِ مقابل اُمیدواروں کے ووٹ تقسیم ہو جانے کی بنا پر بھی کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ ووٹ شماری کے نتائج میں نیشنل کانفرنس نے وادی کی بیالیس سیٹوں میں سے ۳۹ جیت لیں۔ کانگریس کے سرکردہ لیڈر اور اُمیدوار ریاستی کانگریس پارٹی کے صدر بھی ناکام ہو گئے۔ اور بہت سے اُمیدواروں کی ضمانتیں تک ضبط ہو گئیں۔ جنتا پارٹی کو صرف دو حلقوں میں کامیابی حاصل ہو سکی۔ ایک ہندواڑہ کے حلقۂ انتخاب میں جس میں سابق وزیرِ تعلیم مسٹر عبدالغنی لون اپنی ذاتی مقبولیت اور زبردست کوشش سے کامیاب ہو سکے اور دوسرا حلقہ صفاکدل تھا جس میں میرواعظ خاندان کے پیروکاروں کی اکثریت تھی اور جہاں سے جنتا پارٹی کا اُمیدوار بڑی مشکل سے اور ووٹوں کی معمولی اکثریت سے کامیاب ہو سکا۔ تیسرا حلقہ جس میں نیشنل کانفرنس کا اُمیدوار کامیاب نہیں ہو سکا سوناوار کا

انتخابی حلقہ تھا جہاں سے جماعتِ اسلامی کے ایک لیڈر سید علی گیلانی اپنی بے پناہ کوششوں اور ذاتی مقبولیت کے باوجود نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار کے مقابلے میں صرف ۳۲ ووٹوں سے جیت گئے۔

انتخابی نتائج کے اعلان کے ساتھ ہی شیخ صاحب اپنی قیام گاہ پر مبارکباد دینے والوں کو تحسین ادا کرنے کے لئے ڈرامائی انداز میں اپنے برآمدے میں آئے اور پھر انتخابی نتائج کے اعلان کے صرف دو دن بعد ہی ۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر کے پولو گراؤنڈ میں نیشنل کانفرنس کے جشنِ فتح کے جلسے میں بنفسِ نفیس آ کر تقریر کی اور عوام کو خراجِ تحسین ادا کیا کہ انہوں نے نیشنل کانفرنس کو کامیاب بنایا۔ اس سے قبل ۴ جولائی کی صبح کو ہی شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان کے مرکزی وزیرِ اعظم مسٹر چرن سنگھ کو ایک پیغام بھی بھیجا جس میں جنتا پارٹی کی مرکزی حکومت کو انہوں نے یقین دلایا کہ "کشمیر میں نیشنل کانفرنس کی نئی حکومت مہاتما گاندھی کے خوابوں کا ہندوستان تعمیر کرنے میں مرکزی حکومت سے پورا پورا تعاون کرے گی۔" اس کے اگلے دن ۸ جولائی ۱۹۷۷ء کی صبح کو نیشنل کانفرنس کے نئے منتخب ممبران اسمبلی کا اجلاس شیخ صاحب کی قیام گاہ پر ہوا جس میں شیخ محمد عبداللہ کو اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا۔ اُسی دن شیخ صاحب نمازِ ظہر ادا کرنے کے لئے درگاہ حضرت بل بھی گئے۔ جموں میں انتخابی نتائج اس کے برعکس برآمد ہوئے۔ وہاں کے چھ انتخابی حلقوں پونچھ، ڈوڈہ، کشتواڑ، بھدرواہ، گول گلاب گڑھ اور بانہال میں جہاں کے ووٹروں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے نیشنل کانفرنس نے کامیابی حاصل کر لی۔ جموں کے ۳۲ انتخابی حلقوں میں سے ۲۶ حلقوں میں جہاں غیر مسلم ووٹروں کی اکثریت تھی جنتا پارٹی نے گیارہ، جبکہ ترقی پسند اور کانگریس نے گیارہ نشستیں جیت لیں۔ اور اس طرح ریاستی اسمبلی کے ۷۶ ممبران کے ایوان میں چونکہ نیشنل کانفرنس نے اکثریت حاصل کر لی تھی اس لئے شیخ صاحب نے اُسی دن ۸ جولائی ۱۹۷۷ء ہی کو اسمبلی پارٹی کے فیصلے سے گورنر کو مطلع کر دیا اور اس کے اگلے دن یعنی ۹ جولائی ۱۹۷۷ء کی صبح دس بجے شیخ محمد عبداللہ نے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت میں اور ان کی کابینہ کے دوسرے وزیروں نے حلف اٹھا لیا۔ حلف اٹھانے کی اس تقریب میں شیخ صاحب نے تقریباً ۲۵ منٹ تک تقریر کی جس میں انہوں نے یقین دلایا کہ نیشنل کانفرنس کی حکومت آئین کی وفادار رہے گی اور مرکزی حکومت کے ساتھ بھرپور تعاون کرے گی۔ اسمبلی کا الیکشن جیت کر نیشنل کانفرنس برسرِ اقتدار آ گئی۔